اقبال
اور
اندلس کی اسلامی میراث

پروفیسر مظفر حسین وڑائچ

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب ..... اقبال اور اندلس کی اسلامی میراث
مصنف ..... پروفیسر مظفر حسین وڑائچ
طبع اول ..... اپریل 2016ء
مطبع ..... ساہیوال پرنٹنگ پریس
407۔ سٹیڈیم روڈ ساہیوال
سرورق ..... محمد اختر خان 0306-2808433
کمپوزنگ ..... محمد عمر فاروق
تعداد 1000
ضخامت ..... 300 صفحات
قیمت ..... -/450 روپے
CAD-$: 25
AMR-$: 20

ناشر
انور سنز پبلشرز، ساہیوال
0306-2808433-0312-422833
anwersons1@gmail.com

ISBN REGISTERED
(National Library of Pakistan)
978-969-9783-19-7

انتساب

نصفِ بہتر

شاہدہ پروین

پیارے بیٹوں

شارف حسین، شاہ حسین،

طارف حسین اور حسام حسین

کے نام

فہرست

عنوان	صفحہ
پیش لفظ	5
ابتدائیہ	25
پہلا باب:	
اندلس کی مختصر تاریخ اور اسلامی میراث	35
دوسرا باب:	
اقبال کی اندلس سے وابستگی	73
تیسرا باب:	
اقبال کا سفر اندلس اور تاثرات	123
چوتھا باب:	
اندلسی شخصیات سے اقبال کے جذباتی و فکری روابط	155
پانچواں باب:	
اندلس اور کلام اقبال	245
خلاصہ	279

پیش لفظ

اے اندلس!

کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

تاریخ اسلام کی ایک ولولہ انگیز، سحر انگیز اور عبرت خیز داستان جو اسلامی مشرق سے زیادہ جاندار، خوبصورت اور سادہ تہذیب و ثقافت کی مظہر ہونے کی بنا پر علامہ اقبال کی توجہ کا مرکز بنی۔

تیرھویں صدی عیسوی عالم اسلام کے لیے الم ناک واقعات لے کر آئی۔ ۱۲۳۶ء میں قرطبہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہوا۔ مشرق میں خون خوار منگولوں نے اسلامی تہذیب و تمدن کے اکثر مراکز کو تباہ و برباد کر دیا اور آخر کار عالم اسلام کی مرکزیت اور سیاسی تہذیبی قوت کا نمائندہ شہر بغداد بھی ۱۲۵۸ء میں ان کی خون آشامی کی نذر ہو گیا۔

مسلمانان اندلس کی تاریخ کسی قوم کے اعمال و کردار اور عروج و زوال کی ایک ایسی داستان ہے جس کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قوم یا جماعت کن اُصول و قوانین کے تحت حیات حاصل کرتی ہے اور کن کے تحت صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جاتی ہے۔ اندلس اگر باہمی نااتفاقی نسلی و لسانی عصبیتوں اور خانہ جنگیوں کا شکار نہ ہوتا تو آج سارا یورپ صلیب کی بجائے ہلال کے سائے میں ہوتا۔ اندلس کی تاریخ پڑھتے ہوئے دل اگر فخر و امتنان سے لبریز ہوتا ہے تو ذہن خوف و افسوس کا شکار بھی۔ آج رات عربوں نے بربروں کا قتل عام کیا تو دوسری رات بربروں نے عربوں کو تہ تیغ کر دیا۔ تیسری رات دونوں نے مل کر اسپینی نومسلموں کے گاؤں تباہ و برباد کر دیئے۔ چوتھی رات اسپینی نومسلموں نے اپنے قتل کا بدلہ لے لیا۔

مسلمانوں نے اسپین میں ایک شاندار تمدن کی بنیاد رکھی۔ مسلمان علمی اور سائنسی طور پر بہت آگے تھے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اکثر مسلمان زمین کے گول ہونے اور جذب و کشش کے قائل تھے۔ مثلاً ابنِ حزم المتوفی ۴۵۶ھ، ابن خردابہ المتوفی ۳۰۰ھ، ابوعبیدہ بلنسی المتوفی ۲۹۵ھ، ابوعبیدہ کے نظریات کے بارے اس دور کے مشہور شاعر ابن عبدربہ کہتا ہے۔

وقلت ان جميع الخلق فى فلك بهم محيط و فيهم يقسم الا جلا

تو اس بات کا قائل ہے کہ تمام عالم کو فلک محیط ہے اور وہی اِن میں اَجل کو تقسیم کرتا ہے۔

والارض كو ابته حف اسلماء بها فى قاوتحتا و صارت و نقطة مثلاً

اور یہ کہ زمین لیٹی ہوئی ہے جس کو اوپر نیچے سے آسمان گھیرے ہوئے ہے۔ اور وہ درمیان میں نقطہ ''دائرہ'' کی طرح ہے۔(۱)

اس طرح ابن عربی کے نزدیک آسمان کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ وہ اس نیلی فضا کا نام ہے جس پر ستارے گردش کرتے ہیں۔ ابن عربی کے الفاظ یہ ہیں۔

"اند قد اتضع بی بالکشف ان الکواکب مدورنی حذا الفضاء وان ما علیه الفلکیون فی زماننا غلط"۔

''مجھے بذریعہ کشف یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ستارے اس نیلی فضا میں حرکت کرتے ہیں اور آج کل کے ہیئت دانوں کی جو رائے ہے غلط ہے''۔(۲)

فتوحات مکیہ میں کہتے ہیں،

"لم یبلغنان احذ اعرف مدة خلق العالم علی التحدید لم یزل الحق تارلیٰ خانقاده یزال دنیا و اخرة"۔

ہمیں خبر نہیں کہ کوئی شخص ابتدائے آفرینش کی حد دریافت کر سکا ہو۔ خدا تعالیٰ ہمیشہ سے خالق ہے۔ اور دنیا و آخرت بھی یونہی رہے گی۔

من اشداط الساعته وجود ابیکه اُدم الاقدب (علیہ السلام)

تمہارے اس آخری آدم علیہ السلام کا پیدا ہونا بھی قیامت کی ایک علامت ہے۔

خلق الله مائتی الف اُدم۔

''خدا تعالیٰ نے دو لاکھ آدم پیدا کئے۔''(۳) یعنی ان کا کہنا یہ ہے کہ آدم سے پہلے بھی آدم تھے اور یہ پہلے آدم نہیں تھے۔

دوسرے علوم و فنون میں بھی مسلمانانِ اندلس کے عظیم کارہائے نمایاں ہیں۔ علامہ اقبال کا یہ کہنا درست ہے کہ اندلس کی تاریخ ابھی پردہ اخفا میں ہے۔

اس صدی کے اوائل میں مستشرقین نے اندلسی مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کا سراغ لگایا ہے جو سارے ایلپس پر حکمران تھیں ان کے زیر نگیں مشرقی جرمنی، سوئٹزرلینڈ، شمالی اٹلی اور آسٹریا کے علاقے شامل تھے۔ اس کے بارے میں یورپی مورخ کہتے ہیں:

"Strange Isliamic state encapsulated within a wholly Christian land" 4

مسلمانوں کی تاریخوں میں اس علاقے کے بارے میں کوئی مواد نہیں ہے البتہ ابن حوقل اور اصطخری نے اس جگہ کو جبل القلال کا نام دیا ہے اور نہ اس کی کوئی اہمیت بیان کی ہے۔

ان علاقوں پر مسلمانوں کا تقریباً اسی سال قبضہ رہا۔ لیکن یہ بڑی عجیب اور حیرت کی بات ہے کہ ہمیں صرف دو مسلمانوں نصر بن احمد اور محمد القاسم کے ناموں کا پتہ چلتا ہے۔ حالانکہ تاریخ میں بعض حملہ آوروں کے نام کسی شہر میں ایک دن رہنے سے محفوظ ہیں۔ ان مسلمانوں کے بارے میں ان علاقوں کے گرجوں کی تاریخ، پادریوں کی یادداشتوں اور لوک داستانوں میں ان کا ذکر ہے۔ ان علاقوں سے انخلا کے بعد صدیوں تک ان عربوں کا خوف مقامی لوگوں کے دلوں میں چھایا رہا اس کی مثالیں ان کے ادب میں ملتی ہیں۔ نظم و نثر دونوں میں ان کا ذکر خوف و دہشت کے طور پر موجود رہا ہے۔

کے Half way to Heaven (The story of the St. Bernard)

چند دلچسپ اقتباسات زیب نظر ہیں:

"Four Hundred year later an alpine hospice founded by the Benedictines was destroyed by the Saracens.

"I had come to feel there never would be an hour that was not planned for me moment by moment."

Anton nodded. "You were right about that, Our time here is planned. But training for rescue and work with the dogs are part of any usual day. It is only during retreat the maronniers take over most of our outside duties.

"Maronniers?"

"The Lay Brother."

"Why are lay brothers called maronniers, Anton?"

It's a long word for Moors."

"But there are no Moors here,"Said Joseph, Puzzled.

"Once there were. They were converts who came to serve here under St. Bernard. The name's been used ever Since."

"But when the retreat ends things will be changed. We, Too May be outside in the snow soon?

Finnally there came a day when pilgrims staggered into the Cathedral to say that on their way through the Pass several of their number had been struck down by unseen assailants. They were in Panic.

"The Moors?" Saidn Bernard. "Saracens?"

"Father, we think not any human hand, We tell you the old , old stories are true. The pass is a place of demons. We saw the evil spirits as we fled... we heard their laughter mock us."

Men or devils, they shall not hold the pass any longer." The Archdeacon Spoke whith magnificence which thrilled his listeners. In attire, Father Bernard in his worn black robe did not resemble at all the dashing young noble with his sword who had arrived at the Cathedral years before In appearance, he was more impressive than ever. Tall and commanding, he towered now over those who gathered to listen. Bit they were not enough. He called to others to join him in an effort to right this great evil. With the crowd trailing at his heels he went to the Bishop.

Gladly will i give you my blessing," the Bishop told him. "But where will you get your men? You sill need an army. Who will go?"

Everyone will go?" Bernard replied.

But it appeared that he was mistaken. All agreed with him that the evil was great and should be destroyed. Bit it. Bernard told them. How beckoned them on. Lightning flashed among the peaks, its glare illuminating scenes of horror, The thunder rocked the great crags. Bit still Bernard strode forward....his robe belted about his waist, his shoulders squared, his eyes triumphant. And by the light of the flashes the people saw him, and they were heartened

and followed him.

To Joseph the storm without became the storm which had enveloped St. Bernard. He shivered in it. the fear of the people was one with his fear.

And finally, the Abbe's story went , the storm having done its worst and won no victory, it subsided and the thunder was quieted and the sun came out. And all about there was the glory we to see sometimes in one of nature's sudden changes. Bernard, making the sign of the Cross, came on to the Plain of Jupiter, and the Demon saw him and was afraid and tried to hide. But Bernard knew him for what he was, evil inarnate, and ordered him in the name of the Trinity never to harm anyone again and locked him forever in a glacier. And he flung on to the ground the great statue of Jupiter and in its place he put a Cross which he made from two sticks.

Then from secret hiding places the Saracens came out, begging for forgiveness and mercy. And Bernard told them of the God of light and love and that He had hallowed this place and that no evil deed should be done here ever again. [5]

990ء میں عربوں کا اقتدار ختم ہو گیا۔ لیکن اُن کے حملے تیرھویں صدی تک جاری رہے۔ لوگوں کے دلوں میں صدیوں تک ان کا خوف رہا۔ وہ ان کو مافوق الفطرت سمجھتے رہے۔ جے۔ ٹی رینوڈ کی یہ رائے دیکھیے۔

19th Century Historian J. T. Reinaud drawing on the accounts of the period observes " On saw ample evidence foth comming for the oft-repeated saying tht one Muslim was enough to put thousand (Franks) to flight" This is a strange claim to make about a motly band of "Pirates" as the frankish historian often discribed them. [6]

ان کی لوک داستانوں میں ان عربوں کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ مثلاً ایلپس کی چٹانوں کے ایک گروپ کو Penitons de Mees کہا جاتا ہے جو مقامی روایت کے

مطابق راہبوں کا ایک گروہ ان عرب لڑکیوں پر عاشق ہوگیا تھا جنہیں ایک عیسائی سردار عربوں سے چھین لایا تھا۔St. Donet نے انہیں ان کی نفسانی خواہشات کی بنیاد پر پتھر کا بنادیا۔7

ان عربوں نے مقامی لوگوں کوادویات کے بارے میں سکھایا۔سرامک ٹائلز اور کارک کی صنعت انہی کی بدولت اسی علاقے میں رائج ہوئی۔7-A

لیتھو پرانڈ کے بیان کے مطابق قریباً ایک ہزار اسی سال پہلے (۹۳۶ھ) اسپین کے مسلمان سمندر کے راستے دریائے رہون کی وادی سے ہوتے ہوئے سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں میں پہنچے ان میں سے کچھ مسلمان وہاں مستقل آباد ہوگئے۔آج بھی ان کی اولادیں ان پہاڑوں کے اوپر مختلف گاؤں میں رہ رہی ہیں۔ان کے رنگ گندمی اور نقوش عربی ہیں۔بہت عرصہ پہلے ان کو عیسائی بنایا گیا۔ان کا دعویٰ ہے کہ ان کے آباؤاجداد عرب تھے۔8 ان میں سے کچھ (Nice) کے شہر میں آباد ہوگئے اور آج بھی اس شہر میں ایک محلہ Saracene Qiuarter کہلاتا ہے۔

سوئٹزرلینڈ ایلپس میں بہت سے نام ایسے ہیں جو عربی ہیں مثلاً العالین،Allalein، جبل ہارن Jabel Horn ، فند Find ، حازلی Hasli،ساز Saas، ضرمت Zermut شمعونی Chamane ،شرمز Charmaz، الفوبل Alphubel، وسپ Visp ، ضموت Zmut، مشابل پیک Mishabel Peek، ستراحل ہارن Strahl Horn، العطش Aletsch۔9

مستشرقین اب یہ بھی کہتے ہیں کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ قسطنطنیہ پر ترکوں کے تسلط کے بعد وہاں سے یونانی پادریوں کے فرار اور یورپی ملکوں میں قیام سے نہیں ہوئی۔(کیونکہ یہ پادری تو یونانی جانتے ہی نہیں تھے۔) بلکہ اُندلسی یونیورسٹیوں سے عیسائی طلباء کی تعلیم سے ہوئی ہے۔ان طلباء میں شارلیمان شاہ فرانس اور پوپ سلوسٹر بھی شامل ہیں۔۱۰

۱۱۳۰ء میں طلیطلہ میں رئیس الاسقفہ ریمانڈ کی نگرانی میں ایک مدرسہ قائم ہوا جس میں مشہور عربی تصانیف کا لاطینی میں ترجمہ ہوا اور یہ سلسلہ چودھویں صدی عیسوی تک جاری رہا اس کے علاوہ سسلی اور اطالیہ میں بھی مدرسے قائم ہوئے جس میں عرب اساتذہ بھی مختلف علوم وفنون عیسائی طلبہ کو پڑھاتے تھے۔(۱۱) Robert of Kellon (1107 -- 60) اپنے شاگرد Herman Dalmatin کے ساتھ مشرق میں ۱۱۳۴ء میں آیا۔یہاں عربی سیکھی اور اسلام کے بارے میں لکھا۔وہ پہلا مترجم ہے جس نے قرآن کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔

Gdmord Pococke (۱۶۰۳ء۔۔۹۱) عربی سکالر تھا جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں

عربی پڑھاتا تھا۔اس نے ابن طفیل کی ''حی ابن یقظان'' کا ترجمہ کیا جس کو سامنے رکھ کر Denial Defoe نے روبن کروسو لکھا۔۱۲

اندلس کے مسلمانوں کی علمی ثقافتی ترقی کے بارے میں ہارپر اینڈ رو کی کتاب The Root and The Flower کی یہ عبارت ملاحظہ کیجئے:

Most authorities regard tenth centurey Cordoba as the finest example of Moorish civilization in Spain. A part from boasting 700 mosques, 900 baths, 300000 houses and a population of half million, Corodoba also on tained many fine gardens an palaces and a library of 400,000 manuscripts. More did its wonders and there.

"Cordoba was also the scientific centre of Europe in the Middle Ages. The Christian Kings and nobles who were gravely ill or needed an operation came to the physicians of Cordoba for treatment. Their surgeons understood the use of anaesthetics, and operations for cataracts and preassure on the brain were said to have been performed successfully on many occasions. Medicine, botany, chemistry, physics, mathematics, astronomy, geography and Greek philosophy were, but a few of the field in which the savants fo Cordoba excelled. Algebra was almost entirely an inventaion of the Moors, as was spherical trigonométry. They broought to Europe their Arabic numerals which were infinitely easier to use than the clumsy numerals of the Romans....." (Spain, The root and the Flower, Page 56)

The Reconquista, as Salvador de Madariaga is at pains to explain, was mainly a conflict between religions and civilizations rather than bewween peoples of different races. Nor is this suprisiing when one remembers that Al Andalus (Andalusia) contained no only Moslems of Eastern origin but

also Spanish Moslems, Mozarabes (Christians by faith) and even independent Christian lords. Furthermore it was bilingual, whith the upper classes speaking Arabic while the lower classes -- whatever their race or creed ---knew only Romance. 13

تراجم کی وسعت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ حروفِ طب کے شعبے میں ڈاکر لکلرک نے اپنی کتاب تاریخ اطباء عرب میں تین سو سے زیادہ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کا ترجمہ لاطینی میں ہوا تھا۔(۵)

اور جب پندرھویں صدی کے نصف میں جرمنی میں چھاپہ خانہ کی ابتداء ہوئی تو فشر Fisher کے نزدیک صدی کے آخر تک یورپ میں تقریباً نوے لاکھ کتابیں چھپیں ان میں عربی کتب بھی ضرور ہوں گی۔ [5] یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے جس میں عربی کی چھپی ہوئی کتاب کا ذکر ہے:

In 1595 so Al-Hajri tells us, he has been living in Granada in the house of one of the well connected elite community of Moriscos allowed to remain in that city. He was clearly not the only Morisco to have returned to the city. We find him having dealings with other. "Illegal immigrants" (They are even more a anyious then he is to avoid calling attention to themselves). The passage on which I wish to focus finds him in the company of one Muhammad Ibil-Asi (Ameber of a very distiguished Cramodan family). Muhammad was actually giving a arabic lesson to a present in the arch-bishop's entourage, and this was taking the form of reading allowed in Arabic from a printed book .....That make it highly probale that the Malodonaolo (Priest) who was taking an arabic lesson in 1595 was the about. 14

اس لیے آج بھی قدیم عربی کتب کے ذخائر مختلف جرمن شہروں کے کتب خانوں میں ہیں۔ یورپ کے ملکوں میں جرمنوں ہی نے پریس لگائے تھے۔ بلکہ ۱۴۹۴ء تک غرناطہ میں بھی ان کے تین پریس تھے۔ اور ۱۵۰۰ء تک سارے سپین میں تیس پریس لگا لیے تھے۔(۱۵) جن سے

کتابوں کی اشاعت طوفانی رفتار سے ہونے لگی۔

یورپ کو عربوں نے مہذب بنانے کے ساتھ ساتھ ان کے چھ سو سال تک علوم وفنون اور ادب وفلسفہ کے استاد بھی رہے۔ اس وقت اسلامی تہذیب وثقافت کا اس حد تک غلبہ تھا کہ ۱۷۷۶ء میں انگلستان کے ایک حصے (کینٹ آکسفورڈ اور ٹمیز ویلی) میں اسلامی سکہ ہی رائج رہا۔ جس پر ایک طرف شاہ اوفو کی تصویر اور دوسری طرف کلمہ طیبہ ہے۔ [16] ان میں سے ایک سکہ آج بھی سری لنکا کے عجائب گھر میں ہے) جب عرب یورپ پر تہذیبی وثقافتی اور علمی طور پر اس حد تک اثر انداز ہوئے ہیں تو یورپ کو اس کا اعتراف کیوں نہیں ہے۔ (علامہ اقبال نے بھی کئی جگہ اس بات کا اظہار کیا ہے۔) اس بات میں موسیو لی بان حقیقت بیانی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''سچ ہے پیروانِ اسلام زمانہ دراز سے یورپ کے بدترین دشمنوں سے محسوب ہوئے ہیں۔ وہ موروثی تعصب جو ہمیں اسلام سے ہے۔ زمانہ دراز سے جمع ہوتا آیا ہے۔ اور ہماری فطرت کا ایک جز ہوگیا ہے۔ ہمارے یہ تعصبات اس قدر جبلی اور اس قدر شدید ہیں۔ (اگرچہ بعض وقت وہ دبا ہی کیوں نہ دیئے جائیں) جیسے یہودیوں کے تعصبات عیسائیوں سے اس موروثی تعصب میں جو ہمیں اسلام کے برخلاف ہے اگر ہم اس دوسرے تعصب کو شریک کرلیں جسے ہماری کم بخت تعلیم نے سال ہائے دراز سے ہمارے ذہن نشین کر دیا ہے کہ کل قدیم علوم وادب صرف یونان وروم سے منشعب ہوئے ہیں۔ تو بخوبی ہماری سمجھ میں آجائے گا کہ تمدن یورپ کی تاریخ میں عربوں کے حصہ سے انکار کیوں کیا جاتا ہے۔ بعض اشخاص کو اس خیال سے ہمیشہ شرم آتی ہے کہ عیسائی یورپ کے وحشیانہ معاشرے سے نکلنے کا باعث ایک کافر قوم تھی یہ خیال اس قدر دردناک ہے کہ اس سے انکار کرنا بہت ہی آسان ہوجاتا ہے۔''(۱۷)

اندلس کے مسلمانوں کی مہاجرت صدیوں جاری رہنے والی دنیا کی طویل ترین مہاجرتوں میں سے ہے۔ اس کی ابتدا اور انتہا فرانس سے ہوتی ہے۔ وہاں ڈیڑھ صدی آباد رہنے کے بعد نویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کو نکلنا پڑا اور آخری قافلہ تقریباً ایک ہزار سال بعد سترھویں صدی عیسوی 1689ء میں ان مسلمانوں پر مشتمل تھا جو 1609 میں اندلس سے نکلنے کے بعد فرانس کے علاقے نفس میں جا بسے تھے۔(۱۸)

اسپین سے 1496 اور 1502ء کے درمیان بہت سے مسلمان شمالی اور وسطی یورپ چلے گئے ان میں سے کئی بہت اہم ہوئے انہوں نے افریقہ کے ساتھ تجارت شروع کی جن میں افریقی اور یورپی غلاموں کی تجارت بھی تھی۔ ان میں بعض یورپی معاشرہ میں خادموں کی شکل میں

بھی تھے۔ان میں سے کئی برطانیہ، ہالینڈ آسٹریا، سویڈن، روس اور جرمنی میں اہم عہدوں پر بھی پہنچ گئے تھے۔

Some became nobles millitary leaders and other respectables professionals in Royal countries.

ان میں سب سے مشہور Alassandro de Medici جو Penne اور Florence کا ڈیوک تھا 37-1510ء جس کو عام طور پر Ilmoro کہا جاتا تھا جو لاطینی میں The Moor تھا۔

سولہویں صدی میں برطانیہ میں طبقہ اشرافیہ، چوکیدار، گانے اور ساز بجانے والے کالے ملازم رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اس وقت برطانیہ میں ان کالوں میں کچھ آزاد بھی تھے۔لندن میں ان کا ایک علیحدہ محلہ تھا۔ملکہ الزبتھ I اور جیمز IV کے ملازم بھی کالے تھے۔اسی ملکہ نے 1590ء میں ایک آرڈر کے ذریعے ان کو برطانیہ سے نکالنے کا حکم دیا۔ان میں سے بہت سوں کو تجارتی منڈیوں میں بیچ دیا گیا۔کچھ آقاؤں نے ان کو نکالنے سے انکار کر دیا۔1601ء میں دوبارہ نکالنے کی مہم شروع کی گئی۔جن میں سے زیادہ تر شمالی افریقہ کے مسلمان تھے۔(۱۹)

جون جولائی 1627ء میں الجزائر کے عربوں ترکوں اور یورپی نومسلموں نے بحری جہازوں کے ذریعے آئس لینڈ پر حملہ کیا اور وہاں سے سینکڑوں لوگوں کو قیدی بنا کر الجزائر لے آئے اور یہاں غلاموں کی منڈیوں میں بیچ دیا۔

مسجد نبوی کی بائیس سو سے زائد محرابیں اور ستون دیکھ کر مسجد قرطبہ نظروں کے سامنے آتی ہے۔مسجد نبوی کے دروازے اسپین کی بندرگاہ برشلونہ سے بن کر آئے ہیں۔جو اپنی خوبصورتی اور نفاست میں مثال ہیں ہوسکتا ہے ان عیسائی کاریگروں میں ان مسلمانوں کا ہی خون ہو جو کبھی اس صنعت کے مالک تھے۔

جنوبی امریکہ میں ابتدائی عہد کے گرجوں اور دوسری عمارتوں میں عربی طرز تعمیر کے ساتھ دیواروں اور دروازوں پر عربی نقاشی کا عکس ہے۔۱۴۹۲ء کے بعد عیسائی اندلسی مسلمانوں کو ہزاروں کی تعداد میں جنوبی امریکہ لے گئے ان کو عورتوں کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان مسلمانوں نے وہاں کے مقامی قبائل کی عورتوں سے شادیاں کیں۔وہ تین چار نسلوں بعد اپنے مذہب، رسم رواج اور نسلی خصوصیات کو فراموش کر بیٹھے لیکن صناعی ان کی قائم رہی۔ان پر ظلم و جور کس حد تک تھا۔ان کی جھلک آج بھی ارجنٹائن کے قانون میں ملتی ہے۔جس کے مطابق سوائے

عمر (Omer) نام کے کوئی شخص اسلامی یا غیر عیسائی نام نہیں رکھ سکتا۔(۲۰)

اے اندلس۔

تیری ہی داستان ہے داستانوں میں

علامہ اقبال کی اندلسی شاعری ماضی کی تصویر، تاریخ کی تفسیر اور مستقبل کی تعبیر ہے۔ جس میں تلمیحات رمز و ایماء۔اور علائم کا بھرپور استعمال ہونے کے ساتھ حقیقت و صداقت کا اظہار اور میراثِ اسلام کا غلبہ ہے۔علامہ اقبال کے نزدیک کہ یہ اندلسی مسلمان ہی تھے۔

جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب

ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

قاضی ابن صاعد اندلسی نے ۱۰۶۸ء میں ''طبقات امم'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔اس وقت مسلمان سیاسی، تمدنی، سائنسی اور معاشی طور پر چونکہ دوسری اقوام سے آگے تھے اس لیے اپنے مقابلے میں دوسری اقوام کو حقارت سے دیکھتے تھے۔اس کتاب میں اس نے دنیا کو سات اقلیم میں شمار کیا ہے۔وہ ان میں رہنے والی بعض اقوام کو تہذیب و تمدن کی نمائندہ اور بعض کو وحشی جانور قرار دیتا ہے۔یورپ کی آخری سرحد پر رہنے والی قوموں کو بھی وحشی، جاہل اور تہذیب و تمدن سے دور کہتا ہے اس کے نزدیک کیونکہ سورج کی کرنیں وہاں ٹیڑھی پڑتی ہیں۔اور وہاں سردی بہت ہے۔اس وجہ سے ان کے دماغ جمے رہتے ہیں اس لئے وہ ترقی نہیں کر سکتے۔(۲۱)

اور جب ان یورپی اقوام نے سیاسی، تہذیبی اور سائنسی طور پر دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا تو اٹھارویں صدی کا ایک انگریز لکھتا ہے۔چونکہ ایشیاء میں سورج سر کے اوپر رہتا ہے اس لیے ان کے دماغ پگھلتے رہتے ہیں۔اوو ہ ترقی نہیں کر سکتے اور جاہل ہی رہتے ہیں۔

کسی فاتح قوم کا مفتوحہ ملک پر تہذیبی و ثقافتی اثر کی اندلس سے بہتر مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔قاضی ابن صاعد کے بقول ''زمانہ قدیم میں مُلک اندلس علم سے یکسر خالی تھا'' اور نہ ہی اس کی تمدنی و ثقافتی حیثیت تھی۔عربوں نے اِس ملک کو اعلیٰ تمدن دیا جو ان کے نکالے جانے کے بعد ختم ہو گیا۔دنیا کی تاریخ میں ایک قوم کے کسی دوسری قوم پر اثر انداز ہونے کی یہ کامل مثال ہے۔۔۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند میں لاکھوں مسلمانوں نے ہجرت کی۔اب ان کی تیسری نسل جا رہی ہے۔اور ان میں اکثریت کو نہیں پتہ کہ بھارت میں وہ کس جگہ سے آئے ہیں۔لیکن اسپین سے ہجرت کرنے والے صدیوں بعد اس گم شدہ جنت کو نہیں بھولے۔بلکہ بعض افراد کے پاس تو ان مکانوں کی چابیاں بھی موجود ہیں جن کو ان کے آباؤ اجداد چھوڑ کر آئے تھے۔جس طرح یہودیوں

نے ہزاروں سال تک اپنے وطن کو یاد رکھا۔ اس طرح اسپین کے مسلمانوں نے ہسپانیہ کی یاد کو نہیں چھوڑا۔ آج بھی مراکش تیونس میں ان کے محلے موجود ہیں۔

۱۴۹۲ء عربوں، یہودیوں امریکیوں اور چرچ کے لیے اہم سال ہے۔ کسی ایک سال میں اتنے دوررس نتائج کے حامل واقعات رونما پذیر نہیں ہوئے۔ اسی سال اسپین پر قبضہ کے لیے عیسائیوں کی صدیوں پر محیط مہم مکمل ہوگئی۔ جو عربوں اور یہودیوں کے لیے خوفناک اور عیسائیوں کے لیے خوش کن۔

۷۱۱ء سے ۱۶۱۰ء تک مسلمان سپین میں رہے۔ جس کے بارے میں T. B. Irving کے الفاظ ہیں۔

These nine islamic centuries were glorious and they made he rest of Europe look pale and barbarous by comparism. (22)

فرانس اور سپین کے درمیان ایک چھوٹی سی ریاست اندورا ہے اس کے قومی ترانہ کے یہ الفاظ دیکھئے

"The Great Charlemangene, my father, freed us from the Arabs...." (23)

تعصب اور خوف کی بنا پر لاکھوں مسلمانوں کو سپین سے نکال دیا گیا۔ اسپین اس وقت دنیا کی ایک بڑی طاقت تھی لیکن وہ اپنی ۲۵% آبادی سے خوف زدہ تھی۔ یورپی تاریخ کی شہری آبادی کی یہ سب سے بڑی ہجرت تھی۔ بے شمار مسلمانوں کو عیسائی بنایا گیا A-23۔ لیکن وہ دل سے مسلمان تھے۔ عربی کتب وہ چوری چھپے تہ خانوں میں پڑھتے تھے۔ کیونکہ جس کے پاس عربی کتاب ہوتی اس کی سزا موت تھی۔ ۱۵۷۰ء عیسائیوں نے نہانے پر بھی پابندی لگادی۔ نئی دنیا میں بھی اسلام پر پابندی تھی۔

As a Royal Spanish order of 1543 explained " in a new land like this one where (the Catholic) faith is only recently being saved it is necessary not to allow to spread there the sect of Mohomet or any other" (24)

L. T. Harvay کے نزدیک 75-1568 میں 321000 اور 1609ء میں 319000 مسلمانوں کو سپین سے نکال دیا گیا۔ (viii) دائر کے نزدیک فلپ III نے سات

لاکھ مسلمانوں کو جلاوطن کیا۔ 25

مسلمانوں کی تنظیمی قوت اور حاکمانہ حیثیت ختم ہوگئی ان کی زراعت اور تجارت عیسائیوں کے قبضے میں آگئی۔ مسلمان ثقافت پس منظر میں چلی گئی۔ مسلمانوں سے پہلا تقاضا تھا کہ وہ عیسائیت قبول کرلیں۔ A-25

۱۵۰۰ء میں Cisneros نے رپورٹ دی

There is now no one in the city who is not a christian and all mosques are churches"26

جن مسلمانوں کو عیسائی بنایا گیا ان کو موریسکو کا نام دیا گیا۔ لیکن یہ صرف نام کے عیسائی تھے۔ بچے کو جب بپتسمہ دیا جاتا، گھر جا کر وہ اس کو نہلاتے تھے۔ وہ مسلمان دوہری زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔

اس پرآشوب دور کے بارے میں بعض مسلمانوں نے خفیہ طور پر بھی لکھا ہے۔ جس میں کچھ محفوظ رہ گیا۔ انہی میں ایک مسلمان Baruy De Reminyo کے یہ الفاظ دیکھئے "We are not in times of grace but of tears" ان میں سے زیادہ تر نے اصل ناموں کے بجائے فرضی ناموں سے لکھا۔ انہی میں سے ایک بوڑھی عورت Mora de Ubeda نے بھی اپنی دردناک آپ بیتی لکھی ہے کہ کس طرح اس کے سارے رشتہ دار قتل ہو گئے۔ اس کے باوجود بوڑھی عورت پھر بھی پرامید ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ پھر سے مساجد کے اونچے اونچے مینار نظر آئیں گے۔ ۲۷ تقریباً پانچ سو سال بعد اسپین کے کئی شہروں میں ایسے مینار نظر آرہے ہیں۔

عربی زبان اور کلچر نے یورپی تہذیب وثقافت کو متاثر کیا۔ انگلینڈ میں طبقہ اشرافیہ میں فرانسیسی زبان بطور فیشن کے رائج تھی۔ اکثر عربی کے الفاظ فرانسیسی کے ذریعے انگلش میں آئے انگریزی زبان کے پہلے عظیم شاعر جیفرے چوسر جس کو سائنس اور فلاسفی سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ اس نے اپنے سرمایہ میں According cannons Historical Dictionary چوبیس عربی کے الفاظ استعمال کئے ہیں جو یہ ہیں۔

(of Astrnomy): Almagast, Almanac, Almucantar, Almury, Alnath, Nadir,

(of Chemistry): Alkeli, Azimuth, Borex, Tartar,

	Almalgam (As a verb)
(of Clothing):	Satin, Gipon
(of Military):	Lancegay, Jupon
(of Games):	Fers, Checkmate
(Miscellaneous):	Damask, Sarsenish, Fen, Arabic, Ribibe, Carrack, Dulcarnon

ان میں سب سے زیادہ دلچسپ لفظ Checkmate ہے جو فارسی عربی کا "شاہ موت" ہے، جو ches میں استعمال ہوتا تھا۔ اس کا شاعری کا یہ بند دیکھیے:

As the ches with me she gan to pleye
With hir false draghhtes dyvers.
She stal on me and tok my fers
and when I sawgh my fers awaye
Allas I kout he no longer playe (651-56) 28

صدیوں بعد الحمرا کے بارے میں لارڈ بائرن کے یہ الفاظ دیکھیے:

Letters to the monarch tell....How Alhama's city fell;
In the fire the scroll he threw..And the messenger he slew.
Woe is me, Alhama!.... (28-A)

ہندوستان اور سپین کا آپس میں رابطہ تھا۔ لوگ آتے جاتے تھے۔ بابا رتن کا افسانہ مشہور ہوا تو ابو مروان اندلسی ان سے ملنے کے لیے آ گئے۔ ابن بطوطہ جب ہندوستان آیا تو یہاں اس کی فقیہ جلال الدین غرناطی سے ملاقات ہوئی جو بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان آیا تھا۔ فرطِ جذبات سے ابن بطوطہ کے آنسو نکل آئے۔ جلال الدین غرناطی نے یہ شعر پڑھا۔

وسلاطیم سل الطین وعهم دسز ۔ اس لاعطام معارت عطاما

ان بادشاہوں کا حال مٹی سے پوچھ کہ بڑے بڑے سروں کی ہڈیاں ہو گئیں۔

اسی طرح غرناطہ میں حاجی علی ہندی اور حاجی رشید ہندی تھے۔ ۲۹

علامہ اقبال کے نزدیک اسلامی تمدن وثقافت پر اندلسی شخصیات کے غیر معمولی افکار و نظریات نے بڑے گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ مسلمان، نسلی ولسانی، مذہبی وفکری عصبیتوں کا

شکار ہو کر اپنے درخشاں ماضی سے کٹ چکے ہیں۔ لیکن اب مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی شاندار اور قابلِ فخر تاریخی، ملی، تہذیبی، دینی اور ادبی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے اندر ملی شعور پیدا کر کے اقوامِ عالم کی صف میں دوبارہ نمایاں مقام حاصل کریں۔

مقامِ شکر ہے کہ آج کل اسپین میں احیائے اسلام ہو رہا ہے۔ غرناطہ میں ہزاروں مقامی عیسائیوں نے اسلام کے دامن میں پناہ لے کر کئی مساجد کی پھر سے تعمیر کر لی ہے۔

اسی شہر میں عرب ممالک کے تعاون سے ایک اسلامی یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے۔ ۳۰ جبرالٹر میں مسلمانوں کی تعداد تین ہزار ہے جن کے لیے خوبصورت تین مساجد ہیں اسی طرح کئی دوسرے شہروں اور قصبوں میں مسلمانوں کی آبادی ہے ان میں زیادہ تر عرب کچھ پاکستانی اور دوسرے ملکوں کے مسلمان ہیں۔ بعض عرب شیوخ نے ماربیا کے علاقے میں اپنی رہائش گاہیں بنائی ہیں۔ ۳۱

Salt شہر میں مسلمانوں کی آبادی 40% ہو چکی ہے۔ اور جلد ہی یہ مسلم اکثریت کا شہر ہو جائے گا۔ اس وقت انہیں مسجد بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ اکثریت میں ہونے کے بعد وہ خود اپنے قوانین بنا لیں گے۔ اندلس کے اکثر شہر اور قصبات مشرقِ وسطی کی طرح لگتے ہیں۔ کہیں کہیں مساجد بھی نظر آتی ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت اسپین میں تقریباً آٹھ لاکھ مسلمان موجود ہیں۔

۱۹۹۷ء میں اسپین کی حکومت اور اسلامی کمیشن اسپین میں ایک معاہدہ کے ذریعے مسلم شہریوں کے حقوق تسلیم کیے گئے ہیں۔ نیز مساجد کو مسلم عبادت گاہوں تعلیمی اور اخلاقی سرگرمیوں کے مراکز کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ کئی دوسری شقوں کے علاوہ سرکاری کیلنڈر میں محرم کی پہلی تاریخ (سن ہجری کا پہلا دن) عاشورہ (۱۰ محرم)۔ عید الفطر (۱،۳، شوال)، عید الاضحیٰ (۱۰، ۱۱، ۱۲، ذی الحجہ) کی تعطیلات کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی دور کے ورثہ کے تحفظ کے لیے حکومت اسپین اور اسپین کا اسلامی کمشن مل کر کام کریں گے۔ ۳۲

میں جناب ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، جناب ڈاکٹر رحیم بخش شاہین اور استادِ محترم اے ڈی نسیم کا اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں مشوروں کے لیے تہ دِل سے ممنون ہوں۔

مظفر حسین وڑائچ
ساہیوال (پاکستان)

حواشی

۱۔ قاضی ابوالقاسم صاعد اندلسی "طبقات الامم" ترجمہ؛ قاضی احمد میاں اختر دارالمصنفین اعظم گڑھ۔۱۹۲۰ء۔ص۔۱۱۱

۲۔ ابن عربی "آداب المریدین" ترجمہ اختر عالم فریدی ص۔۴

۳۔ ابن عربی "آداب المریدین" ترجمہ اختر عالم فریدی۔ص۔۔۴

4- Periates of St. Tropes By Robert W. Lebling

5- Half way to Heaven (The Story of St. Bernard) Ruth Adams Knight. Whittlesey House London 1868.

6- Periates of St. Tropes By Robert W. Lebling

7- The Alps . A Cultural History Andrew Beaule (page 36)

7-A The Alps . A Cultural History Andrew Beaule (page 36)

8- Muslims & Jews in Switzerland. Jerusalim Centre for Public Affairs.

9- Glacier of the Alps & Mountainering in 1861- John Tydall. E.P. Duttons & Co London-1906

۱۰۔ گستاولی بان "تمدن عرب" مترجم سید علی بلگرامی مقبول اکیڈمی لاہور۔ص۔۱۰۷

۱۱۔ گستاولی بان "تمدن عرب" مترجم سید علی بلگرامی مقبول اکیڈمی لاہور۔ص۔۱۰۹

12- Mysterious Irrationality English Litrature and Islam by Geoffery Clarke.

13- Costa Del Sol. Douglas Clyne Pg 31 Alvin Redman London 1966.

14- Muslim in Spain . L. T. Harray Iniversity of Chicago Press. Page 13

15- Fisher "A history of Europe" Edword Arnold London 1957 (Page 466)

16 London "History of the Muslem World" Page 551

۱۷۔ گستاولی بان کتاب مذکور۔ص۔۱۰۔۱۹۷

۱۸۔ موسیو سید یوفرانسیسی "تاریخ عرب" ترجمہ مولوی محمد حلیم انصاری نفیس اکیڈمی کراچی۔ ۱۹۸۶ء۔ص۔۴۱۵۔۴۱۶

19- Moors in the Euvopean Renaissance Ta Neer Foundation.

19-A Imperial spain 1469-1716 J. H Elliot London 1963. pg 337

20- T. B. Irving "Islamic Revewel in Iberia and Lation America" (Journal) Islamic Studies November 1991 Islamabad (page 109)

۲۱۔ قاضی ابوالقاسم صاعد اندلسی کتاب مذکور۔ص۔۱۰۸

22 "Islamic Revewel in Iberia and Lation Amarica" (Journal) Islamic Studies November 1991 Islamabad (page 109) T. B. Irving

23- Approch to the History of Andora Lida Vilia. Page 15

23- A Blood and Faith . Muslim Carr Newpress london Page (IX)

24- Servents of Allah. African Muslims Ensloved in Syrian A Deuf . University Press New york.

25- Muslims in Spain . L. P. Havuey Page 277-278 1500 to 1614 University of elicagopress Chicago and London.2005

26- Moors in the Euvopean Renaissance Ta Neer Foundation.

27- Moors in the Euvopean Renaissance Ta Neer Foundation.

28- Arabic in Midle English Jessical Willson

28-A Dogs of God James Restem Jr Doubleday New York

۲۹۔ سفرنامہ ابن بطوطہ: ص ۹۳

۳۰۔ بیان رئیس الجامعہ اسلامی یونیورسٹی غرناطہ شمارہ زندگی۔ ۲ دسمبر ۱۹۹۴ء لاہور۔ ص۔ ۳

۳۱۔ پروفیسر ساجد میر ''یورپ میں چند روز'' رسالہ اہلحدیث ۱۷ تا ۲۳ اکتوبر ۱۹۹۷ء ص۔ ۱۰

۳۲۔ رسالہ اہلحدیث لاہور ۴ تا ۱۰ جولائی ۹۷۔ ص۔ ۲۴

ILES DE LERINS
CORNICHE
St Raphael
Fréjus
St Tropez
MAURES
Le Muy
Cogolin
DES
MASSIF

ابتدائیہ

بہشت بریں اور فردوس بر روئے زمین۔ اندلس آج عربوں کے لیے جنت گم گشتہ، ارضِ المفقودہ وموعودہ، فردوس المفقودہ وموعودہ اور اقبال کے لیے نورِ دیدہ مسلم، امینِ خونِ مُسلم و حرمِ پاک، شمعِ طور، حرم مرتبت، سرزمین پاک اور وادی ایمن ہے۔ جہاں اسلامی تہذیب وتمدن نے عروج وکمال کی بلندترین منازل طے کیں۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس پر مسلمانوں کے کمال ہُنر اور عروجِ فن کا نقش نہ ہو۔ جب سارا یورپ جہالت و گمراہی کے اندھیرے اور احساسات وخیالات میں شدید تنزل پذیری کا شکار تھا، اُس وقت اندلس علوم فن اور شعور وادراک میں روشن مینار کے طور پر رہنمائی کا اہم ترین فریضہ انجام دے رہا تھا۔ یہ عمل صدیوں تک جاری و ساری رہا۔ مسلمان اندلس جہالت وضلالت کے اس دور میں شمع علم وفن جلانے میں مصروف تھے۔ اندلسی طلبہ جہاں ایک طرف کسبِ علم کے لئے مشرق کا رُخ کرتے اور بغداد، رے، نیشاپور اور بخارا پہنچتے تو دوسری طرف اندلس میں جرمنی اور انگلستان کے طلبہ حصول علم کے لئے آتے۔ تاکہ سرچشمہ علم سے جو اس وقت صرف اسلامی شہروں قُرطبہ، اشبیلیہ، سلمنکہ اور غرناطہ کے سوا اور کہیں نہیں تھا، سیراب ہوں اندلسی جراح اور طبیب اپنے فن میں یکتائے زمانہ تھے۔ جنہوں نے علمِ جراحی، علم الابدان، علم الاعضاء اور علمِ ادویہ کو خام حالت سے اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔ اندلسی خواتین بھی مختلف علوم میں مہارت حاصل کرتی تھیں۔ اور بعض نے تو قرطبہ میں اپنے مطب بھی قائم کر رکھے تھے۔ جہاں وہ مریضوں کا علاج کرتی تھیں۔(۱)

ابنِ سینا، فارابی اور ابنِ رُشد کی تصانیف یورپی درسگاہوں کے نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔ سلمنکہ کی جامعہ میں اٹھارویں صدی تک وہی عربی نصاب (لاطینی میں ترجمہ شدہ) رائج تھا جو مسلمانوں کے زمانے میں تھا۔ علامہ اقبال نے اس کا ذکر اپنے خطبات، مقالات، تقاریر اور خطوط میں اکثر جگہ کیا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان ہی علوم جدیدہ کے بانی اور علم وحکمت کے علمبردار تھے۔ تحقیق کی نئی رُوح، مشاہدے، تجربے اور پیمائش کے جدید طریق کار جن پر سائنس کی عمارت استوار ہوئی وہ مسلمانوں کے ہی کارہائے نمایاں ہیں۔ اس کی اساس قرآن کی وہ آیات ہیں جن میں مسلمانوں کو ہواؤں کے مسلسل تغیر وتبدل، دن رات کے اختلاف، تاروں بھرے آسمان اور بادلوں کا فضائے بسیط میں تیرتے پھرنا کے مشاہدے اور غور وفکر کی دعوت دی۔(۲) مشرق کی نسبت اندلس تہذیب وثقافت کی سادگی اور حُسن وتازگی میں فطرت کے زیادہ

قریب تھا۔ اندلس میں علم وعلماء کی قدردانی کے باعث مشرقی علماء اندلس میں اپنا مستقبل زیادہ روشن سمجھتے تھے۔ تہذیب وثقافت کی اساس تعلیم ہے۔ اِس شعبہ میں اندلسی حکومت، امراء اور علماء کا قابل قدر کارنامہ ہی تھا کہ تعلیم اس حد تک عام تھی کہ رائن ہارٹ ڈوزی کو یہ کہنا پڑا کہ اُس وقت اندلس میں تقریباً ہر شخص پڑھا لکھا تھا۔ بلکہ مسیحی بھی عام طور پر عربی میں اس حد تک استعداد حاصل کر لیتے تھے کہ عربی میں شعر بھی کہتے تھے۔ اس زمانے کے ایک مشہور عیسائی الوارد نے ایک راہب یولوجیس (جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بار بار دشنام طرازی کی تاکہ اسے قتل کر دیا جائے اور بقول اس کے وہ شہادت کے مقام پر فائز ہو۔ اس بدزبانی کے نتیجے میں اپنے انجام کو پہنچا) کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق اس کے ملک کے عیسائی عربوں کی شاعری اور افسانوں کا بڑے لُطف اور ذوق وشوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے زیر مطالعہ مسلمان علماء اور فلسفیوں کی کتابیں رہتی ہیں۔ تاکہ وہ خوبصورت، نفیس اور صحیح عربی لکھ سکیں۔ افسوس! ایسے نوجوان جو علم ودانش میں ممتاز ہیں وہ سوائے عربی کے اور کسی زبان سے واقفیت نہیں رکھتے۔ وہ عربی کتب پڑھنے کے ساتھ ان سے اپنے کتب خانے بھی آراستہ کرتے ہیں۔ عربی ادب کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔ اور دینِ مسیح کی کُتب کو لائقِ اعتنا نہیں گردانتے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ مسیحی اپنی قدیم زبان بھی بھُولتے جا رہے ہیں اور ہزار میں سے صرف ایک آدمی بمشکل لاطینی میں صاف خط لکھ سکتا ہے لیکن عربی میں عربوں سے بہتر اشعار کہتے ہیں ۳ عربی ادب کے شوق اور لاطینی سے غفلت کی بنا پر عام لوگوں کے علاوہ خود پادری بھی انجیل کا درس عربی میں دینے لگے۔(۴)

اندلس میں مسلمان ۹۲ھ/۷۱۱ء میں داخل ہوئے اور پانچ صدیوں تک ان کا مدّ جاری رہا۔ اس کے بعد جزر شروع ہوا جو تین سو سال تک رہا اور آخر میں ۸۹۷ھ/۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی حکومت بھی ان سے چھن گئی۔ ''غرناطہ کے ساتھ ہی تمام سپین کی عظمت خاک میں مل گئی۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ عرصہ تک اِسلامی شوکت کا پرتو اِس ملک کی تاریخ پر روشنی ڈالتا رہا۔ جس کو آفتاب اسلام کی تابندہ شعاعوں نے کبھی روشنی اور حرارت پہنچائی۔''(۵)

اندلس سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہوتے ہی ''باطنی واندرونی تاریکی نے ان ممالک کا احاطہ کر لیا جو عربوں کی موجودگی میں آسمانِ تہذیب وترقی کے آفتاب بنے ہوئے تھے۔ فطرت اپنی جگہ قائم رہی مگر وہ لوگ رہے اور نہ ہی ان کا مذہب باقی رہا۔ ساری عظمت وشوکت عربوں کے

ساتھ چلی گئی۔ تباہی و مصیبت رہ گئی جو فاتح ہسپانیوں کے حصہ میں آئی۔ (۶)

اندلس میں مسلمانوں کا یہ دورِ حکومت تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے اِس قدر شاندار تھا کہ اقوامِ عالم کی تاریخ میں یہ عدیم المثال اور بے نظیر درجہ رکھتا ہے۔ عیسائی حکمرانوں، پادریوں اور مصنفین نے اسلامی میراث کو تاریخ کے صفحات اور ملک سے خارج کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ خوبصورت عمارات، مضبوط قلعے، باغات، مسجدیں، قبرستان غرض کہ ہر وہ چیز جو مسلمانوں سے وابستہ تھی ختم کر دی گئی۔ اور تو اور کئی سو حمام بھی مسمار کر دیے گئے۔ لیکن اس مساعی اور تگ و دو کے باوجود اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ آج اندلس کے اکثر پڑھے لکھے اور غیر متعصب عیسائی مسلم دور کو اندلس کا روشن ترین زمانہ کہتے ہیں۔

عربوں کے بارے میں مشہور تھا کہ جہاں اُن کے قدم پہنچے وہاں پوری طرح جم گئے لیکن اندلس میں کئی صدیاں رہنے کے باوجود ایسا نہ ہو سکا اور وہاں سے مسلمانوں کو اس طرح نکال دیا گیا کہ ایک نفس بھی ایسا باقی نہ رہا جو کلمہ گو ہو۔

مسیحی اندلس کا دورِ زریں صرف ایک صدی پر محیط ہے یہ از ایبلا اور فریڈی ننڈ کی فتح غرناطہ سے شروع ہو کر فلپ دوم کی وفات تک ہے۔ فرڈی ننڈ نے جنوبی اطالیہ کی ریاست نیپلز، صقلیہ اور سارڈینہ کے جزائر پر بھی قبضہ کر لیا چارلس پنجم کے زیرِ تسلط فرڈی ننڈ کے مقبوضات کے علاوہ آسٹریا، جرمنی کا کچھ حصہ، نیدرلینڈ، بیلجیم اور شمال مشرقی فرانس بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ سمندر پار مقبوضات بھی تھے۔ ے جن سے سونا چاندی جہازوں میں بھر بھر کر آتا تھا اور ان میں اکثر کو فرانس اور انگلستان والے لوٹ لیتے تھے۔

جس زمانہ میں مسلمان اندلس میں موجود تھے۔ صنعت اور زراعت ان کے دم سے تھی اور دوسرے علوم و فنون میں بھی وہ ماہر تھے۔ لیکن حکومت ان کی اپنی نہیں تھی ان کو مذہبی اور معاشرتی طور پر برابر تنگ کیا گیا۔ لیکن وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے اور یہی زمانہ مسیحی اندلس کی طاقت، شان و شوکت، مال و دولت اور جاہ و جلال کے لحاظ سے یورپ میں سب قوموں میں فائق تھا۔ اس وقت فوجی سطوت و قوت عیسائیوں کے پاس تھی اور ملکی تمدن عربوں کے زیرِ اثر تھا۔ لیکن 1610ء میں اندلس سے تمام مسلمانوں کو نکال دیا گیا۔ ☆ اس اقدام کی وجہ سے ملک تمام ہنرمند

☆ بہت سے مسلمان فرانس چلے گئے اور لاکھوں کی تعداد میں مراکش اور دوسرے اسلامی ملکوں میں جا بسے ۔بحرہ روم کی ساحلی پٹی پر آج بھی اسپینی حوالے کے ساتھ ایک بہت بڑی اقلیت کے طور پر موجود ہیں۔

کاریگروں اور لاکھوں زرعی مزدوروں سے محروم ہو گیا اور اس کے بعد اندلس کا تہذیبی زوال اتنی تیزی سے ہوا کہ تاریخ میں اس کی مثال کم ملتی ہے۔ کارخانے بند ہو گئے، زراعت ختم ہو گئی، شہر اور قصبے ویران ہو گئے۔ اس صدی میں ہی اندلس کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی غریب لوگ فاقہ کشی سے مر جاتے تھے۔ اس عہد کے ہسپانوی ادیبوں کا بڑا موضوع بھوک تھا اس زمانے کے ایک ادیب نے لکھا ہے۔

"کھیتوں میں نکل کر دیکھو جو کبھی ہرے بھرے لہراتے تھے سوائے خار و خس کے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ کیونکہ کوئی انہیں بونے جوتنے والا نہیں رہا۔ اہل سپین کی اکثریت آجکل کوئی کام نہیں کرتی کچھ لوگ تو امارت خاندانی کے جھوٹے دعوے اور زیادہ تر اس لئے کہ انہیں بھیک مانگنے کا چسکا پڑ گیا ہے۔۔۔۔۔۔ ہر جگہ آوارہ گرد ناکارہ لوگوں کی کثرت ہے۔ جو بیٹھے تاش کھیلتے رہتے ہیں یا خانقاہوں میں لنگر بانٹے جانے کا انتظار کرتے ہیں یا دیہات میں چوری چکاری کے لئے نکل جاتے ہیں" ۸

اور آخر کو نوبت ایں جا رسید کہ فلپ دوم اپنے ملازموں کو تنخواہیں بھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے لیے گرجوں میں صندوق رکھوا دیے تا کہ عوام اس میں روپیہ ڈال کر اس کی مدد کریں۔ ۹

اشبیلیہ میں جہاں مسلمانوں کے دور میں سولہ سو کارخانے تھے صرف تین سو رہ گئے۔ رفتہ رفتہ اندلس سیاسی اور اقتصادی طور پر تباہ ہو گیا۔ اور ساتھ ہی اسلامی تہذیب و ثقافت کے نقش و نگار بھی مٹ گئے۔ جرمنی کا مشہور شاعر نطشے کے بقول "ایک ایسی تہذیب غارت کر دی گئی جس کے مقابل ہماری انیسویں صدی بھی بہت زیادہ ناقص محتاج، اور خزاں رسیدہ معلوم ہوتی ہے" ۱۰

ان کو ان کے علاقوں سے مکمل طور پر خارج کر دیا گیا اور ان کی جگہ دوسرے علاقوں سے عیسائیوں کو لا کر آباد کیا گیا۔ اس کے بارے میں ایک یورپی کی رائے دیکھئے:

In the sixteenth century it was still the Moriscos, protected but virtually owned by their aristocratic masters, who cultivated the plains of Lerada, Valencia, Murcia, and Granada. (Spain under the Habsburgs pages 14 and 104)

It is not surprising therefore, that the Moriscose in the Alpujarras revolted between 1566 and 1571, which was

followed by were replaced by 12500 families from Galicia, Asturias, Leon and Burgos who were unfortunately, no match for the Moriscos, whom they followed. Thus the province of Granada lost its most advanced and most indusrious workers, a disaster from which it was never to recover. [10-A]

اندلسی حکمرانوں کی علوم فلکیات، کیمیاء، علم الابدان، ریاضی، طبعیات، ارضیات، حیاتیات، موسمیات اور دوسرے سائنسی علوم سے متعلق شعبوں میں اِن کی کارکردگی ہی جدید سائنس کی بنیاد ثابت ہوئی ان مسلمانوں نے ہی قرآنی تعلیمات سے سرشار ہوکر سائنس اور تجربہ کی اساس رکھی۔ تجرباتی طور پر تو انہوں نے ایک دھات کو دوسری دھات میں تبدیل کرنے کی کوشش بھی کی۔ یہ عمل بیسویں صدی میں جوہری تجربہ گاہوں میں مکمل ہوا۔ اندلس میں مسلم تہذیب کے کئی اہم علمی اور سائنسی مراکز عیسائیوں کے قبضے میں آگئے۔ بعض کتب خانے جلادیئے گئے۔ کچھ بچ گئے جن سے مغربی محققین نے فائدہ اٹھایا۔ مسلمان ایک طرف سائنس سے دور ہوتے گئے دوسری طرف مغربی عیسائی اس کے مالک بنتے گئے۔ یورپ کی اس علمی بیداری اور ذہنی ترقی میں اِسلامی افکار ونظریات کا بھی اثر ہے اگرچہ یورپ ترقی کرتا گیا لیکن اسپین جہالت کی تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اِس کے مقبوضات ایک ایک کر کے دوسری یورپی طاقتوں نے چھین لیے۔ اِس کی اہم وجہ مسلمانوں کے اخراج کے علاوہ اسپین پر پادریوں کا قبضہ بھی تھا۔ جو کئی صدیوں تک رہا۔ پادری بادشاہ اور سپین دونوں کے مالک تھے۔ ۱۸۱۲ء میں اسپین میں دوبارہ عدالت اختیار مذہبی قائم کردی گئی۔ اب اسپین میں مسلمان تو تھے ہی نہیں اس لئے ظلم وستم کا شکار آزاد خیال عیسائی ہونے لگے۔ ۱۸۲۴ء میں حکم ہوا کہ ان تمام تصانیف کو تلف کر دیا جائے جو عدالت کے خیال میں مذہب اور تمدن کی تمام بدعات کا ماخذ ومنبع ہیں تاکہ "سچے مذہب کو دین کے دشمنوں پر غلبہ ہو سکے" [11] بلکہ آزادی پسند رہنما روپچو کی تصویر رکھنے پر عورتوں کو دس دس سال کی سزا دی گئی۔ [12]

اندلس کی اسلامی تاریخ، ثقافت، علوم وفنون اور میراث کا ایک اجمالی جائزہ اگلے باب میں لیا گیا ہے۔

ممالک اور علاقے جو صدیوں سلطنت اسپین کا حصہ رہے

(قوسین میں اسپین سے آزادی کا سال دیا گیا ہے)

جزائر غرب الہند۔ (ویسٹ انڈیز) کیوبا (۱۸۹۸ء) جمہوریہ ڈومنیکا (یہ ہسپانوی مقبوضہ جزیرہ ہسپانیولا کا مشرقی حصہ ہے۔ اس جزیرے کا ایک تہائی حصہ ۱۶۹۷ء میں فرانس نے چھین لیا تھا مگر ۱۸۰۴ء میں اس نے ہیٹی کے نام سے آزادی حاصل کر لی۔ ڈومنیکا، ۱۸۶۳ء میں آزاد ہوا) جمیکا ۱۶۵۵ء میں اس پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا۔ ۱۹۶۲ء میں آزاد ہوا۔ ٹرنیڈاڈ، ٹوباگو (برطانیہ نے ۱۸۰۲ء میں چھین لیا۔ ۱۹۶۲ء میں آزاد ہوا) پورٹو ریکو (۱۸۹۸ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے چھین لیا)

شمالی امریکہ۔ میکسیکو (۱۸۲۱ء) فلوریڈا، ٹیکساس، نیو میکسیکو، نیوادا اور کیلیفورنیا کی امریکی ریاستیں پہلے ہسپانوی مقبوضات تھیں جو مختلف اوقات میں سپین یا میکسیکو سے ہتھیائی گئیں۔

وسطی امریکہ۔ کوسٹاریکا، (۱۸۲۱ء میں اسپین سے آزادی، ۱۸۳۸ء میں وفاقی وسطی امریکہ سے علیحدگی) گوائٹے مالا (۱۸۲۱ء میں اسپین سے آزادی کے بعد پہلے میکسیکو پھر وفاق وسطی امریکہ میں شامل رہا۔ ۱۸۳۹ء میں آزاد جمہوریہ بنا۔ ہانڈوراس (۱۸۲۱ء میں اسپین سے آزادی، ۱۸۳۸ء میں وفاق وسطی امریکہ سے علیحدگی۔ نکاراگوا (۱۸۲۱ء میں اسپین سے آزادی، ۱۸۳۸ء میں وفاق وسطی امریکہ سے علیحدگی۔ پانامہ (۱۸۲۱ء میں اسپین سے آزاد ہوکر کولمبیا میں شامل رہا۔ اعلان آزادی کے ۱۹۰۳ء۔) سان سالویڈور (۱۸۲۱ء میں اسپین سے آزادی، ۱۸۳۹ء میں وفاق وسطی امریکہ سے علیحدگی)

جنوبی امریکہ۔ ارجنٹینا (۱۸۱۶ء)۔ بولیویا ۱۸۲۵ء چلی (۱۸۱۸ء) کولمبیا (۱۸۱۹ء) ایکویڈور (۱۸۲۲ء میں اسپین سے آزاد ہوکر ۱۸۳۰ء میں عظیم کولمبیا میں سے علیحدگی۔ پیراگوائے (۱۸۱۱ء) پیرو (۱۸۲۴ء) یوروگوئے (۱۸۲۵ء) وینزویلا (۱۸۱۲ء میں آزادی ۱۸۳۰ء میں کولمبیا سے علیحدگی)

افریقہ۔ استرائی گئی (۱۷۷۸ء میں پرتگال سے اسپین نے لیا۔ آزادی ۱۹۶۸ء)۔
ہسپانوی صحرا (ریوڈی اور؟؟؟؟ ۱۹۷۶ء میں اسپین کے انخلا کے بعد مراکش نے اس کا الحاق کر لیا۔
خود شمال مراکش انیسویں صدی سے سپین کے تسلط میں رہا آزادی ۱۹۵۶ء)
ایشیاء۔ فلپائن (کرہ ارض کے گرد چکر لگانے والا پہلا جہاز ران فرڈیننڈ میجیلن یہیں مارا گیا تھا۔
ہسپانویوں نے ۱۵۷۱ء میں منیلا کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۹۸ء میں فلپائن، امریکہ نے چھین لیا آزادی
۱۹۴۶ء)

یورپ۔ جبرالٹر یا جبل الطارق ۱۷۰۴ء سے برطانیہ کے قبضہ میں ہے۔ سولہویں صدی عیسوی میں نیدرلینڈ، جرمنی اور اٹلی کے بعض علاقے سلطنت ہسپانیہ کا حصہ رہے۔۱۴

حواشی:

۱۔ لین پول، ''مسلمان اندلس میں'' مترجمہ، ماجد علی صدیقی، ایچ۔ ایم۔ کمپنی کراچی سن ندارد ص: ۱۷
۲۔ قرآنی آیات بقرۃ ۱۴۴
۳۔ رائین ہارٹ ڈوزی، عبرت نامہ اندلس، مترجم عنایت اللہ دہلوی، مقبول اکیڈمی لاہور۔ ۱۹۶۴ء ص ۵۹
۴۔ ڈارتھی لوڈر، ہسپانیہ مترجم سید ہاشمی فرید آبادی، شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۶۴ء ص ۳۴
۵۔ لین پول، ص ۱۸
۶۔ امیر علی تاریخ اسلام (بحوالہ کونڈی) مترجم حسین رضوی، ۱۹۶۵ء ص ۵۱۸
۷۔ جنوبی شمالی امریکہ کے ممالک (کیوبا، میکسیکو، ارجنٹائن، چلی، برازیل پیرو)
۸۔ ڈارتھی لوڈر، ص ۷۷/۷۸
۹۔ ایضاً ص ۷۸/۷۹
۱۰۔ غلام عمر خان ڈاکٹر، روح اسلام (اقبال کی نظر میں) صفیہ اکیڈمی کراچی ۱۹۶۷ء۔ ص ۱۴
10-A: Costa del sol By Douglas Clyne page 78 London 1966
۱۱۔ سی۔ اے فائف، ''یورپ کا عصر جدید'' مترجم قاضی تلمیذ حسین دار الطبع جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۹۳۶ء۔ ص ۱۰/۱۵۱
۱۲۔ ایضاً ص۔ ۱۹۸
۱۳۔ اردو ڈائجسٹ اپریل ۱۹۹۴ء۔ ص۔ ۸۶

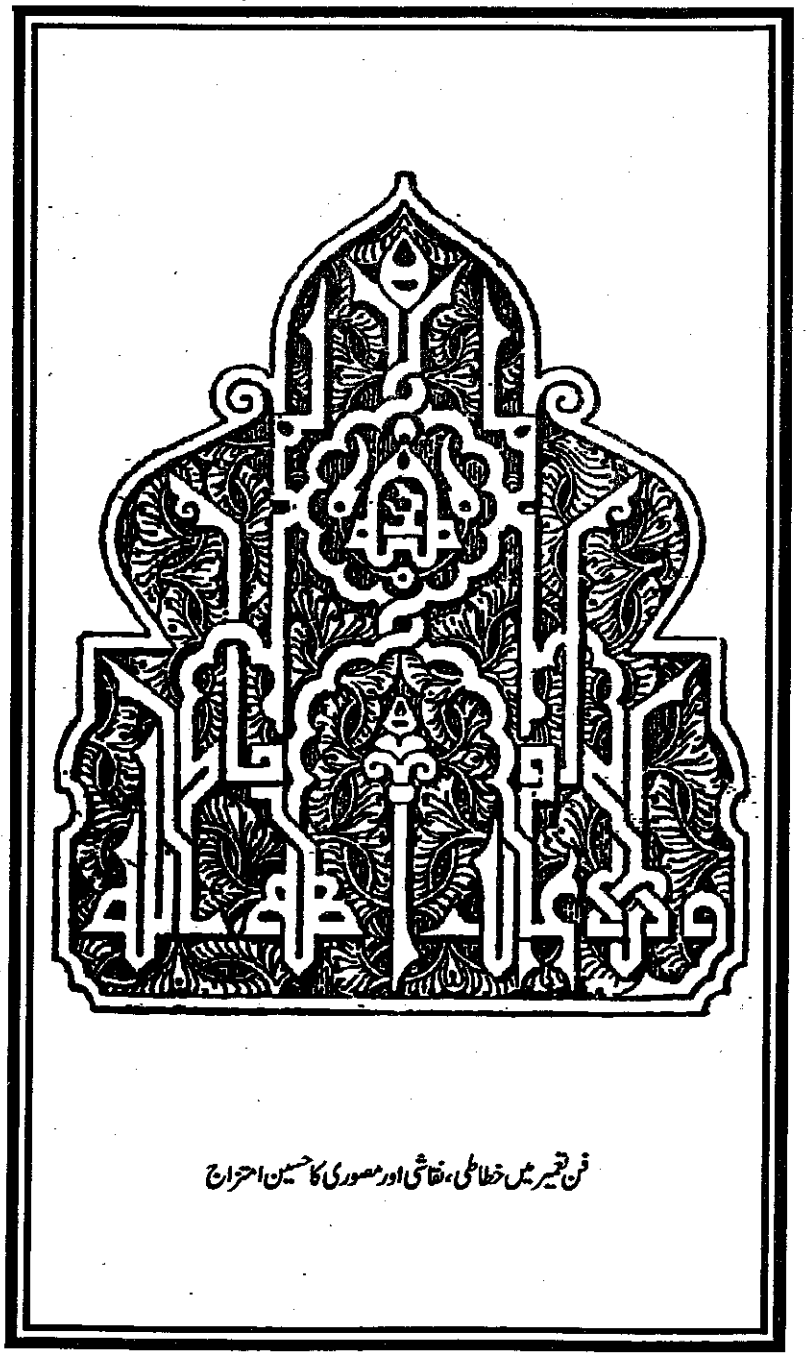

فن تعمیر میں خطاطی، نقاشی اور مصوری کا حسین امتزاج

پہلا باب

اندلس کی مختصر تاریخ

اسپین یورپ کا آخری کونہ ہے جس کو کوہ پائی رین یورپ سے جُدا کرتا ہے۔ اس ملک پر مختلف اقوام نے یورپ اور افریقہ کی طرف سے یورشیں کیں۔ اس کے غاروں میں ماقبل تاریخ کے نقوش اور تصاویر بھی ہیں۔ (۱) جس قوم کا سب سے پہلے اس ملک میں آنے کا سراغ ملتا ہے وہ آئی بیرین IBERIAN ہے۔ جس نے اسپین کو آبیریا کا نام دیا۔ یہ لوگ افریقہ سے خشکی کی اُس پٹی سے آئے جس نے افریقہ کو سپین سے ملا رکھا تھا۔ جو آہستہ آہستہ سمندر میں ڈوب گئی۔ (۲) ۴۰۰ ق۔م کے لگ بھگ فرانس کی طرف سے سلت یا قلط (CELT) وارد ہوئے جو پہلی قوم کے ساتھ گھل مل گئے۔ ان کے بعد بحری راستے سے فینقی اور یونانی حملہ آور ہوئے اور اسپین کے ساحلی مقامات پر اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ افریقہ سے قرطاجنہ والے آکر آباد ہو گئے ان کو یہاں آباد ہونے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ کیونکہ آبیری اور اُن کی نسل ایک ہی تھی۔ مشہور سپہ سالار ہنی بال اسی نسل سے تھا۔ جس قوم کو اسپین پر قبضے کے سلسلے میں سب سے زیادہ مشکل پیش آئی وہ اہلِ روم تھے۔ جس کے خلاف اہل سپین نے ڈیڑھ سو سال تک مزاحمت کی۔ آخر کار اسپین روم کا سب سے زیادہ حمایتی صوبہ بن گیا۔ اِس عہد کی عمارتیں، پل اور تالاب اب بھی موجود ہیں۔ بلکہ ایک نہر تو اٹھارہ سو سال سے پانی دے رہی ہے۔ اہلِ رومہ سے پہلے اسپین کا تعلق زیادہ تر افریقہ کے ساتھ تھا لیکن اب پھر یورپ کے ساتھ ہو گیا۔ رومنوں کے زوال کے وقت واندل، سوئیوی اور الان بھی اسپین میں آئے۔ (۳)

پانچویں صدی میں جرمن اقوام نے اسپین پر قبضہ کر لیا ان کی ایک شاخ وِس گاتھ نے یہاں حکمرانی قائم کی۔ آٹھویں صدی کے شروع میں مسلمان عرب سے نکل کر فلسطین، شام، مصر اور شمالی افریقہ سے ہوتے ہوئے (اس جگہ جہاں سے ابیری قوم اسپین میں داخل ہوئی تھی) اسپین میں داخل ہوئے (اس طرح ایک بار پھر اسپین کا تعلق افریقہ سے ہو گیا) اور تقریباً سارے اسپین کو فتح کرتے ہوئے کوہ پائی رین سے گزر کر انہوں نے جنوبی فرانس کو بھی قبضے میں کر لیا ان کا اسپین میں قیام قریباً آٹھ صدی تک رہا۔ مسلمانوں کا اندلس موجودہ یورپ کے تین ملکوں کے وسیع علاقے پر مشتمل تھا۔ جس میں پورا اسپین و پرتگال اور فرانس کے جنوبی صوبے شامل تھے۔ سسلی کے والی کا تقرر بھی امیر اندلس کرتا تھا۔ انھی عربوں کی ایک شاخ نے کوہ ایلپس سوئٹزرلینڈ اور مشرقی جرمنی پر تقریباً اسی سال تک حکمرانی کی۔ (۴) اندلس کی حدود میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ اس لیے اس کی حدود کی کوئی مستقل پیمائش نہ تھی۔ بقول شریف ادریسی (اندلس کا جغرافیہ دان) خلافت

اموی کے وقت اندلس کا طول گیارہ سو میل اور عرض چھ سو میل تھا۔ (۴)(۱)

اندلس پر پہلا اسلامی حملہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ۲۷ھ میں حضرت عبداللہ بن نافع بن حصین اور حضرت عبدالرحمٰن بن نافع بن عبدلاقیس نے کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے انھیں لکھا کہ قسطنطنیہ اندلس کی راہ سے آسانی سے فتح ہو سکتا ہے۔ اور تم لوگ اس سعادت کے اجر کے مستحق ہو سکتے ہو۔ جس کی بشارت رسولِ خدا ﷺ نے دی تھی۔ یہ لوگ اندلس کے بعض ساحلی شہروں پر قابض ہو گئے تو بربروں کی بغاوت کی بنا پر اندلس ہی میں رہ گئے۔ ان کے بارے میں تاریخ میں کوئی ذکر نہیں کہ ان پر کیا بیتی۔ (۵) اس کے بعد دو مہمیں بھیجیں گئیں۔ (۶) آخر ۹۳ھ/۷۱۱ء میں مسلمان طارق بن زیاد کی قیادت میں اندلس میں داخل ہوئے اور اس کا بیشتر حصہ فتح کر لیا۔ ایک سال بعد موسیٰ بن نصیر مزید فوج لے کر اندلس آ گیا اور پھر دونوں جرنیلوں نے مل کر سارا اسپین، پرتگال، اور جنوبی فرانس کے کچھ حصے بھی قبضے میں لے لیے۔ (۷) موسیٰ کے الفاظ میں یہ خطہ ''زمین و آسمان میں ملک شام آب و ہوا میں یمن، گل و رحاحین میں ہندوستان، پھلوں میں مصر، اور سونے چاندی میں چین سے مماثل ہے۔ (۸)

اس اثناء میں دربار خلافت سے موسیٰ کی واپسی کے احکام جاری ہو گئے اور موسیٰ بن نصیر کو مجبوراً واپس جانا پڑا ورنہ اس کا ارادہ تھا کہ فرانس کے راستے جرمنی، اٹلی اور یونان پر یلغار کرتے ہوئے قسطنطنیہ جا پہنچے۔ (۹)

موسیٰ نے اپنا جانشین اپنے بیٹے عبدالعزیز کو مقرر کیا۔ ۷۱۳ء سے ۷۵۶ء تک چوبیس حکمرانوں نے اندلس پر حکومت کی، یہ دور ''دور ولایت'' کہلاتا ہے۔ کیونکہ والیِ اندلس افریقہ کے حکمران کے ماتحت ہوتا تھا۔ اور والیِ افریقہ خلیفہ دمشق کے۔

اسی دوران ۷۳۲ء میں جنگ تورس ہوئی۔ جو مغرب کی تاریخی روایت کے مطابق بہت اہم اور فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے لیکن مسلمانوں نے اسے ایک سرحدی جھڑپ کی حیثیت دی ہے۔ گبن کی کتاب Decline & fall of Roman Empire کے مطابق اگر اس جنگ میں مغرب کو شکست ہو جاتی تو مسلمان پولینڈ کی حدود اور سکاٹ لینڈ کے پہاڑی علاقوں تک پہنچ جاتے۔ دریائے رائن، دریائے نیل اور فرات سے زیادہ گہرا نہیں ہے۔ عرب بحری بیڑہ دریائے ٹیمز کے دہانے تک پہنچ جاتا اور غالباً قرآن کی تفسیر آکسفورڈ کے سکولوں میں پڑھائی جا رہی ہوتی۔ اور اس کے منبروں سے مخنون لوگوں کے سامنے حضرت محمدؐ پر نازل ہونے والی وحی کی

تصدیق کی جارہی ہوتی۔'' اس نصف صدی میں ہی آپس کی خانہ جنگی کے باوجود مسلمانوں نے اندلس میں ایک ایسے شاندار اور درخشاں تمدن کی اساس مہیا کر دی جس کے متعلق اسکاٹ لکھتا ہے،'' اندلس زیر حکومت اسلامی پچاس سال کے اندر تہذیب کے اس نقطہ پر پہنچ گیا جہاں تک اٹلی کو زیر حکومت پوپ پہنچنے میں ایک ہزار برس لگے تھے۔[10]

دوسرا دور اموی حکومت کا دور زریں ہے۔ اس دور میں اندلس اپنی شان وشوکت جاہ و جلال، تہذیب وتمدن، علوم وفنون کے نقطہ عروج پر پہنچا۔ یہ دور ۷۵۶ء عبدالرحمٰن الدخل کے عہد سے شروع ہوا۔ ابتدائی سات حکمرانوں نے اپنے آپ کو امیر کہلایا۔ عبدالرحمٰن ثالث نے خلیفہ کا لقب اختیار کر لیا۔[11] بعد میں حکمران خلیفہ کے لقب سے ہی پکارے جانے لگے۔ عبدالرحمٰن ثالث کا دور حکومت پچاس سال پر محیط ہے۔ اور یہی دور ہے جب اندلس یورپ کا سب سے زیادہ دولت منداور طاقتور ملک ہونے کے ساتھ امیر ترین ثقافت کا مالک بھی تھا۔ اس کے بعد اس خاندان کو آہستہ آہستہ زوال آتا گیا اور ۱۰۲۰ء میں اموی حکومت ختم ہوگئی۔[12] اموی خاندان کے بعد قریباً بیس خاندانوں نے اندلس کے مختلف علاقوں میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ ایک زمانے میں اندلس میں ہی چار خلیفۃ المسلمین تھے۔ اس کو دور ملوک الطوائفی کہتے ہیں اور ملوک الطوائفی کے دور میں مسلمانوں کی سیاسی قوت ختم ہوگئی تھی۔ لیکن اس زمانے میں بھی تہذیبی اور علمی فروغ جاری رہا۔ قرطبہ کی سیاسی اور ثقافتی مرکزیت ختم ہونے کے بعد اشبیلیہ کو عروج حاصل ہوا اور وہ اندلس کی تاریخ کا مرکز ومحور بن گیا۔

عیسائیوں نے مسلمانوں کی مرکزی طاقت کا شیرازہ بکھرنے پر اطمینان کا سانس لیا اور ۱۰۸۵ء میں انہوں نے طلیطلہ پر قبضہ کر لیا اب وہ اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ مسلمانوں کو اندلس سے نکال سکتے تھے۔ اسی اثناء میں یوسف بن تاشفین اندلسی بادشاہوں کی درخواست پر افریقہ سے ایک لشکر لے کر آ گیا۔ اور عیسائیوں کو زلاقہ کے میدان میں زبردست شکست ہوئی۔ مسلمانوں کے باہمی نزاع اور عیسائیوں کے خطرے کی بنا پر مرابطین نے براہِ راست اندلس کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ مواحدین نے جب افریقہ کو اپنے قبضے میں کر لیا تو انہوں نے اندلس کی حکومت بھی مرابطین سے چھین لی۔ اس خاندان کے عہد میں فلسفہ کو بہت ترقی ہوئی۔ ابن طفیل، ابن رشد اسی عہد کے ممتاز فلاسفہ میں سے تھے۔ خاندان مواحدین کے بادشاہ یعقوب الناصر نے الفانسو ہشتم سے ۱۲۱۲ء میں زبردست شکست کھائی اس جنگ میں ہزاروں بربر مارے گئے اس کے

ساتھ ہی اس خاندان کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ ۱۲۱۲ء سے لے کر ۱۲۵۲ء تک اندلس میں عیسائی بادشاہوں کی پیش قدمی کا زمانہ ہے۔ ۱۲۳۶ء میں قرطبہ نے ہتھیار ڈال دیئے اور ۱۲۴۸ء میں اشبیلیہ بھی عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔

اب اندلس میں مسلمانوں کی آخری پناہ گاہ غرناطہ تھا۔ لاکھوں مسلمانوں نے عیسائیوں کے مقبوضہ علاقے سے غرناطہ میں سکونت اختیار کر لی۔ اِسی دوران عیسائیوں کے آپس میں جھگڑے کی بنا کر مسلمان مزید دو صدیوں تک اندلس میں قیام پذیر رہے۔ اس سارے عرصے میں غرناطہ پر خاندان بنی نصر کی حکومت تھی۔ جس کا سلسلہ نسب مشہور صحابی حضرت سعد بن عبادہؓ سے ملتا ہے۔ الحمرا کا مشہور عالم قصر اسی خاندان نے تعمیر کرایا۔[13]

۲ جنوری ۱۴۹۲ء کو عیسائیوں نے ایک سال کے محاصرہ کے بعد غرناطہ پر قبضہ کر لیا اور ان کی ''فتح مکرر'' تقریباً آٹھ سو سال کے بعد تکمیل کو پہنچ گئی۔ مسلمان اندلس میں غلامی اور کسمپرسی کی زندگی گزارنے لگے۔ ۱۴۹۹ء میں فرڈی ننڈ نے حکم دیا کہ مسلمان یا تو عیسائی ہو جائیں یا پھر اندلس سے نکل جائیں۔ لیکن بادشاہ کے حکم پر زیادہ سختی کے ساتھ عمل نہ ہوا۔ بہت سے مسلمان کسی نہ کسی طرح اس ملک میں زندگی گزارتے رہے۔ ۱۵۲۶ء میں محکمہ تفتیش مذہبی کے حکم پر ہزاروں مسلمان آگ میں جلا دیئے گئے۔ ۱۵۵۶ء میں فلپ دوم نے ایک نیا قانون جاری کیا کہ مسلمان اپنی زبان، عبادت عقائد اور مخصوص طرز زندگی سے فوراً دست کش ہو جائیں اس کے ساتھ ہی اس نے یہ حکم بھی دیا کہ اسپین میں سارے غسل خانے ڈھا دیئے جائیں۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ غرناطہ کے مسلمانوں نے بغاوت کر دی لیکن یہ بغاوت جلد ہی فرو کر دی گئی۔ ۱۶۰۹ء میں فلپ سوم نے مسلمانوں کو اسپین سے خارج کرنے کے متعلق آخری حکم نامے پر دستخط کر دیئے۔ طلیلہ کے راہب بلیڈا نے کہا ان سب کو قتل کر دو۔ بجائے اسپین سے نکالنے کے ۱۶۱۰ء میں ایک مہاجرت کے دوران جب ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان افریقہ جا رہے تھے بلیڈا بڑی خوشی سے بیان کرتا ہے کہ ان میں سے ایک لاکھ مروا دیئے گئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تیس لاکھ مسلمان اندلس سے نکل گئے۔ جو قتل مسلمانوں کا ایک تہائی تھے۔ باقی تمام کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے متعلق لیبان کہتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ وحشی سے وحشی اور بے رحم ملک گیروں نے کبھی اس قسم کے دردناک قتل عام کا دھبہ اپنے دامن پر نہیں لگایا۔[14] زیادہ تر مسلمانوں نے جان دے دی مذہب عیسائیت قبول نہ کیا۔[15]

اندلس عربوں کا بہشت بریں تھا۔ اسی کے متعلق ابن سفر کہتا ہے۔

فی ارض اندلس تلتذ النعماء
ولد یغارق نیما القلب سداء
انهارِ هافغه و المسك تربتها
والخذر و فیها عذاری مابها عوض
نهی الریاض وکل الارض صحراء

اندلس (وہی وادیِ جنت نظیر ہے) جہاں نعمتوں کی بہتات ہے اور دِل ہمیشہ مسرتوں سے ہمکنار رہتا ہے۔ اس کی نہریں سیمیں ہیں اور اس کی مٹی مشک ہے۔ اس کے باغات ابریسم ہیں اور یہاں کی کنکریاں موتی ہیں۔ یہاں کی دوشیزائیں حسن و جمال میں بے مثال ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ زمین کا یہ ٹکڑا باغ جہاں ہے اور دنیا کے باقی حصے اس کے مقابلے میں بنجر ہیں۔" ۱۴

اندلس میں مسلمانوں نے ایک شاندار اور اعلیٰ تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھایا اس کو مشرقیت اور مغربیت کے امتزاج سے ایک نئی جلا بخشی اس کی بدولت ایک خوبصورت اور عجیب و غریب ثقافت سے دنیا روشناس ہوئی جس نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ اپنے دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا۔

اندلس میں اموی ریاست کا نظامِ حکومت دمشق طرز کا تھا۔ بادشاہ یا خلیفہ مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور فوجی امور کا مالک تھا۔ سلطنت کا کاروبار چار حصوں پر مشتمل تھا۔ ا۔ خزانہ، ۲۔ امور خارجہ، ۳۔ عدالت، ۴۔ فوج۔ ان کے لیے علیحدہ علیحدہ وزیر ہوتا تھا اور ان سب پر وزیر اعظم تھا، جو حاجب کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

اس وقت کی اسلامی دنیا میں اندلس کا نظام عدالت سب سے بہتر تھا۔ اور میرے خیال میں خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی قانونِ عدل کا صحیح نفاذ جتنا اندلس میں ہوا اور کسی جگہ نہ ہو سکا۔ ہر شہر میں ایک عدالت تھی جس کا سربراہ "قاضی الجمع" ہوتا تھا۔ اور ان سب عدالتوں کا سربراہ "قاضی القضات" کہلاتا تھا۔ غیر مسلموں کے لیے علیحدہ عدالتیں تھیں اندلس میں بعض قاضی القضات نے بادشاہِ وقت کو بھی اپنی عدالت میں بطور ملزم حاضر کیا اور کسی رُو رعایت کے بغیر فیصلے کئے۔ ان میں یحییٰ بن یحییٰ، منذر بن سعید اور محمد بن بشر قابل ذکر ہیں۔ ہر شہر کا پولیس افسر صاحب الشرط کہلاتا تھا۔ جس کے تحت صاحب المدینہ اور صاحب اللیل ہوتے تھے۔ ڈاک کے محکمہ نے

اس حد تک ترقی کر لی تھی کہ خبروں اور خطوں کی تیز رفتاری کی بنا پر عیسائیوں کے نزدیک بادشاہ کے پاس "جن" ہیں۔

ابتداء میں فوج مختلف قبائل کی شکل میں تھی۔ عبدالرحمٰن الداخل نے اسکو باقاعدہ ایک مستقل فوج کی صورت میں منظم کیا۔ اس کے علاوہ اسی کے زمانہ میں تمدنی ترقی شروع ہوئی۔ نئی نئی صنعتیں جاری کیں۔ مسجد قرطبہ کی تعمیر شروع کی قصر رصافہ بنوایا۔ دور دور سے پودے منگوا کر کاشت کروائے۔ مدرسے اور مکتب کھولے۔ ہشام نے اندلس کو اس زمانے میں ایک فلاحی مملکت کا درجہ دیا۔ مستحق لوگوں اور یتیموں کے وظیفے مقرر تھے۔ ہر عامل کی خفیہ نگرانی کی جاتی تھی کہ کہیں وہ کسی پر زیادتی نہ کرے۔ ہشام کی نیک دلی پارسائی اور فرض شناسی کا شہرہ سارے عالم اسلام میں تھا۔ چنانچہ حضرت مالک نے خواہش ظاہر کی کہ کاش ان کا اس سال کا حج اُس نیک نہاد امیر کی قیادت میں انجام پاتا اس سے انکا مطلب یہ تھا کہ تمام عالمِ اسلام میں صرف ہشام ہی صحیح مسلمان بادشاہ تھا۔

عبدالرحمٰن ثانی نے اسلامی تہذیب و ثقافت کو ارزانی دی۔ سلطنت کا کاروبار چلانے کے لیے شخصی فرمانروائی کی بجائے ملک کے چند داناؤں پر مشتمل ایک وزارت قائم کی (۱۷)۔ اس اسلامی تہذیب و تمدن کی نشو و نما کی بنا پر بہت سے عیسائی ایک طرح کے عرب بن گئے وہ مسلمان تو نہیں ہوئے لیکن عربوں کی زبان و ادب، مذہب اور دوسرے تہذیبی رجحانات نے انھیں عرب بنا دیا۔ مسلمانوں کی غیر معمولی ترقی و عروج سے ان کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں اور انہیں فنِ شاعری، فلسفہ، اور سائنس کے بارے میں اپنی کم مائیگی کا خوب احساس ہو گیا تھا۔ (۱۸)

عبدالرحمٰن ثالث کا زمانہ اِسلامی تہذیب و تمدن کے عروج کا زمانہ ہے۔ پچاس سالہ دور حکومت میں اردگرد کی عیسائی حکومتیں اس کی باج گزار تھیں۔ سیاسی تحفظ کی بنا پر تہذیب اور ثقافت نے اپنی آخری حدوں کو چھو لیا تھا۔ اس نے ہی اپنی امارت کو خلافت میں تبدیل کیا۔ (۱۹)

اس کی فوج دنیا کی سب سے بڑی فوج تھی اسکا بحری بیڑا اپنی مثال آپ تھا۔ جس کی بدولت اس کے بحری جہاز تمام دنیا کے مابین تجارتی تعلقات قائم کرنے کا سبب بنے۔ اِس کا دربار شان و شوکت کے اعتبار سے دوسرے درباروں کی نسبت منفرد اور ممتاز تھا۔ بہت سے بادشاہوں نے اس کے دربار میں سفارتیں بھیجیں۔ جن میں بیزنطینی، شاہ جرمنی اور شاہ فرانس کی سفارتیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔

☆☆☆

زراعت

مسلمانوں نے اندلس کو زراعت کے میدان میں گلزار بنا دیا تھا اور اس کو ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سرسبز شاداب زرعی ملک میں تبدیل کر دیا تھا۔ بہت سے علاقوں میں اب بھی ایک ہزار سال سے انہی نالیوں میں پانی آ رہا ہے۔ جو عربوں نے بنائی تھیں۔ اشبیلیہ کے اردگرد چالیس میل کے رقبے میں زیتون کاشت کیا گیا تھا۔ یہ زیتون کے تیل کی ایک بڑی منڈی تھی۔ آج بھی اسپین کی اہم پیداوار زیتون ہی ہے۔ قرطبہ اور غرناطہ کے دونوں طرف میلوں تک باغات تھے۔ اندلس میں زعفران عربوں نے ہی لا کر کاشت کیا تھا۔ جو وہاں سے دوسرے ملکوں کو برآمد کیا جاتا تھا۔ اندلس میں عربوں نے نہریں، کنویں اور تالاب بنائے القنت کا مصنوعی تالاب جواب بھی قائم ہے۔ تین میل لمبا اور پچاس فٹ گہرا ہے۔ اس طرح کے کئی اور بھی تالاب تھے جن کے آثار باقی ہیں۔ دریاؤں پر بند بھی باندھے، دریائے صفورا کا پابند سات سو ساٹھ فٹ چوڑا، دو سو چونسٹھ فٹ لمبا اور باون فٹ اونچا تھا۔ بارھویں صدی عیسوی میں ابن العوام نے زراعت و باغبانی اور دوسری گھریلو دستکاریوں پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس میں اندلس کے مسلمانوں کی زراعتی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ان کی پیداوار بڑھانے اور ان کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کی ترکیبیں بھی بتائی گئی تھیں۔ نیز اس میں نسل کشی، میوے چٹنیاں، شہد کی مکھیاں پالنے اور مختلف قسم کی ادویات تیار کرنے کے قاعدے بیان کیے ہیں۔ مشرقی اور مغربی سپین میں بہت سے پھلوں کے باغ اور ان میں آب پاشی کے ذرائع ایک ہزار برس گزر جانے کے باوجود سلامت ہیں۔ اور عیسائیوں کو مسلمانوں کی یاد دلاتے ہیں۔ (۲۰)

مسلمانوں کی بحر روم، پر اجارہ داری ہونے کی بنا پر اس علاقے کی تجارت انہی کے دم سے تھی۔ اس لیے اسلامی اندلس میں داخلی اور خارجی تجارت کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ اندلس کا محل وقوع ایسا ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ تین براعظموں سے لین دین کر سکتا ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کے تجارتی قافلے خشکی کی راہوں سے سارے یورپ میں گھوم جاتے اور وہ یورپ کے ایک ایک مقام تک پہنچتے اور اس طرح ان ممالک کو وہ نعمتیں بہم پہنچاتے جو اسلامی دنیا کو حاصل تھیں۔ ان کے بحری جہاز دنیا کی ہر بندرگاہ تک پہنچتے۔ اندلس کے مسلمانوں کی تجارت دور دراز کے ممالک سے بھی تھی اور اس کا ثبوت وہ سکے ہیں جو ایک طرف ڈنمارک، سویڈن اور دوسری

طرف چین، جاپان اور دریائے والگا کے پار کے علاقوں میں ملے ہیں۔ اندلس کی عیسائی ریاستیں پانچ صدیوں تک اسلامی حکومتوں کی اقتصادی اور تجارتی مدار میں رہیں۔ ان کی تجارت پر مکمل طور پر مسلمانوں اور یہودیوں کی اجارہ داری تھی۔ اندلس کے طبعی حالات اور زرعی و معدنی پیداوار بھی بیرونی تجارت میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوئی۔

اندلس کے مغربی ساحلوں پر عنبر نکالا جاتا تھا۔ اقلیم بشرہ میں عوج الخوج کی بڑی کثرت تھی۔ یہ عود ہندی سے بھی بہتر تھا۔ اس کے علاوہ قسط الطیب، سنبل الطیب اور فسطانہ بھی برآمد ہوتا تھا۔ قلعہ ایوب کا کہربا، لورقہ سے لاجورد اور قرطبہ سے بلور کے ساتھ مدینہ اشبونہ کے وہ موتی جو رات کو چمکتے تھے دنیا بھر کو بھیجے جاتے مالقہ سے سُرخ رنگ کے یاقوت اور تدمیر سے مقناطیس بھاری مقدار میں برآمد کیا جاتا تھا۔ چاندی اندلس کی برآمدی تجارت کا ایک اہم عنصر تھا۔

مسلمانوں سے پہلے گوتھوں نے کان کنی میں کوئی خاص کام نہیں کیا تھا۔ اس لیے اُن کی بیرونی تجارت بہت کم تھی۔

اندلس کی زرعی چیزوں میں جو برآمد کی جاتی تھیں ان میں پہلے نمبر پر طلیطلہ کا زعفران تھا۔ جس سے حکومت کو بہت آمدنی ہوتی تھی اور حکومت نے سرکاری طور پر بھی زعفران کاشت کرایا تا کہ باہر زیادہ مقدار میں بھیجا جا سکے۔ اسکے علاوہ وادی آش کے سیب اور مالقہ کی تین کے سبب بھی اُندلس کی تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ مقریٰ کے الفاظ ہیں۔ **ونمالقه التين الذى يغرب المثل بحسنه.**

یہ تین ہند اور چین تک جاتی تھی۔ مالقہ سے نارنگی، انگور اور انار جو بیرونی منڈیوں میں خوب دام پاتے تھے باہر بھیجے جاتے تھے۔

صنعتی چیزوں میں ریشمی اور سوتی کپڑا اندلس سے باہر بھیجا جاتا جس سے اندلس کو کروڑوں دینار سالانہ کی آمدن ہوتی۔ مختلف قسم کا اسلحہ اور برتن بھی۔ ان دونوں صنعتوں میں انھیں کمال حاصل تھا وہ چینی کے برتنوں پر سونے اور چاندی کے رنگ بڑی ہنرمندی کے ساتھ چڑھاتے اور یہ برتن بیرونی دنیا میں بڑی قیمت پاتے۔

سرکاری اہتمام سے مختلف شہروں میں تجارتی میلے لگتے جن میں ملک کے تاجر اپنا سامان فروخت کرتے اور یہاں سے خرید کر اپنے ملک لے جاتے تھے۔ اندلس کی تجارت کی ترقی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اندلسی حکومت بیرونی تاجروں کے جان و مال کی پوری حفاظت کرتی تھی

اگر کسی تاجر کا کوئی نقصان ہو جاتا تو حکومت اسکی تلافی کرتی تھی اس لیے بیرونی ملکوں سے بلاخوف وخطر بے شمار تجار یہاں اپنا مال لاتے اور باہر لے جاتے۔

☆☆☆

فنِ تعمیر

فن تعمیر مسلمانوں کا خاص فن تھا۔ جس میں علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں نے بہت خوبصورت نمونے مختلف اسلامی ملکوں میں تعمیر کیے اور اس فن میں خاص طور پر نمایاں ترقی کی ہے۔ اندلس میں بھی دوسرے شعبوں کے ساتھ اس میں مسلمانوں نے اعلیٰ تعمیراتی اور فنی بلندی پیدا کی۔ مسلمانوں کی اندلس میں پہلی قابل توجہ تعمیر قصر رصافہ تھی۔ جو الداخل نے دمشق کی طرز پر قرطبہ میں بنوایا تھا۔ جس مین ابتدائی طور پر دمشق کے فن تعمیر کی نقل کی تھی۔ لیکن مختلف ماحول ہونے کی بنا پر شام کے فن تعمیر سے علیحدہ شکل اختیار کر لی۔ بیزنطینی اور شام کے معماروں نے مل کر اندلس میں ایک نیا فنِ تعمیر ایجاد کیا۔ یہ فن قصر رصافہ میں ابتدائی شکل میں تھا اور الزہرا کی تعمیر کے وقت اپنے انتہائی عروج پر تھا۔ مسجد جامع کا محراب تو دنیا کے عجائب میں سے تھا۔ اندلس کی مساجد وہاں کے گرجوں سے یکسر مختلف تھیں۔ نہ ان کے محراب ایسے تھے، نہ ستون، نہ بیل بوٹے اور نہ ترتیب۔ اندلسی عربوں نے فن تعمیر میں ریاضی کا بڑا استعمال کیا۔ چنانچہ اسکاٹ لکھتا ہے، ''عربوں نے ریاضی کو زیادہ اہم جانا انہیں اس میں غیر معمولی مہارت نصیب تھی۔ انہوں نے اپنی عمارتوں کی تعمیر میں اس سے بہت کام لیا۔ یہ بات پایہ تصدیق کو پہنچ چکی ہے کہ دسویں صدی کے شروع میں ہندسہ اور الجبرا کے ساتھ ساتھ انجینئرنگ یعنی نقشہ کشی اور عمارات بنانے کی علمی تعلیم دی جاتی تھی۔ (۲۶)

اندلسی مسلمانوں نے نہ صرف اپنی عمارتوں کے نقشوں میں جدت برتی بلکہ انہوں نے دیواروں کی زیبائش میں بھی غیر معمولی ہنرمندی و مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مسلمانانِ اندلس نے عمارتی زیبائش کے لیے جتنے طریقے استعمال کئے ہیں ان میں سب سے بہتر عربی حروف عبارت کی تحریر تھی۔ عرب کچھ اس ڈھنگ سے قرآن کی آیات کو دیواروں کی پیشانیوں پر نقش کرتے کہ طرح طرح کے بیل بوٹے بن جاتے۔ (۲۷) یہ بیل بوٹے اس قدر خوبصورت تھے۔ کہ مسلمانوں کے زوال کے بعد یورپ کے معماروں نے بھی ان جانے بوجھے انہیں اختیار کر لیا۔ اس سلسلے میں اسکاٹ نے ایک مثال دی ہے کہ سینٹ پیٹر کے سب سے بڑے گرجے کے سب سے بڑے

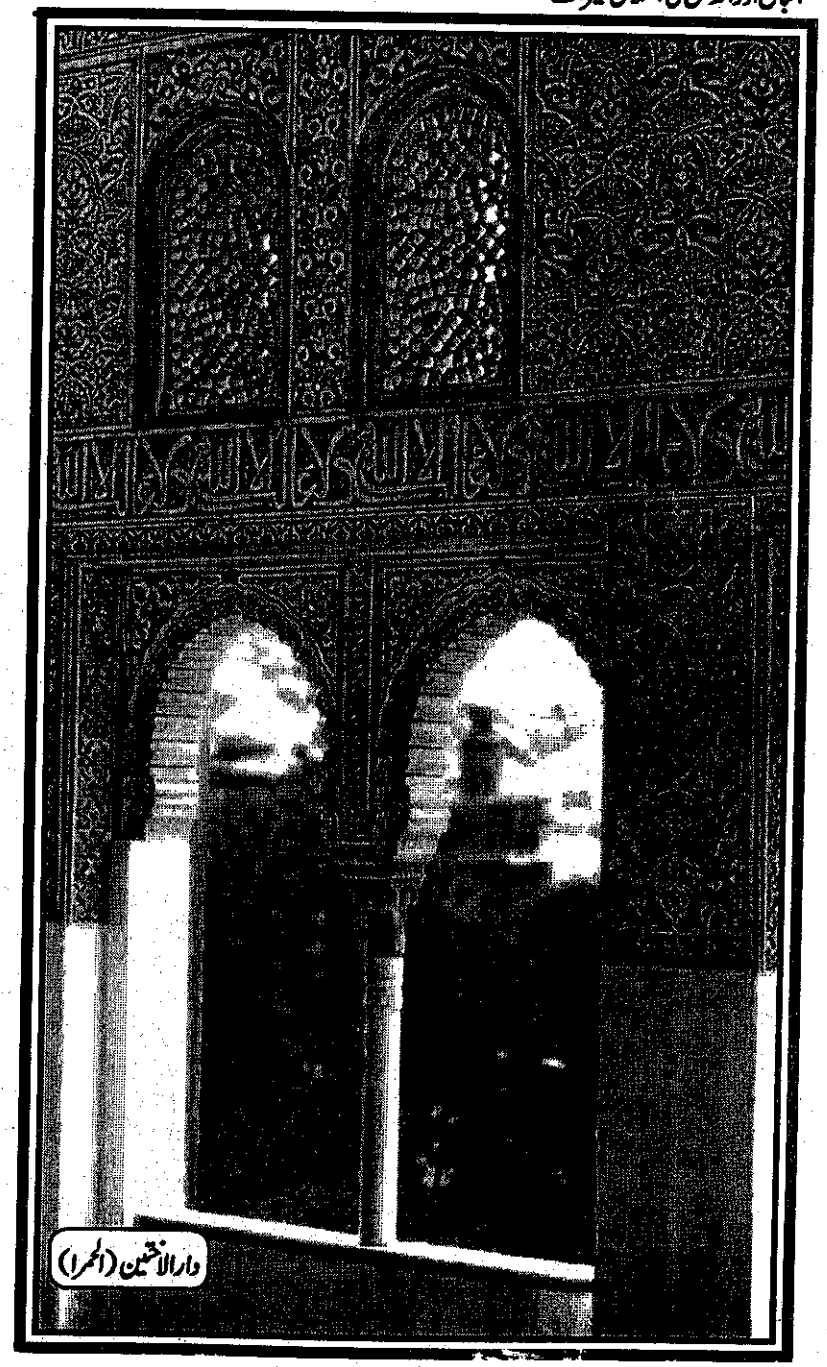

دارالاختین (الحمرا)

The General life garden, Granda

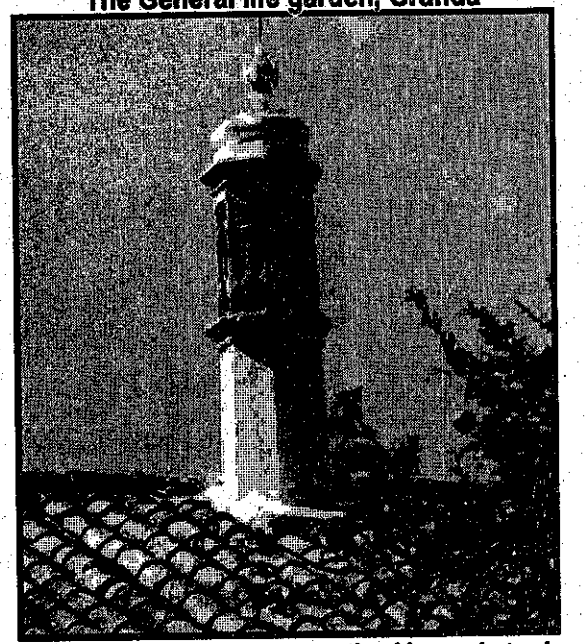

Decorative fretwork chimneys are the Algrave's trademark, and a reminder the Moors were here for five hundred years

MOORISH PALACE

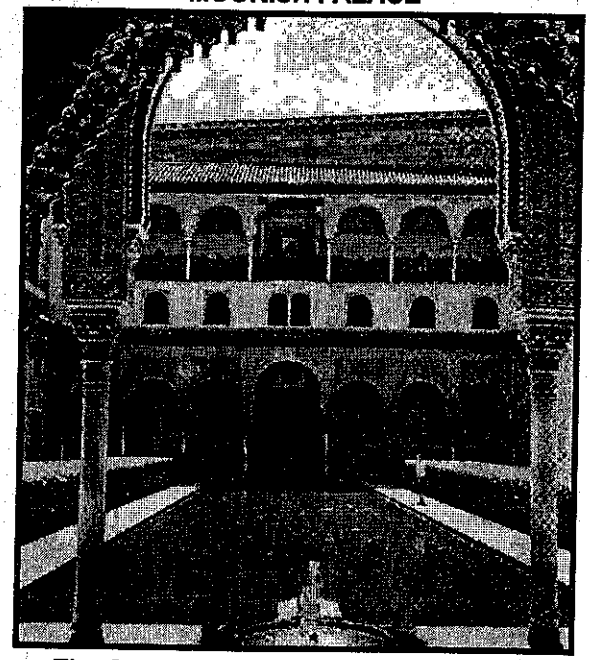

The Court of the Myrters in the Alhamra

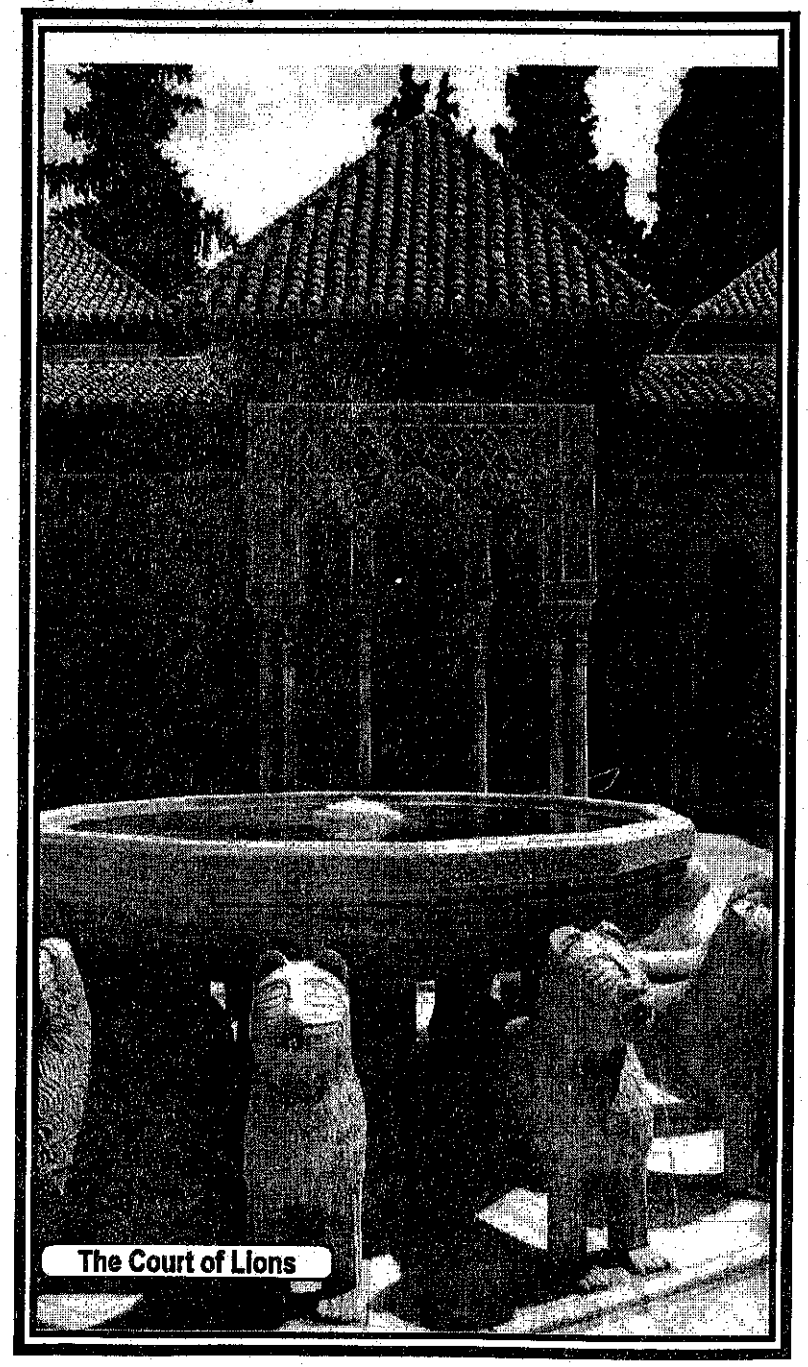

دروازے پر جو بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں قرآنی آیات لکھی ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں کلمہ طیبہ بھی ہے عربوں نے ان کلمات کو کچھ ایسے بیل بوٹوں کی شکل دے دی تھی۔ کہ عربی سے ناواقف انہیں صرف آرائشی بیل بوٹے سمجھتے تھے۔

اندلسی مسلمانوں نے عمارات میں (مساجد کے علاوہ) جانوروں کی تصویریں اور مجسموں سے بھی آرایش وزیبائش کا کام لیا ہے۔ (الزھرا کی کھدائی سے یہ چیزیں سامنے آئی ہے) مسلمانوں نے تعمیراتی مسالہ میں ایک نیا عنصر شامل کیا اور وہ سلفیٹ آف لائم (Slphate of Lime) ہے۔ اسکی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ پانی ملانے پر یہ آٹے کی طرح نرم ہو جاتا ہے۔ اور اس سے مختلف قسم کی شکلیں اور مجسمے تیار کیے جاتے ہیں۔ الحمرا اس قسم کے چونے سے تیار کیا گیا ہے۔ اور مرور زمانہ کے باوجود جوں کا توں کھڑا ہے۔ موسیو لیبان کا خیال ہے کہ "یورپ کا کوئی صناع اس قسم کی گچ کاری کا ذمہ نہیں لے سکتا۔ جو بعد زوال کے اتنی مدت تک اپنی اصل حالت پر قائم رہ سکیں"۔ (۲۸) واشنگٹن اروِنگ لکھتا ہے کہ "مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ عمارت گچ سے بنی ہے۔ الحمرا کی دیوار کا ایک ٹکڑا میں نے امریکہ بھیجا وہاں تجزیہ کرنے پر یہ حقیقت سامنے آئی کہ یہ واقعتاً چونے سے بنا ہے"۔ (۲۹)

آج اندلس کی زیادہ تر اسلامی عمارتوں کو ختم کر دیا گیا ہے۔ کچھ کے حصے باقی ہیں اور صرف چند عمارتیں ایسی ہیں۔ جن کے زیادہ تر اجزاء ابھی تک اسلامی عہد ہی کے ہیں۔ سرقسطہ کے سب سے بڑے گرجا گھر کی دیوار مسلمانوں کے عہد کی ہے۔ اس کے علاوہ ایک محل ہے جو "الہافریہ" کہلاتا ہے۔ جو الجعفریہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس میں بھی بہت کچھ تبدیل ہے۔ البتہ ایک اس میں ایسا کمرہ ہے جو شاید مسجد ہو یہ ۲۵ گز طول اور ۲۵ گز عرض کا ہے۔ اس کا گنبد ۴۵ گز بلند ہے۔ جو سنگ مرمر کے خوبصورت ستونوں پر قائم ہے کمرے میں محراب بھی ہے۔ اور خوبصورت نقاشی بھی کی گئی ہے اس کے ساتھ ۸۰ فٹ بلند مینار بھی ہے۔ "علاقہ شنترین میں ساؤ جاؤ کے گرجا گھر کا مینار بھی اسلامی عہد کا ہے۔ ۳۰۔

اب ہم ان عمارتوں کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں جو مسلمانوں کے فن تعمیر کی مظہر تھیں۔

مسجد قرطبہ (اس کا بیان علیحدہ باب میں ہے)

الزھرا۔ یہ ۹۳۶ء میں بننا شروع ہوا اور چالیس برس تک تعمیر ہوتا رہا یہ شہر سات فرلانگ لمبا اور پانچ فرلانگ چوڑا تھا۔ یہ خوبصورت حویلیوں، نفیس بارہ دریوں، بارونق بازاروں،

نہروں، خدام شاہی کی رہائش گاہوں اور سفیروں کی اقامت گاہوں پر مشتمل تھا۔ اس کی تعمیر میں حصہ لینے والے مزدوروں اور کاریگروں کے علاوہ عمارتوں میں استعمال ہونے والے پتھروں، اینٹوں اور ستونوں کی تعداد بھی کتابوں میں محفوظ ہے۔ قصر شاہی تمام کا تمام سنگ مرمر کا تھا۔ جس میں سونے چاندی اور لکڑی کا کام بھی جگہ جگہ کیا گیا تھا۔ اس محل میں پارے کا بھرا ہوا ایک تالاب بھی تھا۔ اسکے علاوہ مدینۃ الزہرا میں، ایک عجائب خانہ اور چڑیا گھر بھی الناصر نے بنایا تھا۔ جس میں دنیا بھر کے نوادرات اور چرند پرند جمع کیے ہوئے تھے۔ ۱۰۱۰ء میں بربروں نے اس شہر کو تباہ کر دیا۔ ابوالحزم جو دورِ آخر کی ایک اہم شخصیت ہیں مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات کے قریب سے گزرے تو اس نے ان سے پوچھا۔

قَلتُ یَومأَلِدارِ قَومٍ تَفَانُواْ   اَینَ سُکأنَکِ العِزَاُزِ عَلَینَا

(میں نے اس قوم کے مٹے ہوئے آثار سے دریافت کیا کہ جو لڑ جھگڑ کر برباد ہو گئی تھی کہ تمہارے آباد کار جو ہمیں دِل سے عزیز تھے کہاں گئے۔؟)

فَاَ جَابَت ھُنَا آقَامُوْ قَلِیلا   ثُمَ سَارُواوَلَستُ اَعلَمُ اَینَاَ

(اور کچھ دنوں یہاں ٹھہرے اور پھر چل دیئے۔ معلوم نہیں وہ کدھر کو سدھارے) (۳۱)

☆☆☆

الحمرا

الحمرا کی بنیاد ۱۲۴۸ء میں بنی نصر کے سلطان محمد الاول الغالب نے رکھی۔ لیکن اس کی تعمیر چودھویں صدی میں مکمل ہوئی۔ اس قصر میں مسلمانوں کی آرائشی طرز حدِ کمال کو پہنچ گئی تھی۔ غرناطہ کے اس قلعہ کو پچی کاری، قلمی تزئین، کاشی کاری اور کتبات کی بے حساب تزئین و آرائش کے ساتھ نہایت وسیع اور عظیم الشان پیانے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ الحمرا باہر سے دیکھنے میں برجیوں اور قلعہ بندیوں کا ایک بے نظم سا سلسلہ لگتا ہے۔ جس میں نہ جاذبیت ہے اور نہ تعمیر کی خوبصورتی۔ دور سے دیکھنے میں اس بات کا بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ اسکی اندرونی عمارتیں اور محلات اس قدر عالیشان اور خوبصورت ہوں گے۔ چنانچہ ارونگ قصص الحمرا میں لکھتا ہے۔ ''اچانک ایک پر کیف نظارہ ہمارے سامنے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے جادو کی چھڑی ہلا دی ہو۔ اور ہمیں آن کی آن میں ایسی دنیا میں پہنچا دیا ہو جہاں قدم قدم پر مشرقی عظمت اور اسلامی تزک و احتشام کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ یہ

مقام باہر سے جتنا غیر دلچسپ ہے۔ اندر سے اتنا ہی دِل آویز اور دلکش ہے۔ (۳۲)

قلعہ کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ اس کے اندر چالیس ہزار کا لشکر فروکش رہتا تھا۔ اس کے گردوپیش خوبصورت مناظر ہیں۔ سامنے سیرا نوادا کی برف پوش چوٹیاں اور نیچے وادی میں دریائے حدارہ بل کھاتا ہوا گزرتا ہے۔ دارالاختین اور بیت العدل اپنی تزئین و آرائش میں اس قدر خوبصورت ہیں کہ آنکھ مشاہدہ تو کر سکتی ہے۔ قلم بیان کرنے کی قوت نہیں رکھتا۔ یہ عمارت نہ تو سنگ مرمر کی ہے اور نہ ہی زبرجد کی بلکہ ایک خاص قسم کے چونے سے بنائی ہے۔

صلیب کے پجاریوں نے جس طرح دوسری عمارات کو تباہ کر دیا اس طرح اس عمارت کے ایک حصے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ چارلس پنجم نے اس کے مسالے سے دوسری عمارت بنانے کے لیے محل کا ایک بڑا حصہ گرا دیا۔ مسوسیو وادی لیٹرا اپنی کتاب اندلس میں لکھتا ہے ''وہ پرتکلف چینی کی تختیاں جو قصر الحمرا کے دالانوں میں نصب تھیں۔ چند سال قبل چونا بنانے کے لیے فروخت کر دی گئیں۔ مسجد کا کانسی کا دروازہ پرانے تانبے کے نام سے بکا۔ اور وہ بیش بہا لکڑی کے کندہ کیے ہوئے دروازے جو دار بنی سراج میں لگے ہوئے تھے ایندھن کے کام لائے گئے۔ یہ عمارت بطور قید خانہ استعمال کی گئی اور اس میں فوجی اسلحہ کا کارخانہ بھی بنایا گیا۔ (۳۴)

☆☆☆

علوم وفنون

اندلس میں مسلمانوں نے اشاعت تعلیم کی طرف خاص طور سے توجہ دی۔ قصبوں اور چھوٹے شہروں میں درسگاہیں اور بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں قائم کیں۔ قرطبہ، اشبیلیہ، سرقسط، مالقہ، سلمنکہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیاں زیادہ مشہور تھیں۔ شہر قرطبہ میں آٹھ سو مدارس تھے۔ سب سے بڑی یونیورسٹی جامع اعظم تھی۔ جس میں طب ادویہ سازی، نجوم، معیشت، فلسفہ، حساب، جغرافیہ، تاریخ، زراعت، اور صنعت و حرفت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دوسرے ممالک کے مشہور علماء کو بلایا جاتا تھا۔ اس دور کے اساتذہ نے طب، سائنس، تاریخ اور جغرافیہ میں بڑا نام پیدا کیا۔ بعض اساتذہ یہودی اور عیسائی بھی تھے۔ ان پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اساتذہ بھی بہت روشن خیال اور وسیع النظر تھے۔ قرطبہ یونیورسٹی میں طب کے شعبے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ طب، جراحت اور ادویہ سازی کے امتحانات سب سے مشکل تھے۔ نویں اور دسویں صدی

میں طلباء کی تعداد گیارہ ہزار تھی۔ ۳۵۔ ہر گاؤں جہاں مسجد تھی ابن العذاری، ابن حیان اور المقری کے مطابق مدرسہ ضرور تھا۔ اسکاٹ لکھتا ہے "کہ اندلس کو اس بات کا بھی فخر ہے کہ اس نے جو نظام تعلیم رائج کیا۔ وہی ان دنوں یورپ میں رائج ہے (۳۶) اندلس میں تعلیم مفت تھی۔ ہر طالب علم کو سرکاری طور پر کتابیں مفت دی جاتی تھیں۔ قرطبہ یونیورسٹی میں فرانس، جرمنی، اطالیہ، انگلستان تک کے عیسائی طالب علم حصول تعلیم کے لیے آتے تھے۔ عیسائیوں کے پوپ سلوستر (۹۰۵ء) نے اسی یونیورسٹی سے تعلیم پائی تھی کہتا ہے، "جب تمام یورپ جہالت کی تاریکی وظلمت میں پھنسا ہوا تھا۔ اس وقت عربوں کی آنکھیں انوار علم کی چمک سے کھل چکی تھیں۔ ممالک ہسپانیہ میں بڑے بڑے شاندار مدارس قائم تھے۔ ان سے بڑے باکمال اور ماہر مدرس پیدا ہوئے جن کی شاگردی کا فخر علمائے یورپ کو ہے۔" ۳۷ ہر کالج کے صدر دروازے پر یہ عبارت لکھی ہوتی تھی۔ "دنیا کا مدار چار باتوں پر ہے۔ عالموں کا علم، اکابر کا عدل، عابدین کا تقویٰ اور جوانمردوں کی شجاعت۔" گویا مسلمانوں نے علم کو پہلا درجہ دیا ہے۔ اور انصاف کو دوسرا۔ اندلس کی زیادہ تر آبادی تعلیم یافتہ تھی۔ اس بارے میں نکلسن لکھتا ہے۔ کہ آٹھویں صدی سے گیارہویں صدی تک پورے اسلامی اندلس کے باشندوں کو پڑھنا لکھنا آتا تھا۔ (۳۸) اور ڈوزی نے بھی یہی کہا ہے۔ "کہ اس وقت تقریباً ہر شخص پڑھا لکھا تھا۔ (۳۹) اندلس میں مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی جاتی تھی۔ ملک میں عورتوں کے متعدد مدارس تھے۔ اس وقت ملک میں کچھ ایسی عالم اور ادیب خواتین موجود تھیں جو ملک کے بہت سے علماء اور ادباء سے بلند درجہ رکھتی تھیں۔ ان میں شہزادہ احمد کی بیٹی عائشہ اور خاندان مواحدین کی شہزادی ولیدہ بھی تھی۔ یہ دونوں مجالس اور مذاکرات ادب میں شرکت کرتیں۔ اشبیلیہ کی عفیفہ اور صفیہ کو نظم کہنے میں کمال حاصل تھا۔ ام محمد قرطبہ کی محدثہ تھی۔ لبانہ علم ہندسہ میں ماہر تھی۔ المقری نے نفح الطیب میں "الادبیات من نساء الاندلس" اور لسان الدین ابن الخطیب نے الحاطہ فی الاخبار غرناطہ میں اندلس کی ان نامور خواتین کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو علم و ادب اور دوسرے فنون میں ماہر تھیں۔ اندلس میں جگہ جگہ کتب خانے کھلے تھے۔ الحکم ثانی کے کتب خانے میں چار لاکھ کتب تھیں۔ جبکہ سولہویں صدی میں اسپین کی ملکہ ازابیلا کے کتب خانے میں دو سو ایک کتابیں تھیں۔ اندلس میں ابوالقاسم، ابن القوطبہ اور ابن حزم نے سینکڑوں کتابیں تصنیف کیں۔ اندلس کے مرکزی شہروں میں علم سے لگاؤ کی بنا پر کتابیں عام زندگی کے لوازمات میں داخل ہو گئی تھیں۔ اہل علم اپنے کتب خانوں میں بہتر سے بہتر کتابیں جمع کرتے۔ قرطبہ کے شاہی

محل کے کتب خانے میں دس ہزار خطاط تھے۔ جو کتابیں نقل کر کے سارے اندلس میں بھیجتے رہتے تھے۔ جلدوں پر سونے چاندی سے نقش کشی کی جاتی۔ شاطبہ میں روئی سے اعلیٰ درجے کا کاغذ بنایا جاتا جو برآمد بھی کیا جاتا۔

☆☆☆

طب

اسلامی طب کے بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں کہ یورپ والوں نے مسلمانوں سے طب کے میدان میں جو اکتساب فیض کیا ہے۔ اس کا اظہار کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔ اب تک اسلامی طب کا بہت تھوڑا حصہ دنیا کے سامنے آیا ہے۔ بقول میکس میئر ہوف (Max Meyer Hof) کہ اسلامی سائنس وطب کے خزانے ابھی بالکل محفوظ ہیں۔ قسطنطنیہ، دمشق، بغداد، موصل، فارس، ہندوستان اور اسپین کے طبی سرمایوں کو ابھی ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا ہے۔

اندلس میں طب کی تین روائتوں یعنی یہودی، نصرانی اور اسلامی کو تراجم کی بدولت یکجا ہونے کا موقع ملا۔ ان روائتوں کے اختلاط اور امتزاج سے ایک نیا اور ترقی یافتہ علم طب وجود میں آیا۔ معاشرے میں طبیب کو اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ بعض شاہی درباروں سے وابستہ تھے۔ اور بعض اپنا مطب کرتے تھے۔ اندلس کے طبیبوں نے علم طب میں جو نئے انکشافات کیے ہیں ان میں کچھ یہ ہیں۔

۱۔ جراثیم کی دریافت طب جدید کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ابن خاتمہ نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ انسان کے ماحول میں بھی باریک باریک اجسام موجود ہیں۔ جو انسانی جسم میں پہنچ کر موجب امراض بنتے ہیں۔

۲۔ ابن نفیس نے دوران خون کا نظام دریافت کیا تھا۔

۳۔ چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں جب یورپ سیاہ موت (پلیگ) نامی مرض کی لپیٹ میں آچکا تھا عیسائی اسے عذاب الٰہی سمجھتے تھے۔ اس وقت غرناطہ کے مشہور وزیر ابن خطیب نے جو شاہی طبیب بھی تھا۔ متعدی امراض کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی۔ اور اپنے تجربات کو سائنسی طریقے سے پیش کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے، "کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم چھوت چھات کا امکان کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ جب مذہبی قانون اس کے وجود سے انکار کرتا ہے۔ ہم جواب

دیتے ہیں کہ چھوت کا وجود تجربہ تحقیق اور حسیات کی شہادت اور موثق ذرائع سے ثابت کر سکتے ہیں۔ چھوت کی حقیقت اس شخص پر واضح ہو جاتی ہے جو بیمار کے ساتھ رابطہ قائم کر کے خود بیمار ہو جاتا ہے۔ لیکن جو شخص بیمار سے نہیں ملتا درست رہتا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ کپڑوں، برتنوں اور کانوں کے زیورات سے چھوت کا مرض کس طرح پھیلتا ہے۔ (۴۰)

۴۔ اشبیلیہ کے طبیب ابن زہر نے ''علاج بالحفظ'' کا نظریہ پیش کیا۔ اس نے ثابت کیا کہ طبیعت جو جسم پر حکمران ہے بطور خود بغیر دوائی کے امراض کو دفع کر سکتی ہے۔ اس نے علم الامراض، علم تشریح الابدان اور علم الادویہ کو الگ الگ کر دیا۔ موسیو لیبیان کہتا ہے۔ ''علاج امراض میں عرب اطباء کو اصول حفظ صحت پر بڑا بھروسہ تھا اور وہ طبیعت (قوت مدبرہ بدن) سے بہت کام لیتے تھے۔ علاج بالحفظ انہی اصولوں پر مبنی ہے۔ جن کی مدد سے دسویں صدی عیسوی میں عرب اطباء ہم سے زیادہ مریضوں کی جانیں بچا لیتے تھے۔ (۴۱)

لی بان کے نزدیک ابوالقاسم الزھراوی سب سے بڑا عرب جراح تھا۔ اس نے بہت سے آلات جراحی ایجاد کیے۔ اس نے اس سلسلے میں ایک کتاب باتصویر لکھی جو دنیا میں اس موضوع پر پہلی تصنیف ہے۔ عربوں نے ہی مثانے کے اندر پتھری توڑنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ اس کا بیان زاھراوی کی کتاب میں باتصویر موجود ہے۔ (اس کتاب کا ایک نسخہ پٹنہ کی اورینٹل لائبریری میں موجود ہے) جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ یورپ کی طب کا انحصار چودھویں صدی کے بعد اسی کی تصانیف پر تھا۔ (۴۲) اس کتاب کا آخری حصہ ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا ابوالقاسم کے بارے میں پروفیسر براؤن لکھتے ہیں۔

In the Tenth Century Cordova prodiced the greatest surgen of the Arab Race Abu'l Qasim uz Zahrawi knwon in the medieval Europe as Abulcasis or Abulcasis." 43

ابن البیطار بھی ایک بہت بڑا ماہر نباتات تھا۔ جس نے جڑی بوٹیوں کی تلاش میں یونان، ایشیائے کوچک اور مصر کا سفر کیا تھا۔ (۴۴)

مسلمانوں نے طب اور سائنس میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں اس کے بارے میں فلپ کے ہٹی لکھتا ہے۔

"Muslim Spain wrote one of the brightest chapters in

the intellectual history of Europe"

ابن واقد کا مرتبہ بھی اطبائے اندلس میں بہت بلند ہے۔ یہ علاج بالغذا کا قائل تھا۔ ۴۶

☆☆☆

علم ہئیت

اندلس میں مسلمان سائنسدانوں نے علم ہئیت میں اعلیٰ درجے کے تحقیقی کارنامے سرانجام دیئے۔ انہوں نے ستاروں کی رفتار حرکت کے جدول مقرر کیے۔ دائرۃ البروج کا تدریجی انحراف اور آفتاب کے مدار کا بعد معلوم کیا۔

مدار نجوم کا بیضوی راستہ تجویز کرنے والے یہ ہی لوگ تھے۔ زرقلی نے آفتاب کے بعد افقی کی حرکت معلوم کرنے کے لیے چار سو دو (۴۰۲) مشاہدے کئے۔ اس کی رصدگاہ عظیم الشان تھی۔ مسلمان ہئیت دانوں نے کرّے بنائے۔ اسطرلاب ایجاد کیے۔ اور ان کے استعمال کے لیے کتابیں لکھیں۔ ملک میں جگہ جگہ رصدگاہیں تھیں۔ اسکاٹ دسویں صدی کے اندلس کا حال ایک سیاح کی زبانی لکھتا ہے۔

''تہذیب وتمدن کی دوسری علامات کے علاوہ قرطبہ کے در و دیوار پر رنگین نقشے، گھومنے والے کرّے، دھوپ گھڑیاں، پن گھڑیاں، آب پیما آلات، منظر کواکب، تربیعات و اسطرلاب جا بجا نظر آتے تھے۔ (۴۷)

ہئیت دانوں میں سب سے پہلا نام ابوالقاسم المجر بطی ہے۔ جس نے خوارزمی کی زیج میں ترمیم کی۔ اور بعد میں یہی کام زرقلی اور ابن افلح نے انجام دیا۔ بطلیموسی نظام کی سب سے پہلے جس عالم نے مدلل تردید کی اور بتایا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے وہ اندلس کا البطروجی صاحب کتاب المصیاۃ ہے۔ البطروجی کوپرنیکس سے دو سو سال پہلے کا محقق ہے۔ آرنلڈ کہتا ہے ''کہ کوپرنیکس کا جدید نظام ہئیت علمائے اندلس خصوصاً بطروجی کا مرہون منت ہے۔ (۴۸) اہل اندلس زمین کے گول ہونے سے بھی واقف تھے۔ ابن خراد بہ التوفی ۳۰۰ھ کے مطابق زمین کی شکل گول ہے۔ جیسے گیند جو فضائے آسمانی میں اس طرح رکھا ہو جیسے انڈے کے اندر زردی اور ہلکی ہوا زمین کے چاروں طرف ہے۔ (۴۹)

☆☆☆

جغرافیہ وتاریخ

مسلمان زائرین اور سیاح دور دراز کے ممالک کا سفر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے سیاحت ناموں اور سفر ناموں میں مختلف ممالک کے جغرافیائی اور معاشرتی حالات بڑی صحت وصراحت سے بیان کیے ہیں۔ اندلس کے جن سیاحوں اور جغرافیہ دانوں نے اپنے مشاہدات سفرناموں کی صورت میں مرتب کیے۔ ان میں الادریسی، ابن جبیر، انجم، الزھری، اور البکری خاص طور سے مشہور ہیں۔ الزھری نے کتاب الجغرافیہ لکھی۔ ابن جبیر نے رحلۃ ابن جبیر میں بحرِ روم کے خطہ میں بسنے والی مسلمان قوموں کے تمدنی، تجارتی، اور جغرافیائی حالات پر بحث کی ہے۔ یہ کتاب ایک اہم تاریخی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سب سے مشہور جغرافیہ دان الادریسی ہے۔ اس نے قرطبہ یونیورسٹی سے تعلیم پائی۔ اور صقلیہ کے بادشاہ راجر ثانی کے لیے دنیا کا نقشہ ایک چاندی کے کرے پر بنایا۔ علم جغرافیہ "نزھتہ المشتاق فی اختراق الافاق" ہے۔ جس میں انچاس نقشے بھی ہیں۔ الادریسی نے دریائے نیل کا منبع دریافت کر لیا تھا۔ لیکن مغربی محققین پچھلی صدی تک اس کی تلاش میں سرگرداں رہے۔

اس کے علاوہ بعض تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اندلسی مسلمانوں نے امریکہ کے سفر بھی کئے تھے۔ قدیم حکماء کا خیال تھا کہ خط استواء کے دوسری طرف کوئی آبادی نہیں ہے۔ ابن رشد اس بارے میں کہتا ہے کہ خط استوا معتدل ہے۔ اس کے جنوب میں جو زمین ہے وہ ویسی ہے جیسی اس کے شمال میں ہے۔ تو جس طرح خط استوا کے شمال میں آبادی ہے۔ جنوب میں بھی ہوگی۔ ابن خلدون بھی اس کی حمایت کرتا ہے۔ ابن بطوطہ نے اندلس کی بھی سیاحت کی ہے۔ وہ شمالی روس میں بھی وہاں تک پہنچ گیا تھا جہاں رات خصوصاً چار گھنٹے کی ہوتی ہے۔ (۲) ابن بطوطہ آگے ارض ظلمت کا ذکر کرتا ہے۔ جہاں کتوں کے ذریعے چالیس شب وروز میں پہنچا جا سکتا ہے۔ بہرحال مسلمان سیاح آبنائے بیرنگ کے کنارے آکر ٹھہر گئے جہاں سے کنیڈا کا فاصلہ تھوڑا ہی ہے۔ (۵۱) لیبان کے بیان کے مطابق مسلمانوں کے علم وتجربے نے یورپ کو بے انتہا فائدہ پہنچایا۔ اس لیے یورپ کو چاہیے کہ جغرافیائی معلومات، انکشافات اور عالمگیر تجارت کے دوائر میں مسلمانوں کو اپنے ثقافتی اسلاف کی حیثیت سے محترم جانے۔ (۵۲)

تاریخ مسلمانوں کی تحقیق وتصنیف کا موضوع رہی ہے۔ اندلس مین بہت سے مورخ

پیدا ہوئے جن میں ابن لقوطیہ ابن حیان، ابن بشکوال، ابن الخطیب، ابن خلدون اور المقری بہت مشہور ہیں۔ ابن الخطیب نے ساٹھ کتابیں مختلف علوم وفنون پر لکھیں۔ اس کی مشہور کتاب "الاحاطہ فی الاخبار غرناطہ" ہے۔ اندلس اور مسلم دنیا کا سب سے بڑا مورخ ابن خلدون ہے۔ ابن خلدون نے فن تاریخ نگاری کے اصول وضع کیے۔ اس نے سیاسی اور تہذیبی عروج وزوال، معاشی واقتصادی حالات کو تاریخ کا لازمی جزو قرار دیا ہے۔ ابن خلدون نے اپنی تصانیف میں مندرجہ ذیل موضوعات پر مدلل بحث کی ہے۔

(۱) تمدن کی ضرورت۔
(۲) انسانوں کی مجموعی زندگی پر کون سے مظاہر اثر انداز ہوتے ہیں۔
(۳) بدویانہ زندگی کا آغاز اور مختلف ادوار اجتماعی ترقی تک۔
(۴) مختلف قسم کی حکومت اور اس کے قوانین۔
(۵) تمدن کا زوال اور اس کے اسباب۔

ابن خلدون نے پہلی بار تاریخ کے ارتقاء کا نظریہ پیش کیا۔ فلپ کے حتی اسے اسلام کا عظیم ترین اور دنیا کا ایک زبردست مفکر تاریخ کہتا ہے۔

☆☆☆

شعروادب

شعروادب نے اندلس میں بہت ترقی کی۔ اس کی ایک وجہ تو شعر سے عربوں کا طبعی لگاؤ اور دوسری وجہ یہاں کا دلکش ماحول تھا۔ چنانچہ کئی بادشاہ اور شہزادے بھی شاعر تھے۔ ہر دربار میں ملک الشعراء ہوتا تھا۔ رزم وبزم میں شاعر ساتھ رہتے تھے۔ شنت یاقب کی مہم میں منصور کے ساتھ ساٹھ شعراء بھی تھے۔ جب ملک میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہوگئیں تو ہر دربار شعروادب کا مرکز بن گیا۔ اسمیں اشبیلیہ نے بہت عروج حاصل کیا۔ یہاں کا بادشاہ معتمد جس کا باپ اور دادا بھی شاعر تھے۔ ایک بہت بڑا شاعر اور ادب نواز حکمران تھا۔ اسکی نظموں کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کے وزیر ابن عمار اور ابن زیدون بھی بڑے شاعر تھے۔ شعروادب کے میدان میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں نے بھی شہرت حاصل کی تھی۔ جن میں رمیکیہ تو فی البدیہہ شاعری میں جواب نہیں رکھتی تھی۔ ذوق شعر وسخن صرف اعلیٰ خاندانوں تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ عام

گھرانوں کی خواتین بھی تعلیم یافتہ اور خوش مذاق ہوتی تھیں۔ غرناطہ کے ایک جلد ساز کی دو بیٹیاں (حمدہ اور زینب) بہت بڑی عالمہ اور شاعرہ تھیں۔

ابن حزم ایک مشہور عالم، تقابل ادیان کا بانی اور شاعر تھا۔ اس کی داستان عشق ایک بلند پایہ نظم ہے۔ ابن الخطیب نے مورخ، عالم اور شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ اندلسی شاعروں میں قوتِ محاکات، تخیل اور مزاح وفکاہات کی بڑی فراوانی اور افراط ہے۔ تاریخی نظموں اور قصیدوں میں وہ شعرائے مشرق سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ اس ملک میں موسیقی کے آلات کی کثرت تھی یہاں کا حسن و جمال اور قدرتی مناظر دعوتِ نظارہ دیتے تھے۔ اس لیے عربوں نے اندلس میں ادب عالیہ کے بیش بہا شاہکار تخلیق کیے ہیں۔

☆☆☆

صنعت وحرفت

مغربی مورخین شاہد ہیں کہ اندلس کے عربوں نے صنعت وحرفت میں بہت ترقی کی تھی۔ ملک میں بے شمار صنعتوں کی بدولت عام لوگوں کا معیار زندگی بلند تھا۔ نیز تجارت اور درآمد برآمد کے کاروبار کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔

اندلس کے تمام بڑے شہروں میں ریشمی کپڑا بنا جاتا تھا۔ اس صنعت کے لیے جیان المریہ، غرناطہ اور مرسیہ خاص طور سے مشہور تھے۔ جیان کو جیان الحریر کہتے تھے۔ اس کپڑے کے متعلق ابن حوقل کہتا ہے۔ ''میں نے اقصائے عالم میں اس کپڑے کی مانند کوئی کپڑا نہیں دیکھا اور نہ ہی ایسے کاریگر روئے زمین پر دیکھنے میں آتے ہیں۔''

ان پارچہ جات کی یورپ میں بڑی مانگ تھی۔ کنٹربری میں بہت سے ریشمی خریطے موجود ہیں۔ ان کی کشیدہ کاری کے نقوش کی نزاکت اور صنعائی کی نفاست بے نظیر ہے۔ اندلس میں اس ریشم کا نام عقابی تھا۔ (عقاب) جو پورے یورپ میں "Tabis" کے نام سے مشہور تھا۔ ۱۳/اکتوبر ۱۶۶۱ء کو مسٹر پیپس مشہور ''انگریز مصنف'' کے بیان کے مطابق ''جعلی ٹیبی کی صدری پہنی جس پر طلائی گوٹا لگا ہوا تھا''۔ (۵۳) ''مِس برنی وِندسر ۱۷۸۶ء میں شاہی سالگرہ میں Lilac Tabby کا گاؤن پہن کر شریک ہوئی۔'' (۵۴)

اندلس میں ظروف کی صنعت بھی بہت ترقی یافتہ تھی۔ اٹلی والوں نے بلنسیہ سے چمکدار

روغن والے برتن بنانے کا فن لیا۔ اِس زمانے کے جو ظروف ملے ہیں ان میں بعض پر عربی العافیہ (صحت و تندرستی) ہسپانوی A Ofia (برکت و خوشی) کا لفظ نقش ہے۔ یہ ظروف پوپوں، کارڈینلوں اور اندلس، پرتگال، برطانیہ، فرانس کے امیر ترین خاندانوں کے لیے بنائے جاتے تھے۔ جو برتن بنانے والوں کو اپنے امتیازی نشان بھیج دیتے تھے تاکہ جو برتن ان کے لیے بنائے جائیں ان پر وہ نقش کئے جائیں۔ (۵۵)

اسی لیے کارڈنیل (زیمی نیز) نے ان مسلمان کاریگروں کے متعلق کہا تھا کہ یہ ہمارے دین سے بے بہرہ ہیں اور ہم ان کے کمالِ فن سے'' اندلس کے مسلمانوں سے ہی اٹلی والوں نے اینٹ سازی کا فن لیا جو آج بھی میورقہ سے نسبت کی بنا پر مجالکا کے نام سے مشہور ہے۔

اندلس میں سوتی کپڑے کی صنعت بھی عام تھی۔ قالین اور چٹائیاں بھی بُنی جاتی تھیں۔ ہاتھی دانت اور چوبی پچی کاری کی صنعت بھی اعلیٰ معیار کی تھی۔ مسجدوں کے منبر اور دروازے ابھی تک اِس صنعت کی گواہی دے رہے ہیں۔ شیشے، چینی، تیل اور فولاد سے بھی بہت سی اشیاء بنا کر دوسرے ممالک میں بھیجی جاتی تھیں۔ بہت سی جگہوں پر کاغذ سازی کے کارخانے تھے۔ اور شاطبہ خاص طور پر اس کا مرکز تھا۔

☆☆☆

آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر تیرھویں صدی تک مسلمان ہی ساری دنیا میں تہذیب و تمدن کے مشعل بردار تھے۔ اس وقت ساری اسلامی دنیا ایک عقلی و ذہنی اخوت کے بندھن میں بندھی ہوئی تھی۔ اور اس دوران عربی زبان ہی وہ واسطہ تھی جس کے ذریعے قدیم سائنس اور فلسفے کی بازیافت ہوئی۔ ان میں قابلِ قدر اضافہ ہونے کے ساتھ اس کی اشاعت بھی ہوئی۔ یہی چیز یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی اساس بنی۔ اس وقت اسلامی کمالات اور عجائبات سے یورپ کی نظریں خیرہ ہو چکی تھیں۔ اس لیے الفانسو (دانشمند) نے یورپ میں ہی عربی یونیورسٹی اس غرض سے قائم کی تاکہ مسلمانوں کے علوم کی تدریس ہو سکے۔ اس کے لیے اس نے ایک عالم و فاضل ابو بکر الرقوطی کی خدمات حاصل کیں۔

یورپ میں مسلم اندلس کے ذریعے تہذیب و ثقافت پر جو اثرات پڑے اس کے نقوش آج بھی نمایاں ہیں۔ مثلاً ادب کو لیجئے۔ تیرھویں صدی تک یورپ میں جو قصے کہانیاں اور اخلاقی تمثیلیں رائج رہی ہیں۔ ان میں اور ابتدائی عربی قصوں میں بڑی واضح مشابہت پائی جاتی ہے۔

کلیلہ و دمنہ کے پر لطف قصوں کا ترجمہ قشتالیہ اور لیون کے بادشاہ الفانسو (دانشمند) (۱۲۵۲ء سے ۱۲۸۲ء) کے لیے اسپینی زبان میں کیا گیا تھا۔ اس کا دربار تہذیبِ اسلامی کا نمائندہ تھا۔ اور وہ خود اپنے آپ کو دو مذہبوں کا بادشاہ کہتا تھا۔ اسپینی زبان میں اکثر ناول عربی قصوں سے ماخوذ ہیں۔ یورپی ادب پر عربی زبان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس کے طرزِ انشاء کے اثر سے مغربی تخیل کو فنی روایات کی سخت ترین بندشوں سے رہائی نصیب ہوئی۔ اسپینی زبان کے اعلیٰ مزاج میں عربی نمونوں کی صاف جھلک نظر آتی ہے۔ بذلہ سنجی میں بھی یہی رنگ دکھائی دیتا ہے۔ (چنانچہ سروانٹس کی کتاب ڈان کویکزوٹ کی ظرافت اور بذلہ سنجی میں بھی یہی رنگ دکھائی دیتا ہے۔ جے بی ٹرینڈ کی تحقیق کے مطابق ۱۶۱۴ء کے بعد بہت سے مسلمان خفیہ طور پر اسپین میں موجود رہے۔ (۵۷) اور سروانٹس کی زندگی تک عربی زبان اسپین میں بولی جاتی تھی۔ جب اس نے یہ اعلان کیا کہ (Don Quixot) کا متن ایک مسلمان سیدی حامد بن انجلی کا لکھا ہوا تھا۔ اور یہ کتاب عربی میں لکھی گئی تھی۔ تو اس کے ہم عصر لوگوں کو کوئی تعجب نہ ہوا۔ (۵۸)

عربوں کی ثقافتی زندگی میں شاعروں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے جہاں کہیں بھی دنیا میں عربی تہذیب و ثقافت کا اثر پڑا وہاں شاعری کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ اسپین میں بالعموم عربی شاعری کا رواج تھا۔ عربی شاعری کی صنف خصوصاً غزل اسپینیوں کو خصوصاً بہت پسند تھی۔ عربی تغزلی شاعری کی دو طرزوں کو قشتالیہ کی مقبول عام طرز ویلیی سیکا کی صورت میں فروغ حاصل ہوا۔ اس کے متعلق جے۔ بی۔ ٹرینڈ لکھتا ہے۔

''جنوبی فرانس میں گیارھویں صدی کے آخر میں دفعتاً ایک نئی قسم کی شاعری معرضِ وجود میں آئی۔ جس کا موضوع، معاشرتی، نفسیات اور اس کی ہیئت بالکل نئی تھی۔ اور یہ نئی شاعری عربی ہسپانیہ کے معاصر شاعری کے ایک خاص نمونے سے گہری مماثلت رکھتی تھی۔ (۵۹)

وہ بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے۔

''رومانی شاعری کی بعض اصطلاحات بھی عربی سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً Tension حقیقت میں تنازع ہے اور پروفیسر زبیرا کے نزدیک "Trober" اور "Troubadiour" بھی عربی لفظ طرب (گانا) سے بنے ہیں۔ (۶۰)

گزشتہ صفحات میں علوم و فنون کی اشاعت کا ذکر آ چکا ہے۔ قرطبہ، اشبیلیہ، مالقہ اور غرناطہ میں بہت بڑی یونیورسٹیاں تھیں۔ جن سے تمام یورپ میں علوم و فنون کے چشمے جاری

ہوئے۔ اور ان جامعات کے سبب ہی علمی اور ادبی ترقی ہوئی۔ جن سے یورپ نشاۃِ ثانیہ کی طرف بڑھا۔ قرطبہ کی یونیورسٹی میں عالم جربرٹ (آف اورن) نے تعلیم حاصل کی۔ جو ۹۹۹ء میں سلوسٹر ثانی کے نام سے پوپ بن گیا تھا۔ اس کو فلکیاتی علوم میں اتنا کمال حاصل تھا کہ عیسائیوں نے کہا کہ اس کا رابطہ شیطان سے ہے۔ اس نے یورپ میں ریاضی کے علوم کو زندہ کیا۔ اس کے پاس ایک اسطرلاب بھی تھا۔ اس کے علاوہ انگلستان اور سکاٹ لینڈ کے طلبہ بھی یہاں کسبِ علم کے لیے آتے تھے۔ ان میں رابرٹ (انگریز)، رابرٹس اینگلی کس (قرآن مجید کا پہلا مترجم) مائیکل اسکاٹ، ڈھنیل مورلے اور ایڈیلارڈ آف باتھ بھی تھے۔ ۱۲۵۱ء میں کلیلہ و دمنہ اور ۱۲۵۳ء میں سندباد کا ترجمہ ہوا۔ الفانسو (دانشمند) کے لیے ایک تاریخ لکھی گئی جس میں حضرت محمد ﷺ کی کی حیات مبارکہ بیان کی گئی ہے۔ حضرت یوسف کا قصہ ۱۲۹۹ء اور ۱۳۳۵ء کے درمیان عربی رسم الخط میں ہسپانوی زبان میں لکھا گیا۔ ۶۱

بہت سی دستاویز اراگون میں ایک مکان کے فرش سے برآمد ہوئیں۔ جس میں ہسپانوی زبان عربی حروف میں لکھی گئی تھی ان میں رسول خدا ﷺ کی مدح میں اشعار بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں قصص اور کہانیاں بھی ہیں۔ ان میں ایک نہایت اہم فتویٰ بھی ہے۔ جس میں اوران کے قاضی نے فتویٰ دیا ہے۔ کہ غرناطہ پر عیسائیوں کے قبضے کے بعد مظلوم مسلمانوں کو کس حد تک فاتحین کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ کیونکہ عیسائی فاتحین نے غسل کو بھی بند کر دیا تھا۔ اور اس کی سزا موت تھی۔ بعد میں بھی مسلمان عربی رسم الخط استعمال کرتے رہے۔ (۶۲)

اسپین کے اکثر افسانے اور کہانیاں جو تیرھویں صدی تک لکھے گئے۔ ان میں عربی اور اسپینی ثقافت نمایاں ہے۔ رابنسن کروسو کا ماخذ ابنِ طفیل کی فلسفیانہ داستان ''حیی ابنِ یقظان'' ہے۔ جس کا لاطینی ترجمہ ۱۶۷۱ء میں اور انگریزی ترجمہ ۱۷۰۸ء میں ہوا۔ (۶۳)

عربوں نے فلسفہ ارسطو سے یورپ کو آشنا کیا۔ ڈاکٹر میکس مرہاف کے بیان کے مطابق ابھی تک اسکورہال کے کتب خانے کی فہرست نامکمل ہے۔ (۶۴) اطالیہ کے دارالعلوم میں عربی تصانیف کی بھی اہمیت تھی۔ اس لیے پٹرارک انتہائی شکایت آمیز لہجہ میں عربی فلسفہ و حکمت کے بارے میں کہتا ہے۔

''دیماس تھینز کے بعد سسرو فصیح نکلا۔ ہومر کے بعد ورجل ہوا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ عربوں کا کوئی مقابلہ تحریر میں نہیں کرسکتا۔ ہم اکثر یونانیوں کے برابر ہیں۔ اور بعض چیزوں میں ان

سے بڑھ گئے ہیں۔ یعنی ہم تمام اقوام عالم پر فوقیت لے گئے ہیں۔ لیکن تم کہتے ہو بااستثنائے عرب، وائے ہماری حماقت، وائے ہمارا جنون۔ او! فطرتِ اطالیہ کیا تو سوگئی ہے۔ کیا تو مرگئی ہے۔"(۶۵)

تعلیم کی نشرواشاعت میں عربوں کی کاغذ سازی کی صنعت نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ یورپ میں کاغذ کے اولین کارخانے اندلس اور سسلی میں بھی تھے۔ شاطبہ کا بنا ہوا ایک کاغذ بارسیلونا کے شاہی دفتر میں موجود ہے۔ جو الفانسو دوم اور اگان اور الفانسو چہارم (قشتالیہ) کے درمیان معاہدہ (۱۱۷۰ء) لکھا ہوا ہے۔

یورپ میں جلد سازی میں جو سنہری تزئین وآرائش اندلس سے ہی شروع ہوئی۔ مغربی جلد سازی جو سنہری تزئین وآرائش اور حروف نویسی جو آج عالمگیر ہو چکی ہے۔ انہی ذرائع پر مبنی ہے۔ جنکو مسلمان کاریگروں نے تکمیل تک پہنچایا ہے۔(۶۶) تجربات ومشاہدات کی روح جو علوم اور سائنس کی بنیاد ہے۔ یورپ نے مسلمانوں ہی سے سیکھی۔

عربوں کی جغرافیائی تحقیقات کا بھی یورپ پر اثر پڑا۔ عربوں ہی کی بدولت زمین گول ہونے کا نظریہ مغرب کو ملا۔ جے۔ ایچ۔ کریمز نے "جغرافیہ اور تجارت" کے عنوان سے میراث اسلام میں لکھا ہے۔

"مسیحی مصنفین نے مسلمانوں کے جغرافیائی تصورات کو تسلیم کیا۔ جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ مارینوسنوتو نے نے ۱۳۲۱ء میں ایک کتاب "Opusterrule samotate" کے نام سے لکھ کر پوپ کے نام سے معنون کی۔ جس میں نقشہ عالم موجود ہے۔ یہ نقشہ گول ہے۔ اور اس کا مرکز یوروشلم ہے۔"۶۷

معیشت میں بھی عربوں کے کارنامے لازوال ہیں۔ انہوں نے ملک میں جگہ جگہ رصدگاہیں بنا رکھی تھیں۔ عربی تصانیف کے ترجمے یورپی زبانوں میں ہوئے۔ مثلاً البتانی کی "زیچ" تصنیف ۹۰۰ء کا افلاطون ٹیورلی نے ۱۱۵۰ء میں ترجمہ کیا۔ یورپی زبانوں میں ستاروں کے نام بھی عربی الاصل ہیں۔ جیسے (Acrab) عقرب (Algadi) الجدی (Altair) الطائر، (Danab) دنب (Pherhed) فرقد وغیرہ۔ اس کے علاوہ بے شمار نئی اصطلاحات بھی ایسی ملیں گی۔ جو عربی الفاظ سے لی گئی ہیں۔ جیسے Azimouth السموات (Nadir) النظر (Zemit) السمت وغیرہ۔

بحری قیادت ایک لمبے عرصے تک مسلمانوں کے پاس رہی تھی۔ نویں صدی میں تو مسلمانوں کی جہاز رانی ایشیائی وسعت اختیار کر چکی تھی۔ یورپ والوں نے قطب نما عرب والوں سے ہی لیا۔ نئی دنیا اور ہندوستان کا راستہ عرب ملاحوں کے ذریعے دریافت ہوا۔ زمانہ حاضر کے بین الاقوامی بحری الفاظ میں ایسے بہت سے الفاظ ہیں جن کی اصل عربی ہے۔ مثلاً Admiral Bargus, Shallop, Avrage, Cable اور بحرہ ہند کی زبان میں Moosoon وغیرہ۔

کئی تجارتی اور صنعتی اشیاء کے نام بھی عربی ہیں۔ مثلاً "چیک" عربی جیک سے Magasin عربی مخازن سے اور Dewane دیوان سے صنعتی اشیاء میں پائے جانے والے نام مسلن (موصل سے) دماسک (دمشق سے) اخذ کئے گئے ہیں۔ آج بھی انہیں ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ دوسری بافتہ اشیاء میں Cotten اور ساٹن وغیرہ، پھلوں میں نارنگی، لیمون، ناشپاتی، سبزیوں میں پالک وغیرہ، زعفران اور انیلائن بھی عربی سے ہی ماخوذ ہیں۔

مسلمانوں کے ذریعے یورپ صفر سے متعارف ہوا۔ جس سے جدید حساب میں بڑی مدد ملی۔ آجکل حساب کی ترقی دراصل عربی اعداد اور صفر کی بدولت ہی ہے۔ اور اس طرح الجبرا، صفر، اور انگورثم کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ علم حساب کے شمار اور تاسیس واشاعت میں عربوں کا مقام کس قدر بلند ہے۔

یورپ نے عربوں ہی کی آرائش اور تعمیری فطانت سے فائدہ اٹھایا۔ مسلمانوں نے عمارتوں پر کوفی حروف میں نقش ونگار کو ایک اہم فن بنا دیا تھا۔ عیسائیوں نے اس فن کی جاذبیت اور خوبصورتی کی بناء پر اسے قبول کر لیا۔ یہ فن فرانس میں اس وقت رواج پا گیا تھا۔ جب اس کے جنوبی صوبوں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ مثلاً لاپوے کے گرجا کے ایک حصہ میں لکڑی کے کندہ دروازے اور لاوودت چاہاک کے گرجا میں ایک دروازے پر عربی نقش ونگار ہیں۔ بلکہ ان میں کلمہ طیبہ بھی ہے۔ ملکہ الزبتھ کے زمانہ تک انگلستان میں ابودان نقوش کو "عریبک" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ بلکہ عربی حروف کا استعمال مصوری میں بھی ہوا ہے۔ ارنیا پیڈو کے گرجا گھر میں مریم عذرا کی آستینوں اور اس کی عبا کے حاشیوں پر بھی عربی حروف کا استعمال ہوا ہے۔ برٹش میوزیم میں نویں صدی کی ایک آرائش برنجی صلیب ہے۔ جس کے مرکز میں شیشے کے مصالے سے خطِ کوفی میں بسم اللہ لکھا ہوا ہے۔ بعض عیسائی بادشاہوں کے سکوں پر کلمہ طیبہ بھی نقش ہے۔ (ظاہر ہے ان کو ان آرائشوں کی اصل اور ان کے معنی کا کوئی علم نہ تھا۔)

اندلسی مسلمانوں نے نباتات کی تحقیقات میں خاصا کام کیا۔ انہوں نے پودوں کے گروہ بنائے۔ اور زراعت پر کتابیں لکھیں۔ جن سے یورپ نے استفادہ کیا۔ مسلمانوں کی طب نے بھی یورپ میں اپنے قدم جمائے۔ اہل یورپ نے طب مسلم کے آگے نہایت عاجزی سے سر جھکا دیئے۔ انہوں نے طب کی اکثر کتابوں کے ترجمے اپنی اپنی زبانوں میں کئے۔ عربوں کا فن دواسازی انیسویں صدی کے آغاز تک یورپ میں رواج پذیر رہا۔ ابن البیطار کی کتاب المفردات کے لاطینی ترجمے کے اجزاء ۱۷۵۸ء میں بھی کریمونا کے مقام پر چھاپے گئے۔ بہت سے کیمیائی مرکبات اور ادویات کے ناموں میں عربی اثرات اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

یورپ پر مسلمانوں کا ایک احسان یہ بھی ہے۔ کہ انہوں نے یونانیوں کے فلسفہ وحکمت کے خزانوں کی حفاظت کی۔ یونانی فلسفہ کا ترجمہ عربی میں کیا۔ اور پھر یورپ والوں نے عربی کی وساطت سے یونانی فلسفہ کو اپنی زبانوں میں منتقل کیا۔ یورپ میں اندلسی حکمائے فلسفہ نے ہی صحیح ذوقِ فلسفہ عام کیا۔ اہل مغرب سب سے زیادہ ابنِ رشد سے متاثر ہوئے۔ اس کی تصانیف عربی سے ترجمہ ہو کر یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔ بیکن کے الفاظ میں ابھی وقت نہیں آیا کہ مسلمانوں کے فلسفہ کی تاریخ مرتب کی جاسکے۔ کیونکہ ابھی تک بہت سا مواد یورپ اور مسلمانوں کے کتب خانوں میں مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہے۔ جب تک اہل علم ان پر مقالات نہ لکھیں۔ وہ خلا پر نہیں ہوسکتا۔

غرضیکہ اندلس میں مسلمانوں نے ایک عظیم الشان تہذیب اور ایک منظم اقتصادی زندگی کی تخلیق کی تھی۔ مسلم اندلس نے یورپی فنون لطیفہ، سائنس، فلسفہ، طب کی نشوونما میں قابلِ قدر حصہ لیا۔ اور جے بی ٹرینڈ کے الفاظ میں،

"اس زمانے میں ہسپانیہ یورپ کے لیے ایک "مشعل" کا حکم رکھتا تھا۔" (۶۸)

☆☆☆

اندلس میں عربوں کے نسلی ولسانی اثرات

۱۴۹۲ء میں غرناطہ پر قبضے کے بعد عیسائیوں نے انتہائی ظالمانہ طریقے سے مسلمانوں کی نسل کو اندلس میں ختم کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی یہ بھی کوشش تھی کی مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور اسلامی میراث کے تمام اثرات سرزمین اندلس سے مٹا دیئے جائیں۔ اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ البتہ وہ مسلمان جو عیسائی ہو گئے تھے۔ ان کی نسل باقی رہی۔ ان کی ایک کثیر تعداد آج بھی اندلس میں موجود ہے۔ خصوصاً جنوبی اندلس میں تو عرب نسل کے بے شمار افراد موجود ہیں۔ آج سے کچھ عرصے پہلے اگرچہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی نسل کہنے سے ڈرتے تھے۔ لیکن آجکل وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ اُن کی رگوں میں عربوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ خوش قسمتی سے راقم الحروف کو چند اسپینیوں سے ملاقات کا موقع ملا تو انہوں نے اپنے عربی النسل ہونے پر فخر کا اظہار کیا بلکہ ایک اندلسی خاتون جو مشرف بہ اسلام ہو کر پاکستان میں مستقل سکونت اختیار کر چکی ہے۔ انہوں نے تو اپنا شجرہ نسب طارق بن زیاد سے ملایا اور کہا کہ میری رگوں میں وہی خون ہے جو طارق بن زیاد کی رگوں میں تھا۔ اندلس میں کچھ لوگ تو فخریہ طور پر صدیقی، فاروقی بھی کہلانے لگے ہیں۔ آج کل مقامی نومسلموں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی ہے۔ بہت سے عربوں نے اسپین میں اپنی رہائشگاہیں بنالی ہیں۔ اس وقت صرف غرناطہ میں مقامی نومسلموں کی تعداد دس ہزار تک ہے۔ (۶۹)

جنوبی اندلس تو بالکل شمالی افریقہ کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کے باشندے رنگ و روپ اور خدوخال میں افریقی مسلمانوں سے بہت مشابہ ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کی آنکھیں سیاہ ہیں۔ اور جتنی زیادہ سیاہ اور چمکدار ہوں گی اتنا ہی زیادہ عرب خون کی شہادت دیں گی ان کے بال بھی سیاہ ہیں۔ اور نقوش بھی عربوں ہی کے سے ہیں۔ اس علاقے میں ہر جگہ عربی طرز تعمیر کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی بول چال میں عربی لب ولہجہ اور ان کے گیتوں میں "حجازی لے" کی گونج سنائی دیتی ہے۔

آٹھ نو سو سال میں جب ایک قوم یا کسی ملک پر کسی دوسری قوم کا سیاسی وثقافتی غلبہ رہا ہو تو لوگوں کی زبان بدل جاتی ہے۔ لیکن چونکہ اندلس سے اکثر بیشتر عرب آبادی کو جلاوطن یا قتل کر دیا گیا اور ان کی جگہ دوسرے علاقوں سے لوگوں کو لا کر آباد کیا گیا اس لئے زبان عربی نہ رہی۔ لیکن

اس وقت بھی سپینی زبان میں عربی کے ایک ہزار بنیادی الفاظ اور تین ہزار عربی سے Derived ہیں۔

اسپین کی زبان میں بے شمار عربی الفاظ کچھ اصل اور کچھ بدلی ہوئی شکل میں موجود ہیں۔ اسپینی زبان میں عربی الفاظ اکثر اسماء سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً Fonda ہوٹل (عربی فندق) Tahona نان بائی کی دوکان (عربی طاحونہ) اس میں عربی کے جو الفاظ لیے جاتے تھے ان کے ساتھ "ال" برابر شامل ہوتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد اسپینی کا حرف تنکیر بھی بڑھا دیا جاتا تھا۔ مثلاً La Alhaja نگینہ (عربی الحاجہ) La Altaja نہر (عربی الساقیہ)

اسپینی ذخیرہ الفاظ میں عربی سے مستعار لیے گئے الفاظ زیادہ تر روزانہ زندگی کی عام استعمال کی اشیاء سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً

ہسپانوی	اردو	عربی
Zaguan	گھر میں جانے کا راستہ	استوان
Tarima	چبوترہ	تریمہ
Alcooba	خواب گاہ	القبہ
Alfombra	قالین	الخمرہ
Al bamil	معمار	البناء
Alquiler	کرایہ	الکراء
Hasta	تا آنکہ	حتیٰ
Flano	وہ آدمی	فلاں
Adiafa	ضیافت	ضیافۃ
Alatar	عطر	العطر
Cafe	قہوہ	قہوہ
Yabel	پہاڑ	جبل
Rehen	رہن	رہینۃ

Ash shatranj. فارسی میں شطرنج، سنسکرت میں Chaturag ہے، جو چار کے معنی دیتا ہے

اسپین میں مضافات، دیہات اور مزارع بھی عربی ناموں سے موسوم ہیں۔ اسپینی کسان کے پاس آبپاشی کے متعلق جتنے بھی الفاظ ہیں وہ سب عربی کے ہیں۔ اس طرح بے شمار پھولوں، پھلوں، ترکاریوں، جھاڑیوں اور درختوں کے نام بھی عربوں کے دیے ہوئے ہیں۔ عربی زبان نے اس جزیرے نما پر کتنا گہرا اثر چھوڑا اس کا اندازہ ہم مختلف جغرافیائی اسماء سے بخوبی کر سکتے ہیں۔ مثلاً جبل (پہاڑ) اس سے جو نام بنے وہ کثیر تعداد میں ہیں۔

Jabacon, Javaloon, Jabaloyas, Gibraleon, Gibralforo,

اور Gibraltor (جبل الطارق) وغیرہ

دریا کے لیے عربی کا لفظ وادی ہے جس کا تلفظ اسپینی زبان میں (گاد) Guad ہے جسے اب بھی بعض لوگ واؤ کے ساتھ واد بولتے ہیں۔ چنانچہ Guadolqwui (وادی الکبیر) اور Guadalcozar (وادی القصر) اور Guadalmedina (وادی المدینہ) وغیرہ۔

باغات کے ناموں کا ماخذ بھی عربی ہے۔ مثلاً Generalife (جنت الحریف)

مزارع کو عربی میں القریہ اور گاؤں کو الضیجا کہتے ہیں۔ اسپین میں القریہ کہیں کہیں رائج ہے لیکن الضیجا پورے ملک میں Aldea کے نام سے موسوم ہے۔

اکثر شہروں کے اسماء کے ساتھ عربی لفظ "مدینہ" استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

medina depowa, Laguna de Medina اور Madina Sidonia وغیرہ۔

اندلس کے دیہاتی باشندے بازار (عربی السوق) کو Elazoque یہ پکارتے ہیں۔

مندرجہ بالا مختصر فہرست سے ہم با آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسپینی زبان اپنی نشوونما اور ارتقاء کے سلسلے میں عربی زبان کی کس حد تک مرہون منت ہے۔

غرناطہ پر قبضے کے ایک طویل عرصے تک مسلمانوں کی موسیقی اسپین میں رائج رہی اور آج بھی اسپینی موسیقی میں عربی کے اثرات تازہ ہیں۔

اسپین میں آج بھی دور دراز کے پہاڑی علاقوں میں ایسے گاؤں موجود ہیں جو تہذیب ثقافت کے لحاظ سے ابھی تک عربیت کے حامل ہیں۔ اس سلسلے میں ڈورتھی لوڈر کہتی ہے۔

"مرقیہ میں ایک بہت ہی قدیم قصبہ "الکا" ہے۔ یہاں یورپ بھر سے زیادہ کھجور پیدا ہوتی ہے اس علاقے میں اب بھی ایسے پہاڑی گاؤں موجود ہیں جو الگ تھلگ واقع ہیں۔ ان کی عورتیں جو بستی کے کوئیں پر مٹکے بھرنے آتی ہیں ابھی تک چہروں پر اسی طرح نقاب ڈالے ہوتی

ہیں جیسے آج سے پانچ سو برس پہلے ان کی بزرگ مسلمان بی بیاں ڈالے ہوتی تھیں۔ (۷۰)

جب سے حکومت اسپین نے مذہب سے پابندی اٹھائی ہے۔ بہت سے لوگوں اسلام قبول کر رہے ہیں۔ ۱۹۶۴ء سے پیشتر کوئی مسلمان اسپین سے حج کے لیے نہیں آتا تھا۔ لیکن اب سال بہ سال اسپینی حاجیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

اسپین والوں نے بہت سے معاشرتی رسوم و آداب بھی عربوں سے لئے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی کسی اسپینی کے گھر جاتا ہے تو وہ ان کلمات سے اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ تشریف لائیے، یہ آپ کا ہی گھر ہے۔ (Esta en su Casua) ان کی کسی چیز کی تعریف کرتے ہیں تو اسپینی کہتے ہیں "قبول فرمائیں یہ آپ کی نذر ہے" کسی اچھے ناچ یا گانے یا ہسپانوی کا بار بار (Ole) پکارنا بھی "واللہ" کی یادگار ہے۔ عربوں کی طرح شاعرانہ گفتگو اسپینیوں کا روزمرہ کا معمول ہے۔

واشنگٹن اورنگ لکھتا ہے۔ کہ آپ کسی ان پڑھ اسپینی سے بھی ملیں گے تو اس کی گفتگو شائستہ اور شاعرانہ ہوگی اور یہ گفتگو یورپ کے کسی بھی ملک کو نصیب نہیں۔ ۷۱

آج بھی اسپینی اکثر "انشاء اللہ" کے الفاظ بولتے ہیں۔

☆☆☆

حواشی

(۱) ڈارتھی لوڈر ہسپانیہ مترجم سید ہاشمی فرید آبادی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۴ء ص ۱۸

(۲) ایضاً ص ۲۰۔

(۳) رائن ہارٹ دوزی، عبرت نامہ اندلس مترجم عنایت اللہ مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۶۲ء ص ۱۳۔

(۴) امیر شیکب ارسلان، جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے، انجمن ترقی اردو کراچی۔ ۱۹۵۷ء ص ۶۴۔۶۳۔

(۵) ریاست علی ندوی تاریخ اندلس حصہ اول مصارف اعظم گڑھ ۱۹۵۰ء ص ۶۴۔۶۳ (افریقہ میں بربروں نے عربوں کے خلاف بغاوت کردی جس سے ان مسلمانوں کے ساتھ ان کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ ان کے انجام کے بارے میں ساری تاریخیں خاموش ہیں۔)

(۶) ان میں سے ایک مہم ایک بربر سردار ابوزرعہ کی قیادت میں حکومت کی مرضی کے بغیر بھی گئی۔ وہاں یہ لوگ بہت سے قیدیوں کو دیگوں میں پکا کر کھا گئے۔ یہ بات سارے اسپین میں پھیل گئی۔ جس سے طارق کے جانے سے پہلے اسپین کے لوگ خوفزدہ ہو گئے تھے۔ ان بربروں کے لیے اسلام ابھی نیا تھا۔ اس لیے اسلام کے اصولوں سے ناواقف تھے۔

(۷) محمد احسان الحق سلیمانی، مسلمان یورپ میں ۱۹۵۴ء ص ۱۸

(۸)(۹) ڈارتھی لوڈر، ہسپانیہ، مترجم سید ہاشمی فرید آبادی، مکتبہ فرینکلین لاہور ۱۹۶۴ء ص ۱۸

(۱۰) اسکاٹ، اخبار الاندلس، مترجم خلیل الرحمن طبع ۱۹۲۹ء لاہور، ص ۸۲

(۱۱) نیاز فتح پوری تاریخ الادوتین مقتبس از تاریخ التمدن الاسلامی، جرجی زیدان، اظہر پبلشنگ لاہور، سن ندارد۔ ص ۲۱۰

(۱۲) ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون، حصہ پنجم حکیم احمد حسن آلہ آبادی نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۸۳ء۔ ص ۳۲۵

(۱۳) رائن ہارٹ، دوزی عبرت نامہ اندلس، ترجمہ عنایت اللہ، مقبول اکیڈمی لاہور،

۱۹۶۲ء ص، ۹۱۹
(۱۴) گستاولی بان تمدن عرب مترجم سید علی بلگرامی ص۔ ۴۳
(۱۵) ایضاء ص ۲۳۵
(۱۶) احسان الحق سیمان کتاب مذکور۔ ص ۱۳
(۱۷) انتظار اللہ شہابی، خلافت ہسپانیہ، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۴۹ء ص ۱۸
(۱۸) حتی، عرب اور اسلام، مترجم مبازالدین، دہلی ۱۹۵۱ء ی۔ ص ۲۱۳
(۱۹) عبدالوحید خان تاریخ افکار و سیاست اسلامی نولکشور پریس لکھنوسن ندارد
(۲۰) المقری نفح الطیب جزاول مترجم خلیل الرحمٰن انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ ۱۹۳۰ء ص ۲۱
(۲۱) رشید اختر ندوی تہذیب و تمدن اسلامی حصہ دوم طبع ۱۹۵۲ء ص ۴۸۹
(۲۲) المقری کتاب مذکور۔ ص۔ ۴۳۷
(۲۳)(۲۴) ذوالقدر جنگ، خلافت اندلس، مقبول اکیڈمی لاہور۔ ص ۱۴
(۲۵) المقری نفح الطیب جزاول مترجم خلیل الرحمٰن ص ۷۳
(۲۶) ٹامس آرنلڈ میراث اسلام ترجمہ
(۲۷) اسکاٹ۔ کتاب مذکور۔ ص۔ ۶۳۲
(۲۸) گستاولی بان۔ کتاب مذکور۔ ص۔ ۲۵۶
(۲۹) واشنگٹن ارونگ "الحمرا کی داستانیں" مترجم سردار علی علوی طبع اول، لاہور ص ۲۶
(۳۰) عنایت اللہ دہلوی اندلس کا تاریخی جغرافیہ۔ ص۔ ۲۷۴
(۳۱) احسان الحق سلیمانی۔ کتاب مذکور۔ ص۔ ۴۸۴۔ ۴۸۳
(۳۲) واشنگٹن اورونگ کتاب مذکور۔ ص۔ ۱۴۔ ۱۵
(۳۳) اختر رضا زیدی، خلافت کا عروج و زوال، فیروز سنز لاہور سن ندارد ص ۲۵۵
(۳۴) احسان الحق سلیمان کتاب مذکور۔ ص ۳۲۹
(۳۵) اسکاٹ جز موم۔ ص۔ ۵۱۴
(۳۶) ایضاً۔ ص۔ ۵۱۳
(۳۷) امین اللہ دشیر "ثقافت" لاہور ستمبر 1964ء ص 13

(۳۸) Nicholson, Literary History of the Arabs London 1907 Page 419
(۳۹) رائن ہارٹ ڈوزی۔ ص ۴۷
(۴۰) احسان الحق سلیمانی۔ ص۔ ۱۲۵
(۴۱) گستاولی بان۔ ص۔ ۵۵۴
(۴۲) ایضاً۔ ص۔ 618
(۴۳) Brown E. G. Arabian Medicine London, Brown Page 98
(۴۴) Breadz Dicharen 1962 Page 97
(۴۵) P. K Hitti History of the Arabs . London Macmilon Colicl 1964. Page 557.
(۴۶) غلام جیلانی برق تاریخ الاطباء علی گڑھ۔ ۱۹۲۳ء ص ۸۵
(۴۷) رشید اختر ندوی۔ کتاب مذکور۔ ص ۵۵
(۴۸) Thomas Arnold Legacy of Islam Page 89
(۴۹) ابوسلمہ شفیع احمد مضامین سلیمان ندوی حصہ اول مکتبہ علم و حکمت پٹنہ ۱۹۵۰ء ص ۳۶۸
(۵۰) ایضاً۔ ص ۳۵۳ (۵۱) ایضاً۔ ص۔ ۳۶۵ (۵۲) گستاولی بان ص ۱۸۹
(۵۳) آرنلڈ میراث اسلام مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۰ء۔ ص ۱۸۱
(۵۴) ایضاً۔ ص۔ ۱۸۴
(۵۵) ایضاً۔ ص۔ ۲۲،۱۷۴
(۵۶) ایضاً۔ ص۔ ۲۲
(۵۷) ایضاً۔ ص۔ ۵۴
(۵۸) ایضاً۔ ص۔ ۵۴
(۵۹) ایضاً۔ ص۔ ۲۵۵
(۶۰) ایضاً۔ ص۔ ۲۵۵
(۶۱) ایضاً۔ ص۔ ۵۲

(۶۲) ایضاً۔ص۔۵۳

(۶۳) ایضاً۔ص۔۲۷۵

(۶۴) ایضاً۔ص۔۴۳۳

(۶۵) گستاولی بان ص۱۴۷

(۶۶) آرنلد، میراث اسلام۔ص۲۰۴ (۶۷) ایضاً۔ص۱۶۴ (۶۸) ایضاً۔ص۔۷

(۶۹) غرناطہ یونیورسٹی۔اسی یونیورسٹی کے رئیس الجامعہ کے بیان کے مطابق جو ۱۹۹۴ء کے "زندگی" کے شمارے میں شائع ہوا۔

(۷۰) ڈارتھی لوڈر۔کتاب مذکور۔ص۱۴

(۷۱) واشنگٹن ارونگ الحمرا کی داستانیں ترجمہ سید وقار عظیم۔

دوسرا باب

اقبال کی اندلس سے وابستگی

اقبال ایسے دور میں پیدا ہوئے جب عالمِ اسلام کا زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ڈیڑھ سو سال سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلام پر پے در پے مصیبتیں نازل ہو رہی تھیں۔ مسلمانوں کا جاہ وجلال اور عظمت وسطوت ختم ہو چکی تھی افتراقِ باہمی خود غرضی وغفلت نے تنزل و انحطاط سے دوچار کر دیا تھا۔ ترکی، یورپ، افریقہ اور ایشیا سے نکل کر ایک چھوٹے سے قطعے میں محدود ہو گیا۔ زارِ روس نے اسے یورپ کا مرد بیمار کہا۔ ایران وافغانستان، رُوس اور انگلستان کا تختہ مشق بنے۔ غرض کہ مسلمان تاریخ کے نشیب وفراز میں زوال کی اس منزل تک جا پہنچے تھے کہ انہوں نے اپنے ذہن اور روح پر شکست کا احساس مُسلط کر کے اپنی عملی صلاحیتوں کو ناکارہ اور مفلوج بنا دیا تھا۔ حالانکہ ماضی میں یہی مسلمان مختلف مصائب اور دشواریوں کے سیلاب میں زیادہ نکھر کر اُبھرے اور آزمائشی دور نے اُن کو زیادہ استحکام اور پائیداری بخشی۔ لیکن عالم اسلام کی سیاسی تنزل پذیری کے سبب مغرب نے اسلامی طرزِ حیات وانداز فکر وعمل کو بدل کر اپنی تہذیب و تمدن اور سیاسی فکر کو فروغ دیا تھا۔ تاکہ مسلمان اپنے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل نہ کر سکیں۔ حال کی اِس بے پناہ تیرگی میں اقبال نے ملتِ اسلامیہ کے تابناک ماضی کو مشعل راہ بنایا اور مسلمانوں میں اسلامی نظریہ حیات کی خاطر شعوری بیداری پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اسلاف کے کارناموں کی یاد دِلا کر اُن میں ایک نئی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اقبال نے انہیں بتایا کہ ان کے اسلاف کا چہار عالم میں کیا مقام تھا۔ اور وہ ایک قابلِ فخر تہذیب وتمدن کے مالک تھے۔ جس کا مبدائے نور اسلام تھا۔ اور آج بھی وہ اِس پر عمل کر کے وہی مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی لیے اندلس کی تاریخی تمدنی، تہذیبی وثقافتی عظمت اقبال کی نگاہ توجہ کا مرکز بن گئی۔ جو عقیدت و محبت کے اس مقام پر پہنچ گئی جیسے وہ اس کی آخری محبوبہ ہو۔ا۔

اندلس کی درخشاں روایات، تہذیبی وثقافتی عظمت وشان اور زوالِ اندلس کا المیہ نہ صرف عرب شعراء کا محبوب موضوع بنا۔ بلکہ تقریباً ہر مسلمان ملک کے دردِ دل رکھنے والے شعرا نے مختلف ادوار میں اندلس کی داستان کو اپنے خون سے لکھا ہے۔ قرطبہ کے عروج کے زمانے میں ابواسحاق خفاجہ اندلس کی خوشحالی پر یوں زمزمہ سنج تھا۔

یَا أهل اندلس لله درکم ○ ماء و ظل و انهار و اشجاز
ما جنته الخلا الا فی دیارکم ○ وهند کنت لو خیرات اختاد

لا تخشوٗ بعد ذان تدخلو سقراء ○ فلیس تدخل بعد الجنة النار

اے اندلس والو!
سبحان اللہ تمہاری کیا بات ہے!
پانی ہے، سایہ ہے، نہریں ہیں اور درخت ہیں
جنت اگر کہیں ہے تو تمہارے ملک میں ہے۔
اگر مجھے اختیار دیا جائے تو میں اسی کو پسند کروں گا۔
تم کو یہ سب ہوتے ہوئے دوزخ کا ڈر نہیں ہونا چاہیے
اس لیے کہ جنت سے نکال کر کسی کو دوزخ میں نہیں داخل کیا جاتا۔

دوسری جگہ کہتا ہے۔

ان للجنة بالاندلس ○ متجلی عین و ریانفس
فسنا مبیحها من شنب ○ ود لیلتها من لعس
فاذا ما حبت الریح صبا ○ صحت دا شوقی الی اندلس

"جنت اندلس میں آنکھوں کے لیے خوشنما مناظر اور نسیم صبح کی خوشبوئیں ہیں۔
اس کی صبح کی روشنی محبوب کے دانتوں کی چمک سے مشابہ ہے اور رات کی تاریکی
محبوب کے ہونٹوں کے حسین سرمگیں رنگ سے مشابہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب نسیم
صبا کے جھونکے چلتے ہیں تو میں فرطِ شوق سے چلا اٹھتا ہوں کہ ہائے اندلس!"[۱۴]

لیکن عظیم الشان الزہرا کی تکمیل کے پچاس سال کے اندر بغاوت اور فتنہ وفساد کی ایسی آگ بھڑکی کہ زھراء کا پھول مرجھا گیا۔ الزاھرا بھی جسے زہرا کے مقابلے میں المنصور بن ابی عامر نے ۳۷۰ھ/۹۸۰ء میں تعمیر کرایا تھا۔ کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔

خلافت کی جگہ طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ عرصہ دراز تک شعرا قرطبہ کے مرثیے کہتے رہے۔ یہاں حضرت محی الدین ابنِ عربی کے کچھ اشعار کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ جو مدینہ الزہرا کی ویرانی سے متاثر ہو کر کہے گئے تھے۔

"تفریح گاہوں کے آس پاس کچھ گھر ہیں جو صاف نظر آتے ہیں اس حال میں کہ ان میں رہنے والا کوئی نہیں ہے۔ اور وہ ویران ہیں۔ ہر طرف پرندے ان پر نوحہ کرتے ہیں۔ کبھی خاموش ہو جاتے ہیں اور کبھی اپنی آوازوں کی گونج بلند کرتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک نغمہ زن

پرندے سے میں مخاطب ہوا کہ اس کا دِل غم ناک تھا اور وہ سہا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تو کس چیز پر نوحہ اور شکوہ کر رہا ہے تو اس نے کہا اُس زمانے پر جو گزر گیا اور واپس نہیں آئے گا۔ ۱۷

اندلسی مسلمانوں کے زوال کے ابتدائی دور میں سب سے اہم شہر طلیطلہ (جو عیسائیوں کا سابق دارالحکومت تھا۔) سات برس کے محاصرے کے بعد ۱۰۸۵ء میں ان کے قبضے میں چلا گیا۔ انہوں نے اسے اپنا دارالحکومت پھر سے بنالیا اس المیے کو ایک گمنام اندلسی شاعر نے انتہائی رنج و غم کے ساتھ موضوعِ سخن بنایا جس کے کچھ اشعار اور انکا ترجمہ یہ ہے۔

طُلَیطُلَةُ اَبَاحَ الكُفرُ مِنهَا   حِمَاهَا ، اِنَّ ذَا نَبَأ كَبِير
فليس مثالها ايوان كسرى   ولا منها الخورنق والسدير
محصنة محسنة بعيد   تنا ولها و مطلبها عَسَير
الم تك معقلا للدين صبعاً   فذلله كما شاء القدير
وَاُخرِجَ اَهلُهَا مِنهَا جَمِعاً   فَصَارُوا حيث شَاءَ بِهِم مَصِير
وكانت دار ايمان و علم   معالمها التى طمست تنثر
فعادت دار كفر مصطفلةً   قد اضطَرَبَت با هليها الامور
مساجد ها كنائس اى قلب   على هذا يقر ولا يطير
فيا اسفاهٔ يا اسفاه خزناً   يكر وما تكررت الدهور
و ينشر كل حسن لبس يطوى   الى يوم يكون به النشور
اويلت قاصرات الطرف كانت   مصونات مساكنها القصور
وادر كها فتور فى انتظار   يسرب فى لواحظه فتور
وكان بنا و بالقينات اولى   لو انضمت على الكل القبور
لقد سخنت بحالتهن عين   وكيف يصبح مضلوب قدير
لئن غبنا عن الاخوان انا   با حزان و اشجان حضور
تذور كان لالا يام فيهم   بمسهلكم فقد وفت النذور

ترجمہ۔

طلیطلہ کی محفوظ حویلی کو کفار نے لوٹ مار کے لیے مباح کر دیا یہ تو بہت بھیانک خبر ہے۔! حسن و جمال اور عظمت و جلال میں یہ شہر ایوان کسریٰ اور نعمان بن منذر

شاہ حیرہ کے محلات خورنق اور سدیر کو بھی مات کرتا تھا! وہ محفوظ تھا، وہ سجا سجایا تھا، اس تک رسائی یا اس پر دست درازی مشکل تھی! کیا یہ شہر دین اسلام کا قلعہ محفوظ نہ تھا۔ مگر قادرِ مطلق نے اپنی بے نیازی سے اسے ذلیل و رسوا کر دیا۔ یہ شہر ایمان اور علم کا مرکز تھا، اس کے یہی روز روشن کرنے والے نشانات تو نیست و نابود کر دیئے گئے ہیں۔ اب تو وہ بالکل دارالکفر بن گیا ہے اور وہاں کے لوگوں کے معاملات اضطراب اور ابتری کا شکار ہیں اس کی مساجد کو گرجوں میں بدل دیا گیا ہے۔ کون سا دِل ہوگا جو یہ سن کر قرار پائے اور رو رو کر بکھر نہ جائے۔ ہائے افسوس! ہائے افسوس! غم نا قابل برداشت ہے، زمانہ کی گردش کے ساتھ یہ واقعات بھی دہرائے جا رہے ہیں۔ حسیناؤں کی بے حرمتی ہوگئی ہے، اب روزِ قیامت تک اس رسوائی پر پردہ پوشی ممکن نہیں۔ ۱۸

طلیطلہ کی جامع مسجد میں مسلمانوں کا ایک عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ اس کی شہرت ملحقہ تمام عیسائی ممالک میں پھیلی ہوئی تھی۔ عیسائیوں کی فتح کے بعد ایک عرصے تک مخلوط النسل کے عرب اور یہودی جو عیسائی ہو گئے تھے اس میں کام کرتے رہے۔ بارھویں صدی کے شروع میں اسکاٹ لینڈ کے مائیکل جرمنی کے ہرمان نے اس کتب خانے میں مترجم کی حیثیت سے کام کیا اور بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ [۱۹]

اس وقت اندلس کی حالت کے بارے میں صاحب بصیرت افراد فکر مند تھے انہیں میں سے ایک شیخ ابو عبداللہ ابن الابار تھے۔ امداد حاصل کرنے کے لیے فاس کے بادشاہ کے دربار میں گئے۔ اور اس کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا جسے ہم اندلس کا مرثیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

ادرك بخيلك خيل الله اندلسا   ان السبيل الىٰ مجاتها درسا
وهب لها من عزيز النصر ما التمست   فلم يزل منك عزيز النصر ملتمسا
وحاش مما تعانيهِ حشا شتُهَا   فطا لماذاقت البلوى صباح مسا
يا للجز يرة اضحى اهلها جزراً   للحاد ثات وامسى جدها تعسا
فى كل شارقة الىام بارقة   يعود ما تمها عند العدا عرسا
وكل غاربة اخجال شائبته   تثنى الامان حذارا و السرور اسى

تقا سم الروم لا نالت مقاسمهم	الا عقائلها المحجوبة الانبا
و فی بلنسية منهما فی قرطبة	ما ینسف النفس او ما ینزف النفسا
مدائن حلها الاشراك مبتسما	جد لان وار تحل الایمان مبتسئا
وصیر تها العوادی العابثات بها	یستو حش الطرف منها ضعف ما انسا
یا للمساجد عادت للعدا بیعا	و للنداء غدا اثناءَ ها جرساً
لعفِی علیها الی اسِترجاع فائتها	مَدَارِ سا للمثانی اصبحت دُرُسَا

ترجمہ:۔

اے بادشاہ! اپنے شہسواروں سے (جو اللہ تعالیٰ کے شہسوار ہیں) اپنے ساتھ لے اور اندلس کی فریاد رسی کر کیونکہ اس کی نجات و آزادی کے امکانات معدوم ہو گئے ہیں۔ اہل اندلس کی پوری پوری غالب آنے والی مدد فرما جیسا کہ تجھ سے التجا کی گئی ہے۔ کیونکہ ایسی مدد تجھ سے ہی متوقع ہے! اس ملک کی لب رسیدہ جان جو مبتلائے عذاب ہے اسے بچالے، کیونکہ یہ مدتوں سے صبح و شام ہنگاموں اور آفات کا شکار ہے۔ آہ جزیرہ اندلس! اس کے باشندے تو قید خانے کے جانور بن چکے ہیں۔ حوادث کی زد میں ہیں اور بدبختی کا شکار ہیں۔ ہر نکلنے والا سورج ایک بجلی بن کر گرتا ہے جس کا ماتم دشمنوں کے لیے شادمانی بن جاتا ہے۔ ہر ڈوبنے والا سورج دوشیزہ کے لیے رسوائی کا پیغام دے کر جاتا ہے جو امان کو احتیاط اور خوشی کو غم میں بدل دیتا ہے۔ اہل صلیب نے قسم کھا رکھی ہے۔ خدا کرے ان کی قسم پوری نہ ہو کہ وہ پردہ نشین حسین دوشیزاؤں پر ہی ہاتھ ڈالیں گے! اندلس کے شہر بلنسیہ اور قرطبہ میں جو المناک حوادث پیش آئے ہیں وہ جان لینے والے اور خون نچوڑنے والے تھے! یہ شہر جہاں شرک خوشی سے دندناتا ہو فروکش ہو گیا ہے اور ایمان مایوس ہو کر کوچ کر گیا ہے۔ آہ مساجد جنہیں دشمنوں نے گرجوں میں بدل دیا ہے اور اذان کی جگہ وہاں اب گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ مجھے اِن مساجد کے دیر سے واپس لینے پر افسوس ہے انہیں واپس لینے کی جلدی کیجیے۔ کیوں کہ وہاں قرآن کریم کی درسگاہیں معدوم ہو چکی ہیں۔[۲۰]

اسی زمانے کے ایک اور مشہور شاعر ابو اسحٰق بن فرقد نے بھی اندلس کا مرثیہ کہا ہے جو

درد و غم سے لبریز ہے اس مرثیہ کے چند اشعار یہ ہیں۔

الا مسعد مجنذ وفطن	کیا کوئی ایسا مددگار اور فطین نہیں ہے۔
یبکی بدمع معین هتن	جو لوگوں کو اشک رواں سے رُلائے
جزیرة اندلس قد سطت	جزیرہ کو اندلس کی حالت پر
علیها غوائل حقد الزمن	جس پر کہ بدباطن زمانے کے اشرار نے سطوت پائی ہے
ویندب اطلالها آسفا	اس کے کھنڈر پر تاسف سے نوحہ کرے
ویرثی من الشعر ما قد وهن	اس کی کمزوریوں کا مرثیہ پڑھے
ویبکی الیتامی ویبکی الایلمی	یتیموں اور بیوائیوں کو رُلائے
ویجکی الحمام ذوات الشجن	غمگین قمریوں کی حکایت بیان کرے
ویشکو الی الله شکری شج	زخمیوں کی مانند اللہ سے فریاد کرے
ویدعوه فی السبر ثم العین	اور علانیہ و پوشیدہ اس سے دعائیں مانگیں
وکانتر باطًا لا هل التقی	یہ جزیرہ جو پرہیزگاروں کے لیے
فعادت مناطا لا هل الوثن	اب بت پرستوں کا گھر ہے
وکانت ملاذًا لا هل التقی	اور نیکوکاروں کے لیے جائے پناہ تھا
فصارت ملاذا لمن لم یدن	اب بے دینوں کا ملجا ہے
وکانت شجی فی حلوق العدا	اور دشمنوں کے حلق میں ہڈی بن کر پھنستا تھا
فاضحت لهم مالها محتجن	اب یہ ان کا ہے اور کوئی ان سے چھیننے والا نہیں [۲۱]

اندلس کے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان یہ تصادم صدیوں پر محیط ہے۔ ایک ایک شہر اور ایک ایک قصبے کے لیے ان میں مقابلہ ہوتا رہا۔ مسلمان آہستہ آہستہ غرناطہ کی طرف پیچھے ہٹتے گئے اور عیسائی آگے بڑھتے گئے۔ جب بلنسیہ بھی ہاتھ سے گیا تو ایک شاعر نے یہ مرثیہ کہا جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"بلنسیہ بلنسیہ! افسوس تجھ پر مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں تو سخت جان کنی میں ہے۔ اگر خوش قسمتی سے تو بچ نکلے تو تجھ سے بڑھ کر کوئی عجوبہ روزگار نہ ہوگا۔ اگر کسی مقام پر خدا کی رحمتیں نازل ہو سکتی ہیں تو ہم دعا کرتے ہیں کہ تجھ پر ہوں کیونکہ تو کبھی سراپا مسرت تھی۔ مسلمان تجھ پر ناز کرتے تھے اور تیرے ہی دامن شفقت میں

مسرور الوقت ہوتے تھے۔ لیکن اگر مشیت ایزدی سے تیرا نوشتہ تقدیر یہی ہے کہ تو بالکل تباہ و برباد کر دیا جائے تو یہ تیرے گناہوں کی سزا ہے۔ تیرے غرور و تمکنت کا یہ انجام ہے۔ تیرے عالی شان برج جن کی خوبصورتی اور بلندی کبھی سیاحوں کے لیے نظر فریب اور سرور خیز تھی اب تیری مصیبت دیکھ کر کمر شکست ہوتے جاتے ہیں۔ تیری سنگِ مرمر کی ایسی شہر پناہ جو دور سے چمک چمک کر دیکھنے والوں کی نظروں کو خیرہ کرتی تھی اب تیرے ماتم میں اپنا تمام حسن اور آب و تاب کھو بیٹھی ہے۔ تیرا خوش و خرم دریائے وادی الابیض مع اپنے تمام معاونین کے جنہوں نے تجھ کو ہمیشہ سرسبز اور سبز بخت رکھا ہے۔ اب تجھ سے بیزار ہو کر اپنی قدیم گزرگاہ چھوڑتے ہیں اور تجھ سے بچ بچ کر چلتے ہیں۔[۲۲] تیرے شاداب تاکستان، تر و تازہ باغات جو کبھی تجھ کو فرطِ شفقت سے اپنے حلقے میں لیے ہوئے تھے اور تیری نازک فصیل کو اپنے قدرتی دامنوں میں چھپائے ہوئے تھے اب بالکل بے برگ و بے ثمر ہیں۔ کیونکہ خون خوار بھیڑیوں نے اُن کی جڑیں تک چپا ڈالیں۔ تیرے زرخیز چمن اور مالا مال خیابانیں جن میں ہفت رنگ، نظر فریب پھولوں سے گلزار ارم کا جلوہ نظر آتا تھا۔ اور تیرے عزیز الوجود فرزندوں کے لئے تفریح گاہیں تھیں۔ اب خشک ہو کر صحرا کا نمونہ بن گئی ہیں۔ تیری شاندار بندرگاہ، تیری مایہ ناز تجارت۔ اب اُس رونق اور فضا سے خالی ہے جو تیرے اقبال کے زمانے میں تیری بدولت اس کو حاصل تھیں۔ جس سرزمین کی تو کبھی عروس دلفریب کہلاتی تھی اب اس کو ایک شہر آشوب جہاں سوز آتش نے آتش کدہ بنا دیا ہے۔ جس کا پریشان کرنے والا دھواں تجھ کو عذاب جہنم کی یاد دلا رہا ہے۔ بلنسیہ! بلنسیہ! ہر طرف سے مایوس اور شکستہ ہوں۔ تیرے غم کی سوزش پنہاں سے سلگ سلگ کر میں نے تیری حسرت انگیز داستان بیان کی ہے میں اس دردِ دل کی بڑی خوشی سے ارمانِ دل بنائے رکھتا اور کسی کو شریک غم نہ کرتا۔ مگر افسوس! کہ افشائے راز کی سخت ضرورت ہے۔[۲۳]۔ اور پھر مالقہ بھی عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ تو بے اختیار ایک مسلمان شاعر پکار اٹھا۔

الوداع! الوداع! اے پیارے مالقہ اے رشکِ فردوس ارم شہر تیری مشہور زمانہ شان و شوکت، تیری سنگین قلعوں کی وہ مغلوب نہ ہونے والی طاقت آج کہاں ہے۔ تیرے سر بفلک

کشیدہ مینار آج خاک میں مل گئے۔ تیری لوہالاٹ دیواریں، تیرے ناز پروردہ فرزندوں کو اب اپنے دامنِ شفقت میں کیوں نہیں چھپاتیں۔ افسوس آج جلاوطن ہو کر وہ تجھ سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتے ہیں۔ تاکہ غریب الوطن و بے کس بن کر آپس میں ایک دوسرے کا ماتم کریں افسوس ان کی جان سوز مصیبت پر کوئی دِل سوزی کرنے والا نہ ہوگا۔ ان کی آہ و زاری پر تب درد سے ناواقف اجنبی لوگ حقارت سے ہنسیں گے۔[۱۲]

قرطبہ۔ بلنسیہ، مالقہ، اشبیلیہ اور دوسرے کئی شہروں کے مرثیے غرناطہ کے شعراء نے لکھے۔ غرناطہ کے شعراء وادبا، مثلاً ابن الخطیب وغیرہ کی نگارشات میں جہاں کہیں قرطبہ کا نام آتا اس کے نام کے ساتھ یہ ضرور لکھا جاتا کہ خدا اسے دوبارہ مسلمانوں کے قبضے میں لائے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ کچھ عرصے بعد غرناطہ بھی ان کے قبصہ سے نکل جائیگا۔ غرناطہ پر مسیحی تسلط کے بعد شیخ احمد دقون نے بڑے دکھ اور کرب کے ساتھ مرثیہ کہا۔ جس کا نام ''الموعظۃ الغدراء باخذ الحمداء'' رکھا۔ وہ مرثیے کے شروع میں لکھتا ہے۔

"انه لما غابت شمس الجزيرة الخضراء باخذ الحمراء قرعت باب الندبة لما تقدم من الصحبة فقلت ابيا تا صدرت من قلب كيب مبكية كل لبيب اديب و سميتها بالموعظة الحمراء مبيحا لمن رغب فيها ولم يرغب عنها او استحسن شيئا منها ان تحدث بها مني"

ترجمہ:

(بات یہ ہے کہ الحمراء پر قبضے کے نتیجے میں جزیرہ سرسبز کا سورج غروب ہو گیا تو نے اپنے کام آنے والے ساتھیوں کے ماتم کے لیے مرثیہ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو میں نے چند اشعار کہے جو دردمند دل سے نکلے ہیں اور ہر عاقل و دانا کو رُلانے والے ہیں، میں نے اس مرثیہ کا نام رکھا ''الموعظۃ الغدراء باخذ الحمداء'' جو کوئی اسے پسند کرے اور نفرت نہ کرے اسے یہ اجازت دیتا ہوں کہ اس کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے روایت کرے۔ شیخ دقون کے مرثیے کی تمہید دیکھیں۔

امنت من عكس آمال و احوال — وعشت ما بين أعمام و الخوال
ولا ابتليت بما في القلب من نكد — فما لجسم مشتغل من غير أشغال
وكيف لا و بقاع الدين خالية — من أرض أندلس من أجل أهوالي

عمت ففعت قلوب المسلمين فيا — للمسلمين من أعداء و انكال
جاشت بها من جيوش الكفر مادرست — بهم معالم أخيار و أقيال
والمسلمون من الا ضغان قد ملئت — قلوبهم و ابو اتسديد أخلال

ترجمہ:۔

آپ تو اپنی امیدوں اور احوال کے دگرگوں ہونے سے محفوظ ہیں کیونکہ آپ تو اپنے چچا، ماموں اور دیگر رشتہ داروں میں رہ رہے ہیں۔ آپ تو اپنے دل کو تکلیف دینے والے کسی صدمے میں مبتلا ہی نہیں ہوئے اس لیے آپ کو تو جسمانی طور پر بھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ آخر ہمیں صدمہ کیوں نہ ہو بڑی ہولناک آفات کی وجہ سے سرزمین اندلس کے علاقے دین حق سے خالی ہو چکے ہیں۔ یہ ہولناک آفات عام ہوگئیں تو انہوں نے مسلمانوں کے دلوں کو غمگین کر دیا۔ اور مسلمانوں کے دل تو باہمی کینے سے بھی بھرے ہوئے تھے اور ان نقائص کو درست کرنے سے یہ انکاری ہو گئے (یعنی باہمی بغض وعداوت سے باز نہ آسکے اور عزت واقتدار کھو بیٹھے) سقوطِ غرناطہ کے نتیجے میں جو المناک واقعات پیش آئے اور تکلیف دہ مناظر سامنے آئے ان کی تصویر کشی کا ایک نمونہ شیخ دقون کے ہاں دیکھیے۔

واضل غرناطه الغداة قد عدمت — حب الحصيد و نصر الله والآل
كانها الشمس في افق العلى كسفت — فهل على طلل تدى بابطال؟
وهل يعود لها الدين الذى انست — به وقدأيست من فتح أبدال
قد قوا اكبسا في كل منزلة — وقد سباعده من أيدأ و عال
فلا المساجد بالتوحيد عامدة — إذ عمر وها بنا قوس و تمثال
ولا المنابد للوعاظ بارزة — للامروالنهى اوتذكير آجال
ولا المكاتب بالصبيان آنسة — تتلو القرآن بأسحار وآصال

ترجمہ:۔

دشمن نے حسین غرناطہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ غلے کے دانے، اللہ کی نصرت اور برکت معدوم ہو چکی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ غرناطہ افق بلند پر پہنچتا ہوا آفتاب ہے جو گہنا گیا ہے۔ تو کیا یہ گہنایا ہوا آفتاب اپنے بہادروں کو ٹیلوں پر پھینک کر ضائع کر دے گا۔ اور کیا وہ دین غرناطہ میں لوٹ آئے گا۔ جس سے وہ مانوس ہو چکا ہے۔ جبکہ کسی ولی یا ابدال کی مدد سے تو یہ مایوس ہو چکا ہے۔ غرناطہ والوں کو قوم سبا کی طرح

ادھر اُدھر بکھیر دیا گیا ہے۔ اور ان کی ایک تعداد کو وحشیوں نے قیدی بنا لیا ہے۔
مسجدیں اب توحید سے آباد ہونے کی بجائے ناقوسوں اور تصاویروں سے آباد ہیں۔ منبر بھی واعظوں کے احکام الٰہی بیان کرنے یا موت یاد دلانے کے لیے نظر نہیں آتے۔ مکتب اب صبح شام تلاوت قرآن کرنے والے بچوں سے آباد اور مانوس نہیں رہے۔ [15]

مسلمانِ غرناطہ نے عیسائیوں کے زیر تسلط آنے کے بعد اسلامی ملکوں سے امداد چاہی لیکن کسی بھی ملک نے دست گیری نہ کی حالانکہ اس دور میں سلطنتِ عثمانیہ، صفویہ، مغلیہ، اور وسط ایشیاء کی ریاستیں اپنے عروج پر تھیں۔ ایک موقع پر سلطان صلاح الدین ایوبی نے مراکش کے بادشاہ منصور سے مدد مانگی تھی لیکن وہ امیر المومنین نہ لکھنے پر ناراض ہو گیا تھا۔ اس طرح شاہ غرناطہ نے ترکی کے سلطان کو امیر المومنین نہ لکھا تو وہ بھی ناراض ہو گیا۔ البتہ اس نے بحری جہاز بھیجے جو مسلمانوں کو اندلس سے افریقہ پہنچاتے رہے۔

سقوطِ غرناطہ کے بعد ایک غرناطی شاعر نے عثمانی خلیفہ سلطان بایزید کے نام فریاد کے طور پر مسلمانانِ غرناطہ کی حالت کو ایک مرثیہ میں انتہائی سوز ناک اور پر درد الفاظ میں تصویر کشی کی ہے۔ اس مرثیے کے اشعار میں وہ تمام واقعات بیان کیئے گئے ہیں جو مسلمانوں کے سامنے پیش آئے۔ جس جس مصیبت سے انہیں گزرنا پڑا انہیں آنسوؤں کے ساتھ شعر کا جامہ پہنایا۔

سلام كريم دائم مُتَجدد — اخص بهِ مولاى خير خليفة
سلام على مولاى ذى المجدو العلا — ومن البس الكفار ثوب المذلة

ترجمہ:۔ احترام دائمی سے لبریز تجدید پذیر سلام ہے جو میں اپنے آقا بہترین خلیفہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں عزت و سربلندی والے میرے آقا پر سلام ہو وہ جس نے کفار کو لباس ذلت پہنایا۔

فلما دخلنا تحت عقد ذما مهم — بد اغدرهم فينا بنقض العزيمة
وخان عهودا كان قد غرنا بها — ونصرنا كرها بعنف وسطوة
وأحرق ماكانت لنا من مصاحف — وَخلّطها بالزبل أو بِالنجاسة
وكل كتاب كان فى أمر ديننا — ففى النار القوه بهزء وحقرة
ولم يتركو افيها كتابا لمسلم — ولا مصحفا يخلى به للقرأة

و من صام اوصلی و یعلم حاله ففی النار یلقوه علی کل حالة
و فی رمضان یفسدون صیامنا بأکل و شرب صرة بعد مرة
وقد امر و ناأ ان نسب نبینا ولا تذکرنه فی رخاء وشدة
فاهًا علی أسمائنا حین وبناتنا یروحون للباط فی کل غدوة
سالنك یا مولای بالله ربنا و بالمصطفیٰ المختار خیر البریة
عسی تنظر و افینا وفیها أصابنا لعل اله العرش یأتی برحمة

ترجمہ:۔

جب ہم ان کے عہد ذمہ داری میں آ گئے تو انہوں نے وعدہ توڑ دیا اور ہم سے غداری کی۔ دشمن نے عہد و پیمان میں خیانت کی جس سے اس نے ہمیں دھوکا دیا تھا اور تشدد سے ہمیں عیسائی بنالیا۔ ہمارے قرآن کریم جلا دیئے گئے اور گوبریا نجاست سے آلودہ کیا۔ ہماری ہر مذہبی کتاب کو تمسخر و حقارت سے آگ میں ڈال دیا۔ جو روزہ رکھتا یا نماز پڑھتا تو معلوم ہونے پر ہر صورت میں اس کو آگ میں جلا دیتے۔ ہمیں انہوں نے مجبور کیا کہ ہم اپنے نبی کو برا بھلا کہیں اور انہیں کسی حال میں یاد نہ کریں۔ ہائے افسوس دین محمدؐ کو روم کے کتوں کے مذہب میں بدل دیا گیا۔ جو بدترین مخلوق ہیں۔ ہائے افسوس ہمارے نام ان غبی رومیوں کے ناموں سے بدل دیئے گئے ہیں۔ ہائے افسوس ہمارے بچے اور بچیاں جن سے صبح شام گندے کام کروائے جاتے ہیں۔ میرے آقا آپ کو اللہ پروردگار اور خیر الخلق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ ہے۔ آپ ہمارے احوال و مصائب پر نظر ڈالیں، ہوسکتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ جو عرش کا مالک ہے ہم پر رحمت فرمائے۔ ۲۶

اندلس کے بارے میں ابوالبقاء صالح بن شیریف الرندی کا مرثیہ قصیدہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں پوری تفصیل کے ساتھ اس وقت کے حالات کا تجزیہ و تنقید ہے۔ مطلع یہ ہے۔

بکل شیی اذا اماتم نقصان فلا یغر بطیب العیش انسان
هی الامور کما شاهد تها دول من سره زمن ساتته ازمان
وهذه الدار لا تبی علی احد ولا یدوم لها علی حال لها شان
یمزق الدهر حتما کل سابغة اذانبت مشرفیات وخرصان

و ینتضی کل سیف للفتاءِ وبو کان ابن ذی یزن والغمد غمدان

ترجمہ:۔

ہر چیز جب مکمل ہو جاتی ہے تو اس کے نقصان کا آغاز ہو جاتا ہے۔ (ہر کمالے را زوالے) اس لیے کسی بھی انسان کو عمدہ زندگی سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے یہ تو بدلتے ہوئے موسم اور حالات ہیں جیسا کہ تم نے مشاہدہ کیا ہے۔ اگر کسی کو ایک زمانہ خوشی دیتا ہے تو کئی زمانے اسے ناگوار لگتے ہیں۔ یہ دنیا ہمیشہ کسی ایک کی نہیں رہتی۔ نہ یہ کسی ایک حالت پر قائم رہتی ہے۔

چیدہ چیدہ اشعار یہ ہیں۔

أتی علی الکل أمد لا مردله حتیٰ فنوا وکان القوم ملکانوا
وصار ماکان من ملك و من ملك کما حکی عن خیال الطیف ونسان

ترجمہ:۔

ان سب پر اللہ کا اٹل حکم فنا آیا تو سب مٹ گئے۔ اب یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ لوگ کبھی تھے ہی نہیں! بادشاہت اور بادشاہ میں سے ہر ایک کا وہی حشر ہوا جو حشر اونگھ کی حالت میں آنے والے لطیف خیال کا ہوتا ہے۔

فجائع الدهر أنواع منوعة وللمن مان مسرات وأحزان
وللحوادث سلوان یهون بها ومالما حل بالاسلام سلوان

ترجمہ:۔

دکھ دینے والی آفات کے زمانے کا سلسلہ نوع در نوع ہے اور زمانہ انسان کو کبھی خوشیاں دکھاتا ہے اور کبھی غموں سے دوچار کر دیتا ہے! ان نوع در نوع حوادث و آفات کے صبر و تسلی کا کچھ سامان ہوتا ہے جس سے ان کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن جو آفات اسلام اور اہل اسلام پر توڑی گئی ہیں۔ ان کے لیے تو کوئی وجہ تسلی یا سامان برقرار ہے ہی نہیں!۔

مسلمانانِ اندلس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بڑا بھیانک اور المناک ہے! اس کے سامنے تمام صدمات ماند اور بے حقیقت ہیں۔ آج مسلمان تاریخ کے دوسرے المیے بیشک بھول چکے ہیں لیکن وہ اس صدمے کو نہیں بھول سکتے۔

تلك المصيبة أنست ما تقدمها ومالها طول الدهر نسيان

یہ تو قیامت خیز مصیبت ہے جس کے سامنے سب سابقہ زمانوں کے مصائب و آلام ناقابل فراموش لگتے ہیں۔ زمانے بیت جائیں گے مگر اسلامی اندلس کے سقوط کے المیہ کو مسلمان کبھی نہیں بھولیں گے۔[20]

ابو عبداللہ غرناطہ کے آخری بادشاہ کے درباری شاعر نے غرناطہ پر عیسائیوں کے قبضہ کے وقت کی منظر کشی کرتے ہوئے جو اشعار کہے ان کا ترجمہ یہ ہے۔

"جس وقت آفتاب افق کی تاریکی میں چھپ رہا تھا۔ غرناطہ میں ہر طرف ایک شہر آشوب حالت برپا تھی۔ بعض تثلیث کی دہائی دے رہے تھے۔ بعض توحید کی پناہ مانگ رہے تھے۔ ایک گروہ قرآن مجید لئے جاتا تھا اور دوسرا صلیب لیے آتا تھا۔ یہاں گرجا کے گھنٹہ کی گونج سنائی دیتی تھی اور وہاں قرنا کی آواز۔ قلعہ الحمراء میں مسیحوں کے مذہبی گیت گائے جانے لگے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہلال کے تمام پھریروں کی بجائے کستالہ اور ارغون کا متحدہ جھنڈا میناروں پر نصب ہوا۔[21]

ایک بادشاہ ایوانِ حکومت خالی کر کے روتا ہوا رخصت ہوا اور دوسرا مظفر و منصور داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیتا ہے۔ رونے والا بادشاہ رخصت ہونے سے پیشتر اپنی سفید داڑھی کو نوچتا اور نوحہ کرتا ہے۔ رخصت اے غرناطہ! اے بے نظیر شہر، اگلے شعروں کا خلاصہ یہ ہے۔ سات سو برس پہلے مسلمانوں نے اندلس میں آ کر حکومت سنبھالی تھی۔ جس نے ان کئی نسلوں کی پرورش کی۔ جس کے سامنے مغرور قسطالیوں نے سر تسلیم خم کیا۔ جو رسول پاک حضرت محمد ﷺ کے نام پر جان قربان کر دیتے تھے۔ لیکن اب ان خوبصورت باغات اور شاندار الحمرا پر تاریکی چھا گئی ہے۔ اب اس کا بادشاہ کسی تنگ و تاریک جگہ پر ماتم کرے گا۔ اور اس کا کوئی ساتھی نہ ہوگا۔[22]

اگرچہ اندلس کی تباہی و بربادی اور المناک المیے پر بیشمار مرثیے کہے گئے ہیں لیکن آج وہ سب موجود نہیں جب ہزاروں کتابیں جلا دی گئیں تو ان کے ساتھ کافی تعداد میں مرثیے بھی ضائع ہو گئے۔ لیکن پھر بھی جو باقی بچے ہیں ان کی تعداد کافی ہے۔ یہاں ان سب کا احاطہ کرنا تو کافی مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی چند درج کئے گئے ہیں۔ سقوط غرناطہ کے بعد مسلمانِ اندلس مراکش، الجزیرہ، تیونس اور قسطنطنیہ میں آباد ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اندلس کی تباہی و بربادی کی المناک داستانیں تمام عالم اسلام میں پھیل گئیں۔ اسلامی تاریخ کے اس خونچکاں باب پر مختلف زبانوں اور

زمانوں میں مرثیے اور نوحے لکھے گئے اردو کے قدیم ادب یا کلاسیکی شاعری میں تو ہمیں کہیں اندلس کا ذکر نہیں ملتا۔

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں جب مسلمانوں میں احیائے علوم اور قومی اصلاح کی تحریکیں شروع ہوئیں تو ان میں از سر نو تاریخی شعور بیدار ہوا۔ انہوں نے مستشرقین کے اصول تحقیق سے آشنا ہو کر اپنے درخشان ماضی کا تحقیقی مطالعہ شروع کیا۔ علامہ شبلی نے تاریخ و سوانح کی کئی بلند پایہ کتابیں جدید اصول تحقیق کے مطابق مرتب کیں۔ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار کے متعلق مغربی تحقیقات کی بعض کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ ان میں اندلس کے متعلق بھی بعض کتابیں تھیں۔

اندلس سے مسلمانوں کے اخراج کا واقعہ ایسا نہ تھا جسے اردو کی قومی شاعری میں جگہ نہ ملتی مسدس حالی ہماری قومی شاعری کا سرچشمہ ہے۔ حالی نے ۱۲۹۶ھ میں جب اسلام کے عروج و زوال کی داستان لکھی تو اندلس کا ذکر کچھ اس موثر پیرائے میں کیا کہ سب کے دلوں میں اس درخشاں عہد کی یاد تازہ ہو گئی۔

ہوا اندلس ان سے گلزار یکسر — جہاں ان کے آثار باقی ہیں اکثر
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر — یہ ہے بیت حمراء کی گویا زباں پر
کہ تھے آلِ عدنان سے میرے بانی
عربوں کی ہوں میں اس زمین پر نشانی

ہویدا ہے غرناطہ سے شوکت ان کی — عیاں ہے بلنسیہ سے قدرت اُن کی
بطلیموس کو یاد ہے عظمت ان کی — ٹپکتی ہے قادس سے حسرت ان کی
نصیب ان کا اشبیلیہ میں سوتا
شب و روز ہے قرطبہ ان کو روتا

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے — مساجد کے محرب و در جا کر دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے — خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے
جلال ان کا کھنڈروں میں یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا [23]

حالی کے معاصرین میں سے بعض ہندوستانی مسلمانوں نے اندلس کی سیاحت بھی کی

مثلاً نواب محمد عمر علی خان نے ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء میں اندلس کے سفر کے بعد سفر نامہ مرتب کر کے شائع کیا۔ سفر نامہ کے آخر میں ایک مرثیہ بھی ہے۔ اشعار سے پہلے یہ پر درد عبارت بطور عنوان درج ہے۔

"ہائے اندلس، ہائے اندلس
تیری یاد میں ہمارے آنسو نہیں تھمتے"

نواب موصوف نے مرثیہ گوئی کی کوشش ضرور کی ہے لیکن ان کے اشعار بالکل بے جان اور فنی لحاظ سے ناقص ہیں۔ لہٰذا یہاں مطلع اور چند اشعار ہی درج کئے جاتے ہیں۔

اندلس پر تھا کبھی فضل رب ذوالمنن
خوب آتی تھی اسے تہذیب و اخلاق مُدن
موجد کیمسٹری والجبرا یہ ہوئے
چڑھ گیا صیقل پہ ان کے ہاتھ سے ہر ایک فن
اس نئی دنیا پر کولمبس سے مدت پیشتر
چند اسلامی مسافر ہو چکے تھے خیمہ زن
قرطبہ کے کالجوں کا فیضان ہے جن کے ہیں عقل کے پتلے جو یہ یورپین
خاک میں گو مل چکی وہ سراسر نیک ذات
پر ہیں لوح دہر پر لکھے ہوئے یہ واقعات

مرثیے کے خاتمے پر نثر میں یوں نوحہ خوانی کی گئی ہے۔ ہائے اسپین کی عمارت! ہائے غرناطہ کے محل! ہائے قرطبہ کی مسجد! الوداع! الوداع! الوداع!۔۲۴

اندلس کی ثقافتی عظمت اور اس کے تاریخی آثار سے اقبال کس حد تک متاثر ہوئے اس کا صحیح اندازہ تو بال جبریل میں موجود ان کی نظموں سے ہوتا ہے۔ جو اندلس کی سیاحت کے دوران میں یا اس کے بعد کہی گئی ہیں۔ لیکن اندلس سے اقبال کی دلچسپی کا ثبوت ان کے ہر دور کے کلام میں ملتا ہے۔ اقبال ابتدا ہی سے اسلامی تاریخ و فلسفہ اور تصوف سے خاص شغف رکھتے تھے۔ عربی زبان و ادب کے طالب علم کی حیثیت سے وہ ہسپانوی عربوں کی علمی و ادبی کاوشوں سے روشناس ہو چکے تھے۔ اقبال کی شاعری کا آغاز اس دور میں ہوا جب انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں حالی، شبلی، نذیر احمد اور کے معاصرین کی اسلامی، تعمیری اور اصلاحی قومی نظموں کی پر جوش

صدائیں گونج رہی تھیں۔ چنانچہ اقبال بھی جو غزل کے میدان میں داغ کی شاگردی پر نازاں تھے۔ حالی کے ہم نوا ہو کر قومی مجالس کو نالہ یتیم اور فریاد امت جیسی نظموں سے گرمانے لگے۔ ان نظموں اور بعض غزلوں میں بھی اپنے اسلاف کا تمام تاریخی ورثہ اور شاندار تمدن ان کے سامنے رہتا ہے۔

یاد ایام سلف تو نے مجھے تڑپا دیا
آہ اے چشم تصور تو نے کیا دکھلا دیا ۲۵

اقبال مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی، فکری اور تعلیمی غلامی سے نہایت دِل برداشتہ تھے۔ انکا دِل اِن حالات کو دیکھ کر کڑھتا تھا۔ اور ساتھ ہی خون کے آنسو روتا تھا۔

جو سامنے تھی مرے قوم کی بُری حالت
اُمڈ گیا مری آنکھوں سے خون کا سیحوں ۲۶
کیوں نہ وہ نغمہ سرائے رشکِ صد فریاد ہو
جو سرودِ عندلیب گلشن برباد ہو ۲۷
ہے ابھی امت مرحوم کا رونا باقی
دیکھ اے بے خودی شوق نہ کر گم مجھ کو ۲۸
کیا کہوں امت مرحوم کی حالت کیا ہے
جس سے برباد ہوئے ہم وہ مصیبت کیا ہے ۲۹

لیکن بتدریج ان کا اندازِ تکلم بدلتا گیا۔ چنانچہ انجمن کے سترھویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۳ فروری ۱۹۰۳ء میں اقبال نے ایک نظم بہ عنوان "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے" پڑھی تھی یہ نظم ترکیب بند کی صورت میں ہے۔ اس کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی علمی روایات کو زندہ رکھنے کے لیے غرناطہ و بغداد کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ان کی اندلس سے ابتدائی اظہار وابستگی ہے۔ یہ پہلے اشعار ہیں جن میں اندلس کو یاد کیا گیا ہے۔

گوش بر آواز تھا مغرب کبھی جس کے لیے
وہ صدا پھر اس زمانے کو سُنا سکتا ہوں میں
ناز تھا جس پر کبھی غرناطہ و بغداد کو
پھر وہی محفل زمانے کو دکھا سکتا ہوں میں ۳۰

علم کا محبوب رونق بخش کا شانہ تو ہو
انجمن اپنی مثالِ بزم جانانہ تو ہو
پھر سماں بندھ جائے گا غرناطہ و بغداد کا
پھر ذرا بھولا ہوا تازہ وہ افسانہ تو ہو
یادگارِ فاتحانِ ہند و اندلس ہو تمہیں
شان شاہانہ نہ ہو میری امیرانہ تو ہو ۳۱

ذہنی پختگی اور اسلامی تاریخ کے وسیع مطالعہ کی بدولت اندلس سے انکی دلچسپی بڑھتی گئی۔ ۱۹۰۸ء میں جب انگلستان گئے تو وہاں براہ راست دنیائے مغرب کے مشاہدے، تاریخی وحقائق ادیان عالم، تاریخ انسانیت اور قوموں کے عروج وزوال کے گہرے مطالعہ کے ساتھ اندلس کی تہذیب وثقافت اور تاریخ کے بارے میں مستشرقین کی تحقیقانہ تصانیف سے بھی استفادہ کیا۔ اقبال کی مغرب، اس کے علوم وفنون اس کی ارتقائی تاریخ اور عہد حاضر میں جو اسے جو عروج حاصل ہوا اس پر گہری نظر تھی۔ اس کے علاوہ ان دنوں اسلامی دنیا پر انگلستان کی سیادت کا ہی غلبہ تھا۔ اس لیے اسلامی ملکوں کے بیشتر علمی خزانے لندن منتقل ہو چکے تھے۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسمان نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا ۳۲

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ اقبال کو اسلام کا ماضی شاندار اور قابل فخر نظر آنے لگا۔ اندلسی عربوں کے علمی احسانات کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

''اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی جب پورے یورپ میں ترقی کا آغاز ہوا یورپ میں علم کا چرچا مسلمانوں ہی کی یونیورسٹیوں سے شروع ہوا تھا۔ ان یونیورسٹیوں میں یورپ کے مختلف ممالک کے طلباء آکر تعلیم حاصل کرتے اور پھر اپنے اپنے حلقے میں علوم وفنون کی اشاعت کرتے تھے۔ کسی یورپین کا یہ کہنا کہ اسلام اور علوم یکجا

نہیں ہو سکتے سراسر ناواقفیت کی بنا پر ہے اور مجھے تعجب ہے کہ علوم اسلام اور تاریخ اسلام کے موجود ہونے کے باوجود کوئی شخص کیونکر کہہ سکتا ہے کہ علوم اور اسلام ایک جگہ نہیں ہو سکتے .....

غرضیکہ تمام اصول جن پر علم جدیدہ کی بنیاد ہے مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ میرا دعوی کہ نہ صرف علوم جدیدہ کے لحاظ سے بلکہ انسان کی زندگی کا کوئی پہلو اور اچھا پہلو ایسا نہیں جن پر اسلام نے اپنا روح پرور اثر نہ ڈالا ہو۔'' ۳۳

ایک اور جگہ اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یورپ میں اسلام کا سیاسی زوال بدقسمتی سے ایسے وقت میں رونما ہوا جب مسلم حکماء کو اس حقیقت کا احساس ہونے لگا تھا کہ استخراجی علوم لایعنی ہیں اور جب وہ استقرائی علوم کی تعمیر کی طرف کسی حد تک مائل ہو چکے تھے۔ دنیائے اسلام میں تحریک ذہنی عملاً اس وقت سے مسدود ہو گئی اور یورپ نے مسلم کے غور وفکر کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونا شروع کیا۔ یورپ میں (جذبہ انسانیت) کی تحریک بڑی حد تک ان قوتوں کا نتیجہ تھی جو اسلامی فکر سے بروئے کار آئیں یہ کہنا مطلقاً مبالغہ نہیں کہ جدید یورپین (جذبہ انسانیت) کا جوشمر جدید سائنس اور فلسفہ کی شکل میں برآمد ہوا ہے اسے کئی لحاظ سے محض اسلامی تمدن کی توسیع پذیری کہا جا سکتا ہے اس اہم حقیقت کا احساس نہ آج کل کے یورپین کو ہے اور نہ مسلمانوں کو، کیونکہ مسلمان حکماء کے جو کارنامے محفوظ ہیں وہ ابھی تک یورپ، ایشیاء، اور افریقہ کے کتب خانوں میں منتشر اور غیر مطبوعہ شکل اور حالتوں میں ہیں۔ آج کل کے مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ایک بڑی حد تک خود ان کے تمدن سے برآمد ہوا ہے وہ اسے بالکل غیر اسلامی تصور کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی مسلم حکیم کو یہ معلوم ہو کہ یہ آئن سٹائن کے نظریہ سے کس قدر ملتے جلتے ہیں ان خیالات پر اسلام کے سائنٹفک حلقوں میں سنجیدگی سے بحث ومباحثے ہوتے تھے تو آئن سٹائن کا موجودہ نظریہ ان کو اتنا اجنبی معلوم نہ ہو اس کے علاوہ جدید استقرائی منطق سے اسے جو بیگانگی ہے۔ وہ کچھ کم ہو جائے اگر اس کو یہ علم ہو کہ جدید منطق کا تمام نظام رازی کے ان مشہور ومعروف اعتراضات سے وجود میں آیا جو انہوں نے ارسطو کی استخراجی منطق پر عائد کیے تھے۔ ۳۴ قرآنی آیات کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمان معلمین اور حکماء نے ارض وسما، کائنات اور مظاہر فطرت کے متعلق غور وفکر پر زور دیا۔ اور استقرائی طریق تحقیق کو ترقی دیکر حقیقت اشیاء کی دریافت شروع کی۔ اس طرح انہوں نے یونانی نظام تصورات کو چھوڑ کر جدید سائنس کی بنیاد رکھی۔ ان مسلمان حکماء نے یونانی فلسفہ کے زہریلے

اثرات کو حیات اجتماعی سے خارج کر کے اسلامی تعلیم کے مطابق عناصر فطرت کی تسخیر کا ذوق پیدا کیا ان ہی کی بصیرت سے یورپ نے فیض حاصل کیا۔ انہوں نے قرطبہ اور اندلس کی دوسری جامعات کے علم و دانش سے بھی اکتساب کیا۔ اہل یورپ ان جامعات سے مستفید ہوئے اور اس طرح ان کی ذہنی نشوونما کے طور طریقوں میں انقلابی تبدیلی پیدا ہوئی اس طرح جدید یورپی تہذیب وتمدن کی بنیاد رکھی گئی۔

آں فتوحات جہانِ ذوق و شوق
ایں فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق
ہر دو انعام خدائے لا یزال
مومناں را آن جمال است، ایں جلال!
حکمتِ اشیا فرنگی زاد نیست
اصل او جز لذتِ ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلمان زادہ است
ایں گہر از دستِ ما افتادہ است
چوں عرب اندر اروپا پرکشاد
علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آن صحرا نشیناں کا شتند
حاصلش افرنگیاں برداشتند
ایں پری از شیشہ اسلاف ماست
باز صیدش کن کہ او از قافِ ماست ۳۵

اقبال نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں ''اسلامی ثقافت کی روح'' میں بری فالٹ کا ایک طویل اقتباس دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ سائنس کی منہاج دراصل مسلمانوں کی دریافت ہے۔ اقتباس درج ہے۔

''یہ آکسفورڈ اسکول میں ان کے جانشین تھے۔ جن سے راجر بیکن نے عربی اور علوم عربیہ کی تعلیم پائی۔ لہٰذا تجربی منہاج کی اشاعت پر فخر کرنے کا حق راجر بیکن کو پہنچتا ہے۔ نہ اس کے مشہور ہم نام کو۔ راجر بیکن کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ مسیحی یورپ میں اس کا شمار اسلامی

سائنس اور منہاج سائنس کے مبلغین سے ہوتا ہے۔ وہ یہ کہتے کبھی نہیں تھکا کہ اس کے معاصرین کو سچ کے علم کی تلاش ہے تو انہیں چاہیے عربی زبان اور عربی علوم کی تحصیل کریں۔ رہی یہ بحث کہ منہاج تجربی کس کی ایجاد ہے ..... سو یہ بھی ایک نمونہ ہے۔ ان زبردست غلط بیانیوں کا جو مغربی تہذیب کے مبداء و ماخذ کے بارے میں کی جاتی ہیں۔ (۶۶) اس لیے کہ بیکن کا زمانہ آیا تو عربوں کا تجربی منہاج سارے یورپ میں پھیل چکا تھا۔ اور لوگ بڑے اشتیاق سے اس طرف بڑھ رہے تھے۔''

''سب سے بڑی خدمت جو عربی تہذیب وثقافت نے جدید دنیا کی کی ہے وہ سائنس ہے، گو کہ اس کے ثمرات بہت آگے چل کر ظاہر ہوئے۔ یہ عفریت اپنی پوری شان اور قوت سے نمودار ہوا تو اس وقت جب اسلامی اندلس تاریکی کے پردوں میں چھپ چکا تھا۔ لیکن یہ صرف سائنس ہی نہیں جس سے یورپ کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اسلامی تہذیب وتمدن کے اور بھی متعدد اور گوناگوں اثرات ہیں۔ جن سے یورپ میں پہلے پہل زندگی نے آب وتاب حاصل کی۔

پھر اگرچہ مغربی تہذیب کا کوئی پہلو نہیں جس سے اسلامی تہذیب وثقافت کے فیصلہ کن اثرات کا پتہ نہ چلے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا اور روشن ثبوت اس طاقت کے ظہور سے ملتا ہے۔ جو عصر حاضر کی مستقل اور نمایاں ترین قوت اور اس کے غلبے اور کارفرمائی کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ ہمارا مطلب ہے علوم طبیعہ اور روح علم کے ظہور سے۔ پھر اگر ہم علوم طبیعہ میں عربوں کے مرہون منت ہیں تو اس لیے نہیں کہ انہوں نے بڑے بڑے انقلاب آفرین نظریوں کی بنا رکھی، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کسی اور چیز یعنی سائنس کی ہستی اور وجود کے لیے۔ دنیائے قدیم کو جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں۔ عہد قبل سائنس کی دنیا تصور کرنا چاہیے اہلِ یونان کے یہاں فلکیات اور ریاضی کی حیثیت ایک باہر سے لائی ہوئی چیز کی ہے۔ جسے یونانی تہذیب وتمدن نے ہمیشہ اجنبیت اور مغائرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ یونانی خیالات میں نظم وترتیب پیدا کرتے، تعلیمات اور نظریوں سے کام لیتے۔ لیکن یہ امر کہ صبر اور محنت سے تحقیق وتدقیق کی طرف قدم اٹھائیں، یہ دیکھیں کہ اثباتی اور قطعی علم بہ دیر اور آہستہ آہستہ تھوڑا تھوڑا کر کے جمع ہوتا ہے۔ سائنس کے منہاجات بڑے نازک اور دقیق ہیں۔ مشاہدات میں ایک ایک چیز پر مسلسل اور مستقلاً نظر رکھنا پڑتی ہے، یہ سب باتیں یونان کے مزاج کے خلاف تھیں۔ بجز ایک استثنا، یعنی اسکندریہ کے کہ یہی ایک مقام تھا جہاں قدیم کلاسیکی

(۶۷) دنیا نے سائنس کا مطالعہ صحیح زاویہ نظر سے کیا۔ لہذا ہم جسے سائنس کہتے ہیں یورپ میں اس کا ظہور تحقیق و تفتیش کی جس نئی روح کی بدولت ہوا وہ نتیجہ تھی اس کے نئے منہاجات تحقیق، منہاج تجربی، مشاہدے، پیمائش اور ریاضی کی ایک ایسی شکل میں نشوونما کا جس سے اہل یونان سرتاسر بے خبر تھے۔ یہ نئی روح اور نئے منہاجات یورپ میں پہلے تو عربوں ہی کے ذریعے ۴۳، علامہ اقبال نے بری فالٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ عرب ہی دورِ جدید کی ترقی کے موجد ہیں۔ بری فالٹ سائنسی اور علمی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کی تین چیزوں کو دیتا ہے جو انہوں نے یورپ کو دیں۔

"The Arabs introduced three inventions into Europe, each of which was to bring about a world transpornation revoluation. The making compass which was to expand Europe to the ends of earth, gun Powder wich was to bring to end the supermacy of the amound knight. and paper which prepared the way for the printing press."44

۱۹ر فروری ۱۹۱۱ء کو "بزم اردو" لاہور کے زیر اہتمام "مجوزہ محمڈن یونیورسٹی" کے بارے میں ایک تقریب ہوئی تو علامہ اقبال نے اندلس میں قرطبہ یونیورسٹی اور علم کے بارے میں یہ کہا:

"سب سے پہلا ثبوت جو شارع علیہ السلام نے علم کے ضروری اور لابدی جزو ہونے کے دیا وہ یہ تھا کہ جنگ بدر کے خواندہ کفار قیدیوں کو اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ ناخواندہ اور جاہل مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ پھر فرمایا کہ ابن عباسؓ نے سب سے پہلے حضرت علی مرتضیٰؓ کے زمانے میں مکہ میں ایک سکول کھولا جس میں قرآن اور حدیث کا درس ہوتا۔ پھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے نظامیہ کالج کی بنیاد ڈالی اور اسی کالج کا ہونہار طالب علم شیخ سعدی جیسا فلاسفر ہو گزرا ہے۔ اور اس کے ثبوت میں شیخ سعدی کا ایک شعر پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد مستنصریہ کالج قائم ہوا۔ مگر تمام کالج ان معنوں میں یونیورسٹی نہ تھے جو موجودہ زمانے کی یونیورسٹی کا مفہوم ہے۔ آخر کار سپین میں ایک بہت بڑی یونیورسٹی (قرطبہ یونیورسٹی) مسلمانوں نے قائم کی۔ اس میں یورپ کی تمام اطراف سے عیسائی آتے تھے اور مستفیض ہوتے تھے۔ آخر کار عیسائیوں نے "قرطبہ یونیورسٹی" کی نقل پر ایک یونیورسٹی پیرس میں قائم کی جو اس وقت تک موجود ہے۔ اس تقریر سے ظاہر کیا کہ یونیورسٹی کا خیال اول اول مسلمانوں میں ہی پیدا ہوا۔ اور عیسائیوں نے

مسلمانوں سے لیا۔ فرمایا سب سے عجیب بات پیرس یونیورسٹی میں یہ تھی کہ اس کے نصاب میں عربی زبان لازمی قرار دی گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تمام علوم و فنون کا خزانہ عربی زبان میں تھا۔ یہاں سے پھر اصل مطلب کی طرف رجوع کیا۔ فرمایا کہ دوسری شق اسلام کی مسلمانوں کا ادب، تمدن، معاشرت، سیاست عربی زبان ہے۔ مگر چونکہ سلطنت ہاتھ سے جاتی رہی اور غیر اقوام کے محکوم ہو گئے اس لئے دوسری قوموں کا تمدن ان کو پڑھنا اور سیکھنا پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اپنا اسلامی شعار اور تمدن بالکل بھول گئے۔"۴۴۔الف

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اندلس سے اقبال کی دلچسپی کا سب سے بڑا سبب مسلمانوں کے قابل فکر علمی اور ثقافتی کارنامے ہیں۔ اقبال نے اپنے اس تاریخی رجحان کی توجیہہ ۱۹۱۲ء کی ایک نظم بہ عنوان "مسلم" میں کی ہے اس زمانے میں اقبال کے نقطہ نظر میں ایک انقلابی تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ سرسید اور حالی نے ہندوستانی مسلمانوں میں قومی شعور پیدا کیا۔ لیکن ان کے فکر و نظر کا دائرہ صرف برعظیم ہندو پاک کے مسلمانوں کے مسائل تک محدود تھا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں وطنیت کے سیاسی تصور نے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں مقبولیت حاصل کی اقبال بھی وطنیت کے گیت گاتے رہے لیکن سفر انگلستان سے واپسی ۱۹۰۸ء کے بعد اقبال نے محدود جغرافیائی قومیت اور وطنیت کے مقابلے میں ملت کے آفاقی تصور کو اپنا مطمح نظر بنایا اب وہ تمام مسائل کو ملی نقطہ نظر سے دیکھنے لگے اور مسلمانوں کو بین الاقوامی اتحاد کا پیغام سنانے لگے۔ اس دور کی متعدد نظموں، مثلاً صقلیہ، بلاد اسلامیہ، گورستان شاہی، شکوہ، جواب شکوہ، خطاب بہ جوانان اسلام وغیرہ میں اقبال نے مسلمانوں کو اسلام کے شاندار ماضی کی یاد دلا کر ان کے ملی شعور کو بیدار کیا ہے۔ مذکورہ نظم "مسلم" بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس نظم میں پہلے شاعر ایک معترض کی حیثیت سے خود اپنے رجحان پر نکتہ چینی کرتا ہے۔

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے
سینہ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے
گوش آوازِ سرودِ رفتہ کا جویا ترا
اور دل ہنگامہ حاضر سے بے پروا ترا
اے درائے کاروانِ خفتہ پا خاموش رہ
ہے بہت یاس آفرین تیری صدا خاموش رہ ۴۵

پھر اس کے جواب میں کہتا ہے کہ میں اپنی ملت کے مستقبل سے ہرگز مایوس نہیں ہوں میں جانتا ہوں کہ یہ افسوسناک حالات بہت جلد بدل جائیں گے اور میری ملت کے مقدر کا ستارہ اسی آب وتاب سے چمکنے لگے گا۔ جیسے ماضی میں چمکا تھا۔ نظم کے آخری تین اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں
اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزاء کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں ۴۶

علامہ اقبال کا انداز جہاں بینی کا تھا۔ انہوں نے اپنے اسلاف کی تمدنی میراث اور روایتی قدروں کا جائزہ لیا۔ ان کے کلام میں ہمارے اسلاف ہماری ملکی وثقافتی تاریخ ہماری گذشتہ اقبال مندی اور شان وشوکت کی تصویریں ملتی ہیں۔ مسلمانوں کی عظمت رفتہ دکھانے کی کوشش اگرچہ حالی وشبلی کر چکے تھے۔ لیکن اقبال کا انداز ایسا تھا جس سے مسلمانوں میں یاس وافسردگی کے عنصر کو دور کرنے میں مدد ملی۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں جن میں ماضی سے محبت کے ساتھ دلِ غم ملت اور دردِ انسانیت سے معمور نظر آتا ہے۔ جو امیدوں کے چراغ روشن کرتا ہے اور خوبصورت مستقبل کے راستے جگمگاتے ہیں۔

میں کہ میری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!
ہاں مگر عالمِ اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیرِ فلک نیلی فام
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
ہے قیامِ بحرِ ہستی جزر و مدِ اسلام کا
گاہے گاہے آ نکلتی ہے مسرت کی ہوا
نہ ہو نومید نومیدی کا علم وعرفان ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں
بے خبر! تو جوہرِ آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے
یقین افراد کا سرمایہ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیر ملت ہے
دلِ مردہ نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

علامہ اقبال نشاۃ ثانیہ اور احیائے ملی کے نقیب اعظم تھے۔ انہیں اردو، فارسی، عربی اور

انگریزی زبانوں سے گہری واقفیت کے ساتھ ساتھ مذہب اسلام اور اس کی تاریخ وتہذیب پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ مشرقی اور مغربی فلسفہ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان کے پاس شاعری کا جو ہر خداداد اور ملتِ اسلامیہ کے لیے بے پناہ درد وسوز سے لبریز دل تھا۔ اس لیے انہوں نے تاریخ اور ماضی کے سمندر سے گوہر نکالے انہیں صاف کر کے اور چمکا کر حیاتِ نوعطا کی انہیں ایسے شہرت بخشی جو چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ اقبال جانتے تھے کہ کسی قوم کی میراث یا تاریخ قوم کے لیے وہی کام دیتی ہے۔ جو حافظہ فرد کے لیے اگرچہ تاریخ اپنی رسمی اور محدود معنی کے لحاظ سے انسانی جماعتوں، نسلوں اور اقوام کے مطالعہ کا نام ہے اس لیے اس کا موازنہ دوسرے طبعی علوم کے ساتھ نہیں ہوسکتا کیونکہ کوئی شخص بھی یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ علوم طبعی کی طرح تاریخ کے نتائج بھی اس قدر درست ہوتے ہیں کہ اس میں صحیح پیشین گوئی کا امکان ہو سکے تاریخ کی بنا تجربوں پر بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ گزشتہ واقعات اور ان کے اسباب وعلل کو دوبارہ وجود میں لانے یا ان کے سلسلے کو منعکس کرنے پر وہ مجبور ہے۔ تاریخ انسان کے ان روزمرہ واقعات سے سروکار رکھتی ہے۔ جن کی نوعیت ہر آن بدلتی رہتی ہے۔ حالات کے اختلافات سے واقعات میں حقیقی انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ جو ابتداً یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ مقولہ کہ ''تاریخ اپنے واقعات کو دہراتی ہے، غلط ہو جاتا ہے''۔ ۴۷

اب یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی نظریہ تاریخ کی بھی قدرے وضاحت کر دی جائے اقبال نے اپنے اشعار میں کہیں کہیں کچھ اشارے ایسے کئے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کو محض واقعات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک تخلیقی قوت قرار دیتے ہیں جو ملت کے وجود میں اعصابی نظام کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے بغیر ملی وجود برقرار نہیں رہ سکتا۔ جس طرح ایک فرد کی خودی، زندگی کے مختلف ادوار اور ہر آن بدلتے ہوئے احوال وکوائف کے باوجود، حافظے کی بدولت اپنے وجود کے تسلسل کو قائم رکھتی ہے۔ گویا تاریخ قوم وملت کا حافظہ ہے۔ اگر ہم تاریخی رشتوں کو ہاتھ سے گنوا دیں اور ماضی کی روایات کا تسلسل ختم ہو جائے تو ہمارے ملی وجود کا شیرازہ منتشر ہو کر رہ جائے گا۔ اقبال نے مثنوی رموز بے خودی میں اپنا نظریہ تاریخ بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

چست تاریخ اے ز خود بیگانہ
داستانے ، قصہ ، افسانہ؟
این تر از خویشتن آگہ کند
آشنائے کار و مردِ رہ کند

روح را سرمایہ تاب است ایں — جسم ملت را چو اعصاب است ایں
ضبط کن تاریخ را پائندہ شو — از نفسہائے رمیدہ زندہ شو
دوش را پیوند با امروز کن — زندگی را مرغ دست آموز کن
سر زنداز ماضی تو حال تو — خیزد از حالِ تو استقبال تو
مشکنیں از خواہی حیات لازوال — رشتہ ماضی ز استقبال و حال ۴۸

اندلس سے اقبال کی گہری دلچسپی کا سبب ان کا یہ نظریہ تھا کہ مسلمانوں کے ملی وجود کے بقاء استحکام کے لیے حال و استقبال کا رشتہ ماضی سے قائم رکھنا ضروری ہے۔ تاریخ ماضی کے مختلف ادوار میں اقبال بالخصوص عربوں کی تاریخ سے بہت زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ تاریخ اسلام کی ابتدائی چند صدیوں میں عربوں نے جوشِ کردار سے انتہائی حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے۔ عرب فاتحوں اور مجاہدوں کی زندگی، جذبہ جہاد اور عمل پیہم کا نمونہ ہوتی تھی۔ جو جوع الارض کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جہاد کرتے تھے۔ حکمرانی کو خلق اللہ کی خدمت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کا طرز تمدن سادہ تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے تہذیب حجازی کی اسلامی اقدار کو اپنے ساتھ لے گئے اور جن ملکوں میں ان کی حکومت قائم ہوئی وہاں کی تہذیب میں حجازی رنگ کی جھلک نمایاں کر دی۔ صقلیہ اور اندلس کی تاریخ میں اقبال کے لیے خاص کشش کا سبب یہی حجازی عنصر تھا۔ ان کی نظم صقلیہ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

رو لے اب دل کھول کر اے دیدہ خونابہ بار!
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار!
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیا نے جن کی تلواروں میں تھے
آفرینش جن کی دنیائے کہن کی تھی اجل
جن کی ہیبت سے لرز جاتے تھے باطل کے محل ۵۰
اک جہان تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغ ناصبور ۴۹

چونکہ اقبال کو اُمتِ مسلمہ کے اقبال و ادبار سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ ماضی، حال اور مستقبل کے اجتماعی مسائل کے بارے میں اپنے کلام میں جا بجا اظہار کیا ہے۔ خاص طور پر عصرِ رواں اور زمانہ حال کے ان واقعات و حوادث کے متعلق جو مسلمانوں کے لیے قومی المیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً مسئلہ فلسطین کا ذکر آتا ہے تو انہیں ارض اندلس بھی یاد آتی ہے۔

رندانِ فرانسیس کا مے خانہ سلامت
پُر ہے مئے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا
ہے خاکِ فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا ؟
مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا ۵۱

اقبال کو نہ صرف اندلس بلکہ ہر اُس ملک سے جہاں مسلمان آباد ہیں ان کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ سے دلچسپی تھی۔ اندلسی مسلمان ایک اعلیٰ تہذیبی و تمدنی ثقافت کو پروان چڑھانے کے ساتھ ایک شاندار ماضی کے مالک تھے۔ چونکہ اقبال کا فکر و فلسفہ شعور و ادراک طرز عمل، نظریات و افکار غرضیکہ تمام چشمہ ہائے علم و فن کی بنا حقیقی اسلام ہے۔ اور ان کے نزدیک اسلامی نظریہ حیات کا اصل اور حقیقی مقصد یہی ہے کہ وہ نظامِ فکر اور تہذیبی و تمدنی لائحہ عمل اختیار کیا جائے جو اسلام کا پیش کردہ ہے اس لیے مسلمانوں کی اعلیٰ تہذیبی روایات کا مسکن ہونے کا سبب اقبال کے لیے اندلس بندِ الہام تھا۔ اور مختلف ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کے درمیان ایک ثقافتی اور ملی اشتراک کا نمونہ ہے۔ کسی بھی خطے پر مصیبت پڑے تو اس کا اثر ہر خطے کے مسلمان محسوس کرتے ہیں۔

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر
آسمان نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی
غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم تیرا
چُن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم تیرا ۵۲

غرناطہ کے برباد ہونے کا غم نہ صرف مسلمانوں کو تھا بلکہ غیر مسلم بھی اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ مشہور مستشرق ڈواک کہتا ہے۔

"قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی بدولت عرب اقلیم یورپ میں شاہانہ کروفر کے ساتھ وارد ہوئے تاکہ ظلمت میں گھری ہوئی انسانیت کے لیے اجالے کا باعث بنیں۔ ہیلاس[53] کے علم وحکمت کو مُردوں میں زندہ کر کے اٹھائیں مشرق کی طرح مغرب کو بھی فلسفہ، طب، فلکیات اور موسیقی کا زریں فن سکھائیں جدید سائنس کی نومولود پرورش کریں اور منظرِ ہستی پر آنے والی صفوں میں ہمارا شمار کروائیں تاکہ ہم اس دِن پر گریہ وزاری کرتے ہیں جبکہ غرناطہ کا خاتمہ ہوا"[54] لیکن اقبال اگر ایک طرف زوال کا شکار ہونے والی مسلم قوم پر گریہ وزاری کرتے ہیں تو دوسری طرف انہیں حوصلہ وتسکین بھی دیتے ہیں۔

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار — رنگہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار
ان زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار — رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار
اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں — دیکھنا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں
ایک صورت نہیں رہتا کسی شے کو قرار — ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار
ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو — مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو[55]

مسلمان اگر زوال کا شکار ہوئے تو کوئی بات نہیں یہ زمانے کا دستور ہے کئی قومیں آئیں تہذیب وثقافت کی بلندی پر پہنچیں اور مٹ گئیں۔

اقبال نے صدیوں کی تاریخ کو بڑے خوبصورت انداز میں ایجاز واختصار کے ساتھ نظم گورستانِ شاہی کے اشعار میں سمویا ہے۔

مصر و بابل مٹ گئے باقی نشان تک بھی نہیں
دفترِ ہستی میں ان کی داستان تک بھی نہیں
آدیا مہرِ ایران کو اجل کی شام نے — عظمتِ یونان وروما لوٹ لی ایام نے
آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا — آسمان سے ابرِ آذری اُٹھا، برسا، گیا[56]

انہیں غرناطہ بھی یاد آجاتا ہے۔

شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت
سطوتِ غرناطہ از ہم یاد رفت[57]

لیکن اقبال چونکہ ملی انانیت ووقارِ حیات اور اُمید وآزادی کا پیغام دیتے ہیں لہٰذا اگلے ہی بند میں یہ اظہارِ خیال کیا ہے۔

ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں
برق ابھی باقی ہے اس کے سینہ خاموش میں
ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور[58]

اگر کسی قوم نے صفحۂ ہستی پر رہنا ہے تو اسے دوسری اقوام کے مقابلے میں اپنی حیثیت برقرار رکھنی ہوگی اور یہ اسی صورت میں اقبال کے نزدیک ممکن ہے جب کوئی قوم اپنی ملی تاریخی اقدار اور خصوصیات کا تحفظ کر لے۔ اس مسئلے کے بارے میں اقبال مثنوی رموزِ بے خودی کے دیباچے میں بڑی تفصیل کے ساتھ دلائل دیتے ہیں۔

"جس طرح حیات افراد میں منفعت، دفعِ مضرت، تعینِ عمل ذوقِ حیاتِ عالیہ احساسِ نفس کی تدریجی نشوونما، اس کی تسلسل توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے۔ اسی طرح ملل واقوام کی حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر "قومی انا" کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی تبائین وتناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔ افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل واستحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لیے بمنزلہ قوتِ حافظہ ہے جو اس کے مختلف مراحل کے حسیات واعمال کو مربوط کر کے قومی انا کا زمانی تسلسل محفوظ وقائم رکھتی ہے۔"[59]

علامہ اقبال کے عہد میں عالمِ اسلام سیاسی، ثقافتی اور عملی تنزلی کے انتہائی نچلے مقام پر پہنچ چکا تھا۔ اس دورِ محکومیت میں مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں مغربی تہذیب وتمدن اور افکار سیاست جگہ بنا چکے تھے۔ اقبال نے اپنے اعلیٰ تخیل، زمانے کے رجحانات سے آگاہی اور مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے صحیح مفہوم سے واقفیت کی بنا پر جو راستہ چُنا اس کی اساس اسلام پر ہے۔ ان کے نزدیک دنیائے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا انحصار اس پر ہے کہ بڑی سختی سے غیر مصالحانہ انداز کی اُس توحید کو اپنا لیا جائے جس کی تعلیم تیرہ سو سال پیشتر عربوں کو دی گئی تھی۔ عجمیت کے

دھندلکے سے نکلو اور عرب کی درخشاں صحرا کی روشن فضا میں آجاؤ''[۶۰]

وہ اپنی دور بین نگاہوں سے جائزہ لیتے ہوئے مسلمانوں کے طرزِ فکر پر حقیقت پسندانہ انداز سے روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔

''افسوس ہے کہ مسلمان مردہ ہو چکے ہیں۔ انحطاطِ ملی نے ان کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اِس وقت مسلمانوں کا ہے مگر ہمیں اپنے ادائے غرض سے کام ہے۔''[۶۱]

علامہ اقبال کو یہ بھی احساس تھا کہ مسلمان اگرچہ مغربی تہذیب سے متاثر ہو رہے ہیں۔ لیکن مغربی تہذیب بھی اندلسی مسلمانوں کی اثر پذیری کا نتیجہ تھی۔ لیکن اب وہ وقت نہیں رہا کہ اسلامی افکار سے یورپ اثر پذیر تھا۔ اب تو عالم اسلام ذہنی طور پر مغرب سے متاثر ہو رہا ہے کیونکہ الٰہیات اسلامیہ پر جمود طاری ہے۔ اقبال کے نزدیک عالمِ اسلام کا مغرب سے متاثر ہونا کوئی بری بات نہیں کیونکہ مغربی تہذیب بھی اسلامی تہذیب کے بعض پہلوؤں کی ترقی یافتہ شکل ہے۔''[۶۲]

اسی طرح کا دور اندلس کے مسلمانوں پر بھی آیا تھا۔ لیکن انہوں نے تہذیبی اور ثقافتی سطح پر شکست نہیں کھائی البتہ سیاسی طور پر ضرور پیچھے رہ گئے۔ (صلیبی جنگوں میں شکست سے دوچار ہونے کے بعد یورپی عیسائیوں نے مسلمانوں کو اندلس سے نکالنے کے لیے اپنی ساری طاقت لگا دی۔ مسلمان اِن سے مار نہ کھاتے اگر اِن کی نسلی اور لسانی عداوتیں رنگ نہ لاتیں اور انہی تنازعات کے بدولت مغربی یورپ مسلمانوں کی یلغار سے محفوظ رہا۔

علامہ اقبالؒ مسلمانانِ اندلس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''مسلمانانِ اندلس ارسطاطالیسی روحیت سے آگاہی کے باعث مغربی اور وسطی ایشیاء کے ضعف انگیز اثراتِ فکر کے دائرے سے باہر تھے۔ وہ ایشیاء کی مسلم قوموں کے مقابلے میں روحِ اسلام سے قریب تر تھے۔ آخر الذکر قوموں نے عربی اسلام کو عجمی تخلیات میں ڈھلنے دیا یہاں تک کہ وہ اپنی حقیقی و اصل حقیقت سے بالکل محروم ہو گیا۔''[۶۳]

علامہ اقبال کو اس بارے میں بڑی تشویش تھی کہ کہیں عالم اسلام سیاسی استعمار کی بالادستی کے باعث مغربی افکار اور تہذیب کو اپنا نہ لیں۔ اس لیے وہ مسلم تہذیب کا نئے حالات کے

مطابق اور اصل اسلامی روح کی فنا کے ساتھ ساتھ مغربی اور اسلامی تہذیب کے تصادم میں اسلامی تہذیب کو زوال اور شکست سے بچانا چاہتے تھے۔ ان کی شاعری اور خیالات اسلامی فکر کا شاہکار ہیں جو اسلامی تاریخ و ادب اور فکر کے عمیق، محققانہ اور عالمانہ مطالعے کے باعث ایک لازوال اسلامی سرمایہ ہے جس نے اس سلسلے میں نمایاں کام کیا۔ علامہ اقبالؒ جانتے تھے کہ وہ قوم شکست سے دوچار ہوتی ہے جو اپنے ذہن و روح پر احساسِ شکست مسلط کر کے اپنی عملی صلاحیتوں کو ناکارہ اور مفلوج بنا دیتی ہے۔ انسانی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ کہ جب کوئی قوم مصائب اور دشواریوں سے دوچار ہوئی تو اس کی صلاحیتیں زیادہ نکھر کر سامنے آئیں۔ آزمائشی اور مشکل دور نے اس قوم کا زیادہ استحکام اور پائیداری سے ہمکنار کیا۔ اقبال بھی عالمِ اسلام کے لیے ایک نئے اور روشن مستقبل کے بارے میں پُر امید ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام ایک ایسی روشنی ہے۔ جو بنی نوع انسان کا مستقبل کامیابی سے روشن کر سکتا ہے۔ جس میں امن محبت اور بھائی چارہ ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنی شعری اور نثری تحریروں کے ذریعے اس خیال کو اجاگر کیا ہے۔ ''اگر عالمِ بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہستیوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا۔''[۶۴]

اس لیے اِن کے نزدیک اسلامی تہذیب ہی دنیا کی راہنمائی کر سکتی ہے۔ اسلامی تہذیب کیا ہے اس بارے میں علامہ قبال کی یہ نظم دیکھئے۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمال جنوں
طلوع ہے صفت آفتاب اس کا غروب
یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں
نہ اس میں عصر رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اِس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں!
حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسم افلاطوں!
عناصر اِس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال
عجم کا حُسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں

علامہ اقبال کو اِس امر پر حیرت ہے کہ اگرچہ مسلمان ایک ہزار سال تک کشور کشائیوں میں مصروف رہے۔لیکن اِس کے باوجود انہوں نے قدیم علم وفنون اور ادب کے خزانوں کو تلاش کر کے اُن کو مزید نکھار کر اور ان میں اضافہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ نیز ایک ایسی فقہ کو ترتیب دیا جس کے مطالب نے ساری دنیا کو یکجہتی کا سبق دیا۔علامہ اقبال کے نزدیک ''اسلامی جماعت کی تاریخ پر جس قدر زیادہ غور کیا جائے گا اسی قدر یہ تاریخ حیرت انگیز اور تعجب خیز نظر آئے گی۔اس دِن سے جب کہ اسلام کا سنگِ بنیاد رکھا گیا سولھویں صدی کے آغاز تک یعنی ایک ہزار سال کا زمانہ اس بے چین قوم نے ملک گیریوں اور جہاں کشائیوں میں صرف کیا اگرچہ اس ہمہ گیر مشغلہ میں منہمک ہونے کے باعث انہیں کسی دوسرے شغل میں فرصت نہ ہوسکتی تھی پھر بھی اسلامی دنیا نے علم وحکمت کے قدیم خزانوں کو ڈھونڈ نکالا اور ان پر اپنی طرف سے معتد بہ اضافہ کر کے ایک عدیم النظر لٹریچر کا سرمایہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس کے علاوہ ایک ایسے جامع ومانع نظام فقہ کو مدون کیا جو اسلامی تمدن کا غالباً سب سے گراں مایہ ترکہ ہے جس طرح جماعتِ مسلمین ان اختلافات کو جن کی بنا رنگ وخون پر ہو تسلیم نہیں کرتی اور دنیا کی تمام نسلوں کو انسانیت کے ہمہ گیر خیال کے سلک میں منسلک کرنا اپنی غائت سمجھے ہوئے ہے۔اس طرح مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی کا معیار بھی عالم گیر ہے اور اُن کا وجود ونشوونما کسی ایک قوم خاص کی دماغی قابلیتوں کا مرہون منت نہیں ہے۔''[٦٦]

علامہ اقبال کو اس امر کا پختہ یقین تھا کہ یورپ کی ترقی میں اندلسی مسلمانوں کا ہاتھ ہے۔اس کی وجہ قیام یورپ کے دوران اقبال کی مغرب، اس کے علوم وفنون اس کی ارتقائی تاریخ، عہد حاضر میں اس کے عروج سے متعلق آگاہی اور مسلمانوں کے ماضی وحال اور مستقبل کے اجتماعی مسائل، عصرِ رواں اور ماضی کے وہ واقعات وحوادث جو اسلامی تاریخ کے متعلق ہیں ان سے پوری واقفیت تھی۔اس لیے وہ مسلمانوں کے یورپ پر اثرات کا جا بجا ذکر کرتے ہیں اور انہیں اسلامی میراث کی توسیع قرار دیتے ہیں۔

..... ''وہ علمی روح جس پر آج یورپ کو ناز ہے قرآن پاک ہی کی پیدا کردہ ہے۔ مسلمان نہ ہوتے تو آج علم وحکمت کا یہ رنگ نہ ہوتا..... استقراء مسلمانوں کی ایجاد ہے۔اسلام ہی نے خیالی کے مقابلے میں حقیقی اور مجرد کے برعکس محسوس پر زور دیا۔تجربہ ومشاہدہ اور علم وعقل کو ادراک حقیقت کا ذریعہ ٹھہرایا انسان کو دعوت دی کہ اپنی استعداد علم سے کام لے۔''[٦٧]

اس کی وضاحت کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں۔

''درحقیت ایک قوم کی فکری تہذیب کی حقیقی روح اس کے فن وصناعی، سائنسی شعبہ جات اور فلسفہ کے آئینہ میں منعکس ہوتی ہے۔لیکن مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر ثقافتِ اسلامیہ کا محقق آج بھی اِس ثقافت کے داخلی معنویت کے فہم وادراک سے بمراحل دور ہے۔نامور فاضل بریفالٹ اپنی تصنیف ''تشکیل انسانیت'' میں (جو ایک ایسی کتاب ہے جسے اقوام عالم کی ثقافتوں کے مطالعہ وجستجو کرنے والے شخص کو پڑھنا چاہئے) اس میں بتاتا ہے کہ تجرباتی طریق سے ہمارا تعارف کروانے کا سہرا نہ روجر بیکن کے سر ہے اور نہ اس کے ہم نام فرانسس بیکن (Francis Bacon) کے سر۔مزید یہ کہ ''بیکن کے عہد تک عربوں کا تجرباتی طریق اچھی طرح شائع ہو چکا تھا۔اور اس کا ذوق وشوق سے اس کی تحصیل اور مطالعہ یورپ کے طول وعرض میں کیا جاتا تھا۔''[٦٨]

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ راجر بیکن جب آکسفورڈ میں عربی کا لیکچر دیتا تھا تو اس کے طلباء جنہوں نے اندلس میں عربی سے براہ راست استفادہ کیا تھا اس کی غلط عربی پر ہنستے تھے راجر بیکن نے عربی علوم کو یورپ میں پھیلانے میں بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا تھا۔[٦٩]

مسلمانوں کے کارہائے نمایاں جو انہوں نے علم وحکمت اور تہذیب وثقافت میں انجام دیئے، اسلامی میراث کا ایک گراں قدر عطیہ ہے اس کے بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں۔

''اب میں تمدن کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کے قومی کارناموں کی قدر وقیمت کا جائزہ لیتا ہوں۔اسلامی دنیا نے جہاں بانی مذہب، ادب، حکمت، درس وتدریس، وقائع نگاری، صنعت وحرفت اور تجارت کی اصناف میں جو جو کام کیا ہے اس کی مبسوط تنقید کئی ضخیم جلدوں کی محتاج ہوگئی۔''[٧٠]

چونکہ مسلمانانِ عالم اور خاص طور پر نوجوان اپنے اسلامی اور اندلسی مشاہیر کے عظیم الشان کارناموں سے زیادہ تر ناواقف ہیں اور مغرب سے مرعوب ہیں اس لیے اقبال ان مسلمانوں کی مغرب سے مرعوبیت اور اپنی قوم کی قابلِ فخر تاریخ سے ناواقفیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''بلاخوف تردید میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا میں کسی قوم نے ایسی اعلیٰ اور قابل تقلید مثالیں، اپنے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے۔لیکن بایں ہمہ ہمارے نوجوانوں کو جو اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہے۔مغربی تہذیب کے مشاہیر سے استحاناً اور استہداءً رجوع کرنا پڑتا ہے۔عقلی اور ادبی لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس کی صحیح

القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے۔ جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر سے پیدا ہوتی ہے۔"[۷۱]

علامہ اقبال چاہتے تھے کہ مسلم نوجوان اپنی اسلامی میراث اور ماضی کی روایات سے باخبر ہوں اور وہ حال و مستقبل کا فیصلہ کرتے ہوئے ماضی کو نظر انداز نہ کریں۔ اور ماضی، حال اور مستقبل کو ایک اکائی کے طور پر دیکھیں۔

علامہ کے نزدیک کوئی قوم اپنے ماضی سے اچانک تعلق اور واسطہ ختم نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کے لیے یہ ماضی کی روایات کے سبب اور بھی مشکل ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کو جدید علوم سیکھنا چاہئیں۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ ان کی تہذیب اسلامی ہو۔"[۷۲]

چونکہ اندلس میں ملتِ اسلامیہ نے ایک شاندار ثقافت کی بنیاد رکھی تھی۔ جس نے یورپ کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ اسے جدید تمدن و ترقی کی طرف گامزن کیا تھا۔ اور علامہ اقبال نے مسلمانوں کے ملی کردار کا فلسفیانہ نگاہ سے جائزہ لیا تھا۔ اس لیے ان کے کلام میں اسلاف کی خودداری ان کا کردار کمال علم و فن اور ان کی عظمت و بہادری نمایاں ہے۔ وہ بار بار اسلاف کے کارہائے نمایاں کی یاد دہراتے ہوئے انہیں بتاتے ہیں کہ اندلس بھی ان کا اپنا گھر تھا۔

باطل سے دبنے والے اے آسمان نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا [۷۳]

اقبال جانتے تھے کہ عزم و یقین کی خوانسانی زندگی کی سب سے زیادہ فعال و موثر قوت ہے۔ مایوس اور مردہ دِل اقوام کرہ ارض پر زیادہ دیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتیں اور اگر کسی قوم کو زندہ رہنا ہے تو ماضی کی روایات سے پاسداری کے ساتھ نباہ کرنا ہوگا۔

دِل مردہ دِل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

علامہ اقبال کو انسانی تہذیب و ثقافت کے احوال و واقعات سے واقفیت، قرآنی بصیرت اور مطالعہ تاریخ کے سبب اقوام و ملل کے عروج و زوال کے اسباب سے آگاہی تھی۔ اس لیے وہ مسلمانوں کو بار بار ماضی کے مطالعے کا درس دیتے ہیں۔

"میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشاف ماضی ہے۔ میں ان لوگوں میں

سے نہیں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں میں تو مستقبل کا معتقد ہوں۔ مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال کو سمجھوں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ چشمہ تہذیب و شائستگی کو سمجھا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ ماضی کو سمجھیں۔ چونکہ ہم جدید تہذیب و شائستگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں اس لیے ہم علوم جدید کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں۔"[۷۴]

اقبال کا یہ انداز ماضی پرستی یا اسلاف پرستی نہیں ہے بلکہ ماضی کی قدیم روایت ان کے نزدیک کارزار حیات میں روشنی کی سی ہے۔ اقبال نے ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی طرف سفر کرتے ہوئے اندلس کی ان جاندار اور حیات افروز تہذیبی اور سیاسی اسلامی روایات کو بھی دوسرے عوامل کے ساتھ پیش نظر رکھا ہے۔ "ماضی سے تعلق قائم رکھنا ضروری ہے، میری پختہ رائے ہے کی قدامت پسندی سے کچھ مقصود ہے تو یہ کہ ہمارا ماضی محفوظ رہے ہم ماضی ہی کو ساتھ لیے آگے بڑھتے ہیں یہ آگے بڑھنا ہی زندگی ہے۔"[۷۵]۔ مزید کہتے ہیں۔

"جب تک کوئی قوم اپنے نصب العین پر قائم رہتی ہے اپنی روایات کو زندہ رکھتی اور اپنے اصل الاصول سے پیچھے نہیں ہٹتی عوام ہے بے رہرو نہیں ہونے پاتے خواص ان کی رہنمائی کرتے ہیں قوم کے وجود ملی کو تقویت پہنچتی اور وہ اپنی ترقی اور کامرانی کی منزلوں میں بامید و اعتماد آگے بڑھتی بلکہ دوسروں کو بھی اپنی طرف کھینچتی ہے۔"[۷۶]

ایک وقت تھا جب علوم و فنون کے تمام راستے عالمِ اسلام کے علاقائی مرکزوں دلی، بخارا، سمرقند، بغداد، قرطبہ اور غرناطہ کی طرف جاتے تھے۔ ان علوم و فنون میں سب سے اہم اور نمایاں شعبہ تعلیم کا تھا۔ جگہ جگہ مدارس قائم تھے۔ تعلیم بغیر کسی معاوضے کے دی جاتی تھی۔ طالب علم بغیر زادِ راہ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے رہتے تھے۔ ہندوستان سے ایران ہوتے ہوئے مراکش اور وہاں سے اندلس پہنچ جاتے تھے۔ اندلسی طلبہ مشرق کا رخ کرتے اور بغیر کسی روک ٹوک کے مشرقی تہذیبی ثقافتی اور علمی مرکزوں میں پہنچ جاتے یہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس اندلس پہنچ کر تعلیمی مرکزوں میں تشنگان علم کی پیاس بجھاتے۔ لیکن علامہ اقبالؒ کے دور میں اور اس سے دو سو سال پیشتر مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی حیثیت اس حد تک زوال پذیر ہو چکی تھی کہ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہی وہ مسلمان ہیں جنہوں نے ایک وقت میں دنیا کی راہنمائی کی

تھی۔ ساری اسلامی دنیا میں مسلمانوں نے زندگی کے ہر شعبے میں آگے بڑھنے کی بجائے ترقی معکوس کی تھی۔

تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر سولھویں صدی عیسوی تک یورپ نے مسلمانوں کے علوم وفنون سے اکتساب فیض کیا۔ لیکن ظاہر نہیں کیا بلکہ اس سارے عمل کو بڑے فنکارانہ طریق سے خفیہ رکھا گیا۔ اکثر مغربی علماء نے عربی کتب کا لاطینی میں ترجمہ کر کے اپنے نام سے پیش کیا۔ لیکن زمانہ حال کی تحقیقات سے انکی اِس دروغ گوئی کا پول کھل رہا ہے۔ یورپ کا علمِ طب کے بارے میں مسلمانوں کی کاوشوں کی قدر نہ کرنے کے بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں۔

''مثلاً طب میں کہ اہل یورپ نے اگرچہ یہ فن مسلمانوں سے سیکھا اسکی علمی اور فنی احساسات کے لیے وہ مسلمانوں کے مرہون منت ہیں۔ لیکن اپنی علمی ترقیات، اجتہادات اور اکتشافات کے زعم میں وہ اپنے پیش روؤں کے سرمایہ معلومات کو خاطر میں نہیں لاتے۔ دواسازی اور غذا کے بارے میں تو اس انداز نے حد درجہ تعصب کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اگر اس کا نام علم ہے تو یہ علم نہیں ہے۔ مسلمانوں سے سبق لینا چاہیئے۔ انہوں نے قدما اقوام کی خدمات کو کبھی اس رنگ میں نہیں دیکھا۔ جیسے اہل یورپ مسلمان اطباء کی خدمات کو دیکھتے ہیں۔ اور خواہ مخواہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے ان کی حیثیت صرف متعین کی تھی[۷۷] ان کے نزدیک اہل یورپ کے یہ خیالات بالکل غلط اور تعصب پر مبنی ہیں۔[۷۸]

اس دور کے یورپی علماء خود عربی کتب کو اپنے ناموں سے دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے لیکن ساتھ ہی وعظ ونصیحت بھی کرتے رہے۔ کہ عربی علوم سے کنارہ کشی کرنی چاہیئے ان میں ایک مثال رایوندوس لولوس (Ramundus Lullus) المتوفی ۱۳۱۵ء کی ہے جس نے کیمیا پر بہت سی کتب تالیف کی ہیں۔ جدید تحقیق کے مطابق وہ عربی الاصل ہیں۔ ابن نفیس ۷۹ کی کتاب کو مائیکل روٹ (۱۵۱۱-۵۳ء) نے اپنی طرف منسوب کیا۔ یہ سولھویں صدی تک فرانس، جرمنی اور اٹلی میں پڑھی جاتی رہی ایک اور نمایاں نام لیونھارٹ فوکس "Lenohart Fuces" (1501-66) کا بھی ہے جس نے عربوں کے خلاف کشاکش بھی جاری رکھی اور ان کی کتابوں کو اپنے نام سے منسوب بھی کیا ایک اور مشہور نام پاراسیلیوس (Paracelius) (1493-1541) کا بھی ہے۔[۸۰] ان مغربی نام نہاد سکالروں کے بارے میں اقبال کہتے ہیں۔

''مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اقوام عالم کے سامنے وضاحت کے ساتھ ان علوم فنون کو

نمایاں کریں جو ان کے بزرگان نے اپنے سنہری عہد میں تحقیق وتخلیق کیے تھے۔ اور جن کی بنا پر دنیا اس عروج کو پہنچ سکی یورپ تو صرف تجاویز بنا کر صرف کوشش اسلام کی عظمت کو پس پشت ڈال رہا ہے اور اپنے علماء کے کارناموں کا ڈھنڈورا پیٹتا رہتا ہے۔ اگرچہ عہد متوسط کے یورپ کے تمام علوم وفنون کے ماخذ اسلامی علوم ہیں اور اکثر اوقات تو وہ عربی کتابوں کے تراجم ہیں جو یورپ کے عالموں نے اپنے نام سے شائع کر دیئے۔''[۸۱]

اقوام کلیسا کو ہمیشہ سے اسلامی اصول وضوابط اور اس کی شاندار وحدتِ ملی اور عالمگیر اخوت سے نفرت رہی ہے۔ اس رواداری اور برابری کے احساس سے متعلق گاڈفرے لکھتا ہے۔

''اگرچہ باختلاف زمان ومکان مسلمان اقوام میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اگر ان کے مشترک اعمال ورسوم اور افعال وآداب نے انہیں بدستور حیاتِ تازہ دی ہوئی ہے۔''[۸۲]

یہی مصنف مزید لکھتا ہے۔ مسلم معاشروں میں گو دولت کی وجہ سے یا منصب کے باعث طبقات پیدا ہو گئے اس کے باوصف برابری اور مساوات کا احساس موجود رہتا ہے۔ جو بڑے حیرت انگیز انداز میں ان کے مشترک رویئے اور آہنگ میں جلوہ گر ہے۔ اسلامی معاشرہ مساوات اور اخوت کا نمائندہ تھا۔[۸۳]

عہد گزشتہ میں نظریہ توحید نے سارے عالمِ اسلام کو ایک نظم وترتیب کے ساتھ یک جہتی عطا کر رکھی تھی عبادات، حقوق ملکیت غرض سب معاملات اس کے زیر اثر تھے۔ اسلامی آئین نے مسلم معاشرے کو قرطبہ (ہسپانیہ) سے لے کر ملتان تک وحدت کی لڑی میں پرو رکھا تھا۔ بلکہ مسلمان فرد کو بھی وحدت عطا کی ہوئی تھی۔ اور اس کی ساری زندگی کو اس پاکیزہ سانچے نے عملاً منضبط اور منظم کر کے ایک بامعنی اور بھرپور کل بنا دیا تھا۔

اقبال کو دوسرے مذاہب اور اسلام میں جو ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے اس کو انہوں نے یوں اشعار کا روپ دیا ہے۔

ملت از یکرنگی دلہاستے — روشن از یک جلوہ ایں سینہاستے
قوم را اندیشہ تا بایدیکے — در ضمیرش مدعا بایدیکے
مدعائے ما مال ما کیست — طرز انداز خیال ما کیست

دنیاوی حالات میں وقت گزرنے کے ساتھ تبدیلات وتغیرات آتے رہتے۔ آخر وہ وقت آیا کہ اسلامی دنیا تو جمود کی تاریکی میں ڈوب گئی۔ جبکہ مغرب نے تحریک احیائے العلوم کی

روشنی میں جدید دنیا کی طرف سفر شروع کر دیا۔ سائنس اور فلسفہ کے علوم کے ذریعے، اوہام و خرافات کو ایک طرف رکھ دیا۔ جبکہ مسلمانوں نے اوہام و خرافات کے دامن میں پناہ لے لی۔ ایک وقت میں مسلمانوں کا بحری گزرگاہوں پر قبضہ تھا۔ اور انہیں سمندروں پر پوری بالادستی حاصل تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ بحرہ روم کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک مغربی ملکوں کے حملوں اور دوسری طرف وسطی ایشیاء کے نیم وحشی اقوام نے اسلامی حکومتوں کا تاخت وتاراج کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح سمندروں سے ان کی بالادستی بھی ختم ہوگئی۔ پہلے تجارتی قافلے مشرق سے مغرب کو جاتے تھے اب یورپ میں صنعتی ترقی کی بدولت اسے نئی منڈیوں کی تلاش ہوئی اس نے آہستہ آہستہ ایک طرف نئی دنیا (امریکہ) اور دوسری طرف افریقہ وایشیاء کے اکثر ممالک پر اپنا تجارتی اور سیاسی تسلط جما لیا۔ مسلمان مذہب سے ناواقفیت، معاشرتی تنزلی، فوجی و سیاسی کمزوری، اقتصادی زبوں حالی اور آپس کے نفاق کی بدولت ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ وہ مسلم ممالک پر اگرچہ ایک صدی پیشتر بھی قبضہ کر سکتے تھے لیکن مسلمانوں کی بہادری کے خوف سے وہ ایسا نہ کر سکے اور آخر بڑی آسانی کے ساتھ سارے عالمِ اسلام کو اپنے خونی پنجوں میں جکڑ لیا۔ تین ہزار انگریزوں نے بنگال سے شروع ہو کر تمام ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔

اندلس میں مسلمانوں کے زوال و اخراج کے اسباب میں ایسے تعصّبات کام کر رہے تھے جن کی بنیاد غرور نسب، جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل کے امتیازات پر تھی۔ آپس کی تباہ کاریاں، ہلاکت آفرینیاں اور خون آشامیاں بھی ہیں۔ اگرچہ اندلسی ریاستیں علمی اور تہذیبی طور پر بلندی کے اونچے مقام پر تھیں لیکن سیاسی بالادستی نہ ہونے کے باعث مغربی تمدن اور تہذیب کے نشو ونما اور ارتقاء نے اندلس سے عربوں کے غلبہ اور ہمہ گیر تسلط کو ختم کرنے کے ساتھ ان کے تہذیبی و علمی کارنامے بھی دھندلکے میں چھپا دیئے۔ آخر سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں بعض مستشرقین نے کوشش کی کہ اسلامی اور عربی علوم کو اِن کا جائز مقام دیں۔ ان میں اہم ترین جیکب رسکے Jakob Rosk (۱۷۱۶-۷۴) کرٹ پرنگل اور گوئے (1733-1749) ۸۵ ہیں۔ علامہ اقبال جب یورپ گئے تو اس وقت اِن سب کی تحقیقات منظر عام پر آ چکی تھیں۔ جن کی بنا پر عالمِ اسلام میں فکری، تہذیبی اور سیاسی تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ اس طرح اکثر نقادانِ اقبال کا یہ کہنا درست ہے کہ یورپ سے ایک نیا اقبال واپس آیا۔ جس کے پیشِ نظر عالمِ اسلام کی نشاۃ ثانیہ تھی۔ علامہ اقبال سے مسلمانوں کی تہذیبی میراث اور روائتی قدروں کا از سرِ نو جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ

ان کو ان کے عظیم الشان کارناموں سے بھی آگاہ کیا۔ یورپ واپسی پر انہوں نے بلادِ اسلامیہ کے عنوان سے جو نظم لکھی اس میں اندلس کا یورپی تہذیب پر اثر کا بھی ذکر ہے۔

ہے زمین قرطبہ بھی دیدہ مسلم کا نور — ظلمت مغرب میں جو روشن تھی مثل شمعِ طور
بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشان کر گئی — اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی ۸۶
قبر اس تہذیب کی یہ سرزمین پاک ہے — جس سے تاکِ گلشنِ یورپ کی رگ نمناک ہے

مسلمانوں نے آٹھ سو سال اندلس میں حکمرانی کی اور تقریباً سو سال سے زیادہ بطور محکوم رہے۔ ان کے دورِ حکومت میں مسلمانوں کی درسگاہوں نے یورپ کو تفکر و تدبر، شعور و طلب، اور تجزیہ و تجربہ سے آگاہ کیا۔ لیکن خود آہستہ آہستہ اس سے دور ہوتے گئے۔

علامہ اقبال نے جب اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا تو اس مطالعے کے دوران انہیں عربی کتب اور مستشرقین کی تحقیقات سے اخذ و استفادہ کا موقع ملا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ ذوقِ علم سے محروم ہو گئے تھے۔ علامہ نے اس کی دو وجوہ بیان کی ہیں ایک وحدت الوجود کا عقیدہ جو دورِ زوال میں تمام عالمِ اسلام پر چھا گیا اور دوسرا تقدیر کا غلط تصور یعنی انسان کے جملہ اعمال و افعال خیر و شر پہلے ہی سے متعین کئے جا چکے ہیں۔ لہٰذا تقدیر کے خلاف کچھ کرنا سراسر نادانی ہے۔ اس بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں۔

"دنیائے قدیم کی تاریخ ذہنی کے مطالعہ سے یہ نہایت اہم حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے گی کہ زوال پذیر قوموں اور گروہوں نے ہر دور میں اس خود ساختہ تصوف اور فنائیت کی اوٹ میں پناہ لی ہے جب روح حیات فنا ہو جاتی ہے اور زمان و مکاں کے مسائل سے دست و گریباں ہونے کی ہمت باقی نہیں رہتی تو داعیان انحطاط ایک مزعومہ ولایت و سرمدیت کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح اپنے معاشرے کی روحانی بے مائیگی اور جسمانی فرسودگی کو آخری مرحلے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ بظاہر ایک لبھا لینے والا نصب العین وضع کر لیتے ہیں جس کے فریب میں مبتلا ہو کر ہمت مند اور قوی افراد بھی رفتہ رفتہ موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کا نظام ایک خاص نوعیت کا ہے جسے اوہام و وساوس کے ان باتوں نے شدید نقصان پہنچایا ہے۔" ۸۷

علامہ اقبال نے اندلسی عربوں اور ایرانیوں کے افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کے اثرات کا جائزہ بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں لیا ہے وہ سمجھتے ہیں۔

"اس بات کو معلوم کرنا بہت ہی دلچسپ ہے کہ ایرانی ذہن نے نوفلاطونیت کے نظریہ

صدور سے کس طرح بتدریج چھٹکارا حاصل کیا اور افلاطون کے فلسفہ کے خالص تصور تک کس طرح پہنچا ہسپانیہ کے عرب مسلمانوں نے بھی اسی قسم کے الفاظ کے ذریعے سے اور اسی وسیلہ (نوفلاطونیت) سے ارسطو کے فلسفہ کا صحیح تصور حاصل کیا تھا۔ یہ ایسا واقعہ ہے جس سے اِن دونوں نسلوں کی اجتہادِ فکر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ لیوس اپنی سوانح تاریخ فلسفہ میں کہتا ہے کہ عربوں نے ارسطو کے فلسفہ کا نہایت شوق سے اس لیے مطالعہ کیا کہ افلاطون کا فلسفہ ان تک پہنچا ہی نہیں تھا۔ بہر حال میں اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ عربوں کی ذہنیت بالکل عملی تھی اور اسی لیے افلاطون کا فلسفہ اگر وہ صحیح روشنی میں بھی ان کے آگے پیش کیا جاتا تب بھی ان کے مذاق کے خلاف تھا۔ میرا یقین ہے کہ یونانی فلسفہ کے نظامات میں سے صرف نوفلاطونیت ہی اسلامی دنیا کے آگے پوری جامعیت کے ساتھ پیش ہوئی تھی پھر بھی ناقدانہ تحقیق و تفتیش نے عربوں کا رخ فلاطینوس سے ارسطو کی طرف اور ایرانیوں کا رخ افلاطون کی طرف پھیر دیا'' ۸۸

علامہ اقبال نے قیام یورپ کے دوران ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ جو لندن کے مشہور رسالہ ''سوشولوجیکل ریویو'' میں شائع ہوا تھا۔ عنوان تھا ''خلافتِ اسلامیہ'' اس میں انتخاب کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اندلس کے بارے میں کہتے ہیں۔

''شومئی قسمت سے مسلمانوں نے انتخاب کے مسئلہ کی طرف کما حقہ توجہ نہیں کی اور خالص جمہوری بناؤں پر اصول انتخاب کے مسئلہ کو فروغ دینے کی سعی سے قاصر رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمان فاتحین ایشیاء کے سیاسی نشو و ارتقاء کے لیے مطلقاً کچھ نہ کر سکے۔ بغداد اور اندلس میں بے شک بظاہر اصولِ انتخاب کی ہیت کو قائم رکھا گیا۔ لیکن اس قسم کے باقاعدہ کوئی سیاسی نظام قائم نہ کیے گئے جن سے بحیثیت مجموعی قوم کو استحکام و استقرار نصیب ہو۔'' ۸۹

مختلف اسلامی صوبوں میں دمشق سے والی مقرر ہوتے تھے۔ خلیفہ دمشق افریقہ کا والی مقرر کرتا اور والی افریقہ اندلس کا امیر اور اندلس کا امیر سسلی کا نائب امیر کا تقرر کرتا۔ علامہ اقبال اس سلسلہ میں کہتے ہیں۔

''مثلاً سسلی کے نائب والی کو اندلس کا والی مقرر کیا کرتا تھا۔ اس نظام سے حقیقت میں مدعا یہ تھا کہ مختلف صوبوں میں خود اختیاری اسلامی مستعمرات قائم کی جائیں۔ دوسرے لفظوں میں صوبہ کا والی اپنے صوبہ کے اندر ایک چھوٹے پیمانے پر خلیفہ ہوتا تھا۔'' ۹۰

سسلی بھی اندلس کا ہی انتظامی اور تہذیبی طور پر حصہ تھا۔ اس لیے وہاں کی ثقافت

اندلس ہی کی ثقافت تھی۔ مشہور سپہ سالار اور فاتح سسلی قاضی اسد بن فرات غرناطہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جغرافیہ دان الادریسی قرطبہ یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کر کے سسلی کے نارمن دربار سے وابستہ ہوا تھا۔ مسلمانوں نے ہر صوبے میں شیخ الاسلام کا عہدہ قائم کیا تھا۔ علامہ اقبال اس عہدے کی تعریف کرتے ہیں کہ نارمنوں نے اپنے عہد حکومت میں مسلمانون کے بعد بھی سسلی میں اس عہدے کو برقرار رکھا تھا۔ ۹۱

قیام یورپ میں ہی جب علامہ اقبال کی فکر نے نیا رخ اختیار کیا تو انہوں نے وطن واپس آتے ہوئے سسلی کا مرثیہ کہا اور اپنے آپ کو اس کی مرثیہ خوانی کے لیے منتخب کیا۔ اسی نظم میں بغداد، دِلی، اور غرناطہ کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے ان شعراء کا نام لیا ہے جنہوں نے ان شہروں کے مرثیے کہے تھے۔ لیکن اقبال اپنے آپ کو اندلس کی جڑواں بہن یعنی سسلی کی موت کے جانکاہ حادثہ کا ماتم گسار میں کہتے ہیں۔

رو لے اب دِل کھول کے اے دیدہ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم تیرا
چُن لیا تقدیر نے وہ دِل کہ تھا محرم ترا ۹۳

ایام زیست کے آخری دور میں اقبال کی اندلس میں دلچسپی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ جب بھی مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا تو اکثر اندلس کا ذکر ضرور آ جاتا یا خود ہی اندلس کی تاریخ کے واقعات سننے کی فرمائش کرتے۔ جب انہیں اندلس کے نامور حکمران المنصور ابن عامر کا دلچسپ قصہ سنایا جو ایک طالب علم کی حیثیت سے جامعہ قرطبہ میں پڑھتا تھا اور اسی دوران اس نے اپنے چار طالب علم دوستوں کو کہا تھا کہ میں اندلس کا بادشاہ بن جاؤں گا تو جو عہدہ یا منصب چاہتے ہو تو بتاؤ جو جو کسی نے کہا بادشاہ بننے کے بعد ابن ابی عامر نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا۔ یہ قصہ انتہائی دلچسپ ہے یہ قصہ سننے کے بعد اقبال نے کہا

''اِسلامی اندلس، اِسلامی اندلس کا علم و فضل اور اسلامی اندلس کی تہذیب و تمدن بجائے خود ایک افسانہ ہے وہ جو کہتے ہیں کہ حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے تو یہ مثل اندلس پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے'' ۹۴

اندلس اور صقلیہ سے مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے بارے میں اقبال کی رائے تھی

کہ اندلس اور صقلیہ سے مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ایک جز کی تباہی تھی۔ امت کا وجود تو قائم ہے البتہ یہ کہ قرآن کے مطابق قومیں پیدا بھی ہوتی ہیں اور مرتی بھی ہیں اس بارے میں کہتے ہیں۔

''قومیں پیدا ہوتی ہیں اور مرجاتی ہیں یہ ایک آسان سی بات ہے جو سمجھ میں آجاتی ہے لیکن بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ قوم کی ہستی تو قائم رہتی ہے لیکن بظاہر یوں نظر آتا ہے کوئی قوم دوبارہ کیسے زندہ ہوسکتی ہے اس کے بارے میں کہتے ہیں۔

لیکن یہ موت زندگی سے بدل سکتی ہے۔ بشرطیکہ ہم اپنے اندرون ذات میں تبدیلی پیدا کریں۔ یعنی اس مقام پر واپس آجائیں جس سے چلے تھے۔[95] اقبال کے نزدیک قوم کی موت اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے اصولِ زندگی کو چھوڑ دیں اور چونکہ اسلام اسلام کی بدولت وجود میں آیا اس کی ہستی اسلام سے وابستہ ہے اور اسلام ہی کی بدولت اس میں بھرپور زندگی پیدا ہوگی۔[96]

''اسلام بھی ایک حقیقت ہے اور یہ حقیقت ہمیشہ قائم رہے گی لہٰذا باوجود زوال و انحطاط عالمِ اسلام بھی پھر زندہ ہوگا اور ضرور ہوگا''۔[97]

علامہ اقبال کی نزدیک اسلام ہی دنیا کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتا ہے کیونکہ ''اسلام کی دعوت عالمگیر ہے اور اس کی نظر فطرتِ انسانی پر'' دین اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے کوئی مبہم اور محدود اخلاقی تصور نہیں ہے۔ نہ مجرد الفاظ میں عالمِ کائنات کا ایک مابعد الطبعی نظریہ ۔۔۔ اسلام کے نزدیک جس طرح فرد کا ایک مرتبہ و مقام ہے۔ بعینہ معاشرے کی بھی ایک خاص ہیت اور نصب العین ہے وہ ایک تحریک ہے۔ عام انسان کے ربط وضبط اس کے اتحاد اور حفظ و استحکام کی۔ لہٰذا اسلام ہی اخوتِ عامہ اور حریت ومساوات کی عملی ترجمانی کا واحد ذریعہ ہے۔[98]

مزید فرماتے ہیں۔

''اسلام ہی وہ تحریک ہے جس نے ان ابدی اور عالمگیر صداقتوں کی بنا پر۔۔۔ ایک ایسے اجتماع بشری کی تعمیر میں قدم اُٹھایا جس کی روح خالصتاً انسانی ہے۔ اور دامن امتیازات نسل وطن سے پاک۔۔۔ اس نے ہر صداقت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے جملہ ادیان پر برتری حاصل ہے۔''[99]

یورپ میں دورانِ مطالعہ خاص طور پر تاریخ اندلس اور مستشرقین کی تحقیقات سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے۔

''یہ عالم اسلام ہی تھا جس نے وہ شرائط بہم پہنچائیں جن پر علم کی ترقی اور نشوونما کا دارومدار ہے یہ شرائط کیا تھیں۔ مشاہدہ، معائنہ، فکر ونظر، محسوس اور مرئی کا احترام، تجربہ، تحقیق، تفتیش، حقائق کا اثبات، ان کا مطالعہ اور ان کی مسلسل تاویل وتعبیر۔ یہ شرائط پوری نہ ہوتیں تو علم کا راستہ دیر تک رُکا رہتا۔۔۔۔''[100]

''مسلمانوں نے بھی تو کبھی اپنے اردگرد کی دنیا سے اور سوچنے کی بات کی ہے کہ یہ دنیا معرض زوال میں تھی تو علم وحکمت کا اکتساب کیا تھا مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس شان سے آگے بڑھے کہ علم وحکمت کی کائنات ہی بدل دی علم کو صحیح معنوں میں علم کا درجہ عطا کیا۔[101]

اقبال جانتے تھے اگر مسلمانوں کو اپنی موجودہ حالت تبدیل کرنی ہے اور بلندی کے سابقہ مدارج پر پہنچنا ہے تو انہیں ماضی کی عظیم روایات اور اندلس کی اسلامی میراث سے آگاہی حاصل کرنا ہوگی۔ اس لیے وہ مسلمانوں کو اندلس کی تاریخ کے مطالعے پر خاص زور دیتے تھے اور کہتے تھے۔ ''مسلمان اپنی ساری تاریخ سے بے خبر ہیں اور اندلس کی تاریخ کے بارے میں اقبال کی رائے ہے۔

''اسپین کو اسلامی تاریخ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ لیکن اسپین کی تاریخ ابھی تک پردہ اخفاء میں ہے۔''[102] غرضیکہ شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یا فنون لطیفہ کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال کے سامنے اکثر مسلمانان اندلس کے کارنامے آجاتے۔ آرٹ کے متعلق کہتے ہیں۔

''آرٹ اقوامِ عالم کی زندگی کا عکس ہے کسی قوم کے آرٹ کو دیکھ کر اُس قوم کی نفسیاتی کیفیتوں کا صحیح نقشہ کھنچا جاسکتا ہے۔ لیکن آرٹ زندگی کا مظہر ہی نہیں زندگی کا آلہ کار بھی ہے اور سچا آرٹسٹ وہ ہے جو اپنے کمالِ فن کو بنی نوعِ انسان کی بہتری کے لیے وقف کرے۔''[103]

قرطبہ کی مسجد میں شکوہ، سربلندی اور تمکنت کیوں ہے؟ اس کا جواب بال جبریل کی نظم مسجد قرطبہ میں خود ہی دیتے ہیں۔

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اس کے علاوہ فن تعمیر علامہ اقبال کے نزدیک رسول کریم ﷺ کی تجلیات میں سے ہے۔ اِس کا اظہار انہوں نے بعنوان حرفے چند امت عربیہ پس چہ باید کرے اے اقوام شرق میں کیا ہے۔

حسنِ عالم سوزِ الحمرا و تاج — آنکہ از قدسیاں گیرد خراج
ایں ہمہ یک لحظہ از اوقات اوست — یک تجلی از تجلیات اوست
ظاہرش ایں جلوہ ہائے دلفروز — باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز ۱۰۷

علامہ اقبال کا یہ خیال بھی درست ہے کہ اندلس کی تاریخ ابھی گوشہ گمنامی میں ہے۔ اِس صدی میں ہی مستشرقین نے مسلمانوں کا تمام اپلیس پر قبضہ ہونا ثابت کیا ہے۔ یعنی نویں اور دسویں صدی میں اندلسی مسلمانوں کے مختلف گروہ شمالی اٹلی، جنوبی فرانس، سوئٹزرلینڈ، مشرقی جرمنی اور آسٹریا پر حکومت کر رہے تھے۔ مگر اس کا ذکر مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں ملتا۔

مسلمانوں کے زوال سے نکلنے کے بارے میں جو بھی تحریک اٹھی اُس کی بنیاد صرف مذہبی اصلاح ہی نہ تھی۔ علامہ اقبال نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سیاسی، معاشرتی، سماجی اور کئی دوسرے عوامل کو بھی مدنظر رکھا۔ علامہ اقبال چاہتے تھے کہ مسلمان اندلس کی تاریخ اور اسلامی میراث سے آگاہی حاصل کریں۔ اس لیے جب اندلس کی اسلامی میراث کے بارے میں موازنہ ''صلیب و ہلال'' شائع ہوئی تو علامہ اقبال نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ قومی احیاء کی خاطر تمام مسلمانوں کے لیے بہت مفید ہے۔'' ۱۰۷

۱۹۳۱ء میں کانپور میں مسلم کش فسادات کے خلاف ایک اخباری بیان دیا جس میں ہندوستان کے مسلمانوں کو ان مسلمانوں کی مدد کے لیے کہا گیا اور آخر میں کہا ''..... خدانخواستہ یہ خیال اگر دشمنوں کے دِل میں پختہ ہو گیا تو وہ دِن ہر مسلمان کے لیے مصیبت کا ہوگا اور چین والا نظارہ ہندوستان میں نظر آنا کچھ بعید نہ ہوگا۔'' ۱۰۸

☆☆☆

حواشی

(۱) صلاح الدین احمد، ادبی دنیا، مئی ۱۹۵۳ء۔ ص۔ ۴۷۱۔
(۲) محمد یوسف ڈاکٹر۔ اندلس تاریخ و ادب، مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۶۹ء۔ ص ۷
(۳) احمد زیات تاریخ و ادب عربی، مترجم عبدالرحمٰن، طاہر سورتی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور سن ندارد۔ ص۔ ۴۵۸
(۴) محمد یوسف ڈاکٹر کتاب مذکور، ص ۹۱/۹۲
(۵) اندلس کا تاریخی جغرافیہ، محمد عنایت اللہ، طبع جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن، ۱۹۷۲ء ص ۳۱۲
(۶) ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، مرثیہ صقلیہ پر ایک نظر، بزمِ اقبال، لاہری ۱۹۹۳ء ص 68,69,70
(۷) ٹی۔ جے۔ ووبوٹر۔ تاریخ فلسفہء اسلام، مترجم ڈاکٹر عابد حسین، نفیس اکیڈمی کراچی۔ ص ۱۵۵۔۱۵۶
(۸) ظہور احمد اظہر کتاب مذکور۔ ص ۷۰۔۷۱۔۷۲
(۹) الخطیب، احاطہ فی اخبارِ غرناطہ۔ ترجمہ مولوی سید احمد ندوی طبع جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۹۳۱ء۔ ص۔ ۲۴۵
(۱۰) لین پول مسلمان اندلس میں مترجم حامد علی صدیقی۔ ایچ۔ ایم کمپنی کراچی۔ سند ندارد ص۔ ۲۷۲/۲۷۳۔
(۱۱) ایضاً۔ ص۔ ۲۷۴
(۱۲) ایضاً۔ ص ۳۲۱۔۳۲۲
(۱۳) ظہور احمد کتاب مذکور۔ ۷۴۔۷۵
(۱۴) ایضاً۔ ص۔ ۷۹
(۱۵) ایضاً، ص ۷۴
(۱۶) ایضاً۔ ص۔ ۷۷۔۷۸
(۱۷) ایضاً۔ ص۔ ۷۹
(۱۸) ایضاً۔ ص۔ ۸۱

(۱۹) ایضاً۔ص۔۸۱۔۸۲
(۲۰) ایضاً۔ص۔۸۳
(۲۱) لین پول۔ص۔۳۳۴
(۲۲) ایضاً۔ص۔۳۳۵
(۲۳) الطاف حسین حالی، مسدسِ حالی طبع لاہور، ۱۹۲۸ء ص۔۲۸۔۲۹
(۲۴) محمد عمر علی خان نواب۔قند مغربی، طبع۔کانپور ۱۸۹۸ء۔ص۔۱۵۴۔۱۵۵
(۲۵) اقبال باقیاتِ اقبال، مرتب عبدالودود یخی، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۷۸ء۔ص۔۴۰
(۲۶) ایضاً۔ص۔۲۸
(۲۷) ایضاً۔ص۔۳۵
(۲۸) ایضاً۔ص۔۱۵۳
(۲۹) ایضاً۔ص۔۱۵۴
(۳۰) ایضاً۔ص۔۱۲
(۳۱) ایضاً۔ص۔۱۲۷۔۱۲۸
(۳۲) اقبال بانگِ درا۔ص۔۱۹۸
(۳۳) اقبال مقالاتِ اقبال۔ص۔۲۳۹
(۳۴) غلام دستگیر، فکر اقبال۔حیدر آباد دکن ۱۹۴۵ء۔ص۔۹۲
(۳۵) اقبال، پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق۔ص۔۸۴
(۳۶) اقبال تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ، ترجمہ نذیر نیازی بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۸۶ء۔
ص۔۱۹۹۔۲۰۰۔۲۰۱
(37) Briffult, robert, the making humanity, Book foundation Lahore, 1980, Page : 206
(۳۸) اقبال بانگِ درا۔ص۔۲۱۶
(۳۹) ایضاً۔ص۔۲۱۷
(۴۰) اقبال کلیاتِ اقبال (اردو) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۵ء لاہور، ۱۹۷۵۔ص۔۴۰۵
(۴۱) ایضاً۔ص۔۵۱۸۔

(۴۲) اقبال بانگِ درا۔ص۔۲۱۸
(۴۳) اقبال باقیاتِ اقبال۔ص۔۳۶
(۴۴) اقبال بانگِ درا۔ص۔۲۱۳
(۴۴۔الف) علامہ اقبال سے متعلق غیر مدون تحریریں۔افضل حق قریشی ص ۸۳۔۸۲ مجلس ترقی ادب لاہور۔
(۴۵) ایضاً۔ص۔۔۳۱۱
(۴۶) اقبال، کلیات اقبال۔ص۔۴۹۸
(۴۷) ڈبلیو۔اے۔بیٹ لینڈ، تاریخ جمہوریہ روما، مترجم مولوی احمد انصاری، طبع جامعہ عثمانیہ حیدر آباد۔۱۹۲۶ء۔ص۔۱۰۰۔۱۰۱۔۱۰۲
(۴۸) اقبال، رموزِ بے خودی ۔ بہ اہتمام حکیم فقیر محمد چشتی۔ لاہور۔۱۹۱۸ء ص۔
۱۰۰۔۱۰۱۔۱۰۲
(۴۹) اقبال، بانگِ درا۔ص۔۱۴۱
(۵۰) جلیل احمد قدوائی۔رسالہ اردو۔اقبال کی بعض نظموں کے ابتدائی متن، اکتوبر ۱۹۰۲ء ص۔۱۲۴
(۵۱) اقبال، ضربِ کلیم۔ص۔۱۵۶
(۵۲) اقبال، بانگ درا۔ص۔۱۴۲
(۵۳) یونان کا قدیم نام
(۵۴) محمد شریف میاں، مسلمانوں کے افکار، مجلس ترقی لاہور۔سن ندارد۔ص۔۱۱
(۵۵) اقبال، بانگِ درا۔ص۔۱۶۳
(۵۶) ایضاً۔ص۔۱۶۴
(۵۷) اقبال کلیات اقبال فارسی، ص۔۱۴
(۵۸) اقبال بانگِ درا، ص۔۱۶۳
(۵۹) اقبال۔رموزِ بے خودی، دیباچہ
(۶۰) عبدالواحد معینی، مقالات اقبال۔ص۔۳۳
(۶۱) عطاء اللہ شیخ، اقبال نامہ (حصہ اول) شیخ محمد اشرف۔لاہور، ۱۹۵۱ء، ص۔۳۴
(۶۲) اقبال، تشکیل جدید، ص۔۱۱
(۶۳) عبدالواحد معینی، مقالات اقبال۔ص۔۳۰۲

(۶۴) ایضاً۔ص۔۶۶۵

(۶۵) اقبال، ضربِ کلیم۔ص۴۸

(۶۶) عبدالواحد معینی، کتاب مذکور۔ص۔۳۳۵

(۶۷) اقبال کے حضور، اقبال اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۱ء ص۔۱۱۷

(۶۸) عبدالواحد معینی، کتاب مذکور۔ص۔۳۳۵

(۶۹) آرنلڈ، میراثِ اسلام، ترجمہ عبدالمجید سالک، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۴۰ء ص۔۵۱۸

(۷۰) عبدالواحد معینی، کتاب مذکور۔ص۔۱۷۱

(۷۱) ایضاً۔ص۔۱۷۲۔۱۷۳

(۷۲) ایضاً۔ص۔۱۷۵

(۷۳) اقبال بانگِ درا۔ص۔۱۷۲۔۱۷۳

(۷۴) محمد محمود علی خان۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، اپریل ۱۹۷۷ء۔ص۔۵۰

(۷۵) نذیر نیازی۔ اقبال کے حضور۔ص۔۲۸۸

(۷۶) ایضاً۔ص۔۳۹۱۔

(۷۷) ایضاً۔ص۔۳۹۱

(۷۸) ایضاً۔ص۔۳۹۲

(۷۹) اس نے دوران خون کا نظریہ پیش کیا۔

(۸۰) فواد سیزگین، سہ ماہی (فکر و نظر) تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام، مترجم ڈاکٹر خورشید رضوی، اسلام آباد، جولائی ۱۹۸۶ء۔ص۔۱۰۹

(۸۱) رحیم بخش شاہین ڈاکٹر۔ سہ ماہی۔ اقبال لاہور، اکتوبر ۱۹۹۲ء، جنوری ۱۹۹۳ء۔ص۔۱۹۴

(۸۲) سلیم اختر، ڈاکٹر، مرتب اقبال شناسی کے زاویے۔ مضمون نگار، مرزا منور، فکر و نظر، جولائی ۱۹۸۶ء۔ص۔۸۷۔

(۸۳) ایضاً۔ص۔۸۷

(۸۴) اقبال، اسرار و رموز۔ص۱۰۶

(۸۵) فواد سیزگین، فکر و نظر، ص۔۱۱

(۸۶) اقبال، بانگِ درا۔ص۱۴۶

(۸۷) عبدالواحد معینی، مقالاتِ اقبال، ص۳۰۰

(۸۸) اقبال، فلسفۂ عجم، مترجم میر حسن، نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۲ء۔ص۔۲۲۴

(۸۹) ایضاً۔ص۔۱۵۰

(۹۰) ایضاً۔ص۔۱۴۳۔۱۴۴

(۹۱) ایضاً۔ص۔۱۴۲

(۹۲) عرب، اندلس اور سسلی کو جڑواں بہنیں کہتے تھے۔

(۹۳) اقبال بانگِ درا۔ص۔۱۴۳۔۱۴۲

(۹۴) نذیر نیازی، اقبال کے حضور، ص۲۵۴

(۹۵) ایضاً۔ص۔۱۹۷

(۹۶) ایضاً۔ص۔۱۹۷

(۹۷) ایضاً۔ص۔۱۹۸

(۹۸)

(۹۹)

(۱۰۰) ایضاً۔ص۔۳۷۴

(۱۰۱) ایضاً۔ص۔۳۷۴

(۱۰۲) ایضاً۔ص۔۲۷۲

(۱۰۳) بشیر احمد ڈار، انوار اقبال، اقبال اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۷ء۔ص۔۳۴۔۳۵

(۱۰۴)

(۱۰۵) ایضاً۔ص۔

(۱۰۶) اقبال، بال جبریل، شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور۔ص۔۱۹

(۱۰۷) نگہت شاہجہاں پوری، موازنہ صلیب و ہلال، کتاب منزل لاہور ۱۹۴۰ء

(۱۰۸) مرتب محمد عاصم، ''اقبال کے معنی و افکار''۔ص۔۴۴

عربی ثقافت کا رنگ ابھی تک بعض قصبوں پر ہے

From there road followsthe coast to the little hill-town of Mogacar over looking the rio Aguas where according to the Blue Guide "The women until lately wore the Moorish veil" Inspite of the invitable urbanizacien which is occuring it still retains a very Moorish appearance and atmosphere *(Costa Del Sol by Douglus Clyne Alvin Redman London 1966: Pg:58)*

☆☆☆

نام پر غور کیجیے ابھی بھی مدرسہ ہی کہلاتا ہے

Palace of the "Madreza" which originally housed the Moorish University and after the capture of the by Ferdinad and Isabella became first town Hall .*(Costa Del Sol by Douglus Clyne Alvin Redman London 1966: Pg:58)*

☆☆☆

"خلیفہ الحکم ثانی کو یہ عزت نصیب ہوئی کہ دسویں صدی عیسوی میں وہ مشہور و معروف سلسلہ تعلیم و تعلم اس کی ذات سے جاری رہا جس نے یورپ کے مسیحیوں پر ایسا اثر ڈالا کہ آج تک تاریخ تمدن میں اس کا بڑا مرتبہ سمجھا جاتا ہے۔"

(ابن رشد و فلسفہ ابن رشد، موسیو رینان، ترجمہ مولوی معشوق حسین خان، تخلیقات، لاہور ص:۸)

☆☆☆

اقبال نے عربوں ہی کے انداز میں مسجد قرطبہ کی وسعت اور عظمت کے پیش نظر اسے حرم قرطبہ کہہ کر پکارا ہے۔ اقبال سے کئی سو سال قبل المشتی نے اس مسجد پر جو شعر کہے تھے ان میں اسے باضابطہ حرم کعبہ سے تشبیہ دی تھی

بنیت للہ خیر بیت — نخرس عن وصفہ الانام

حج الیہ من کل اوب — کانہ المسجد الحرام

کان محرابہ اذا ما — حف بہ الرکن والمقام

ترجمہ: اللہ کے لئے بہت اعلیٰ گھر تعمیر کیا گیا ہے۔ لوگوں کی زبانیں اس کی توصیف بیان نہیں کر سکتیں، لوگ ہر نواح سے اس کا رخ کرتے ہیں۔ یوں گویا وہ مسجد حرام (کعبہ) ہو جب لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کا منبر کعبے کے رکن و مقام کا یوں کام دے رہا ہے"

(اقبال بحیثیت شاعر، رفیع الدین ہاشمی ص(۲۶۰_۶۱) ☆☆☆

باب سوم

اقبال کا سفرِ اندلس اور تاثرات

اندلس کی سیاحت اور مسلمانوں کے آثار کی زیارت کا شوق اقبال کو بہت پہلے سے تھا۔ چنانچہ جب گول میز کانفرنس کے لیے انہیں مسلمانانِ ہند کا نمائندہ نامزد کیا گیا تو انہوں نے اسی وقت سفرِ اندلس (سپین) کا پروگرام بنالیا۔ ۲۱ مئی ۱۹۳۲ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''میں پورے شمالی افریقہ، ترکی اور ہسپانیہ کی سیاحت کا قصد رکھتا ہوں۔ دو ایک ماہ میں قطعی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا۔''[1]

جوں جوں سفر کا وقت قریب آتا گیا سیاحت و زیارت کا شوق بڑھتا گیا۔ ارادے میں مزید پختگی آتی گئی۔ آغازِ سفر سے پہلے ہی انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اندلس کے قدیم شہروں کے بارے میں وہ اپنے تاثرات بھی قلم بند کریں گے۔ چنانچہ ۲۱ اگست ۱۹۳۲ء کو منعمی صاحب کے نام خط میں لکھتے ہیں۔

''..... اگر اب کے نکلا تو اسپین کی سیر کا قصد ہے۔ انشاء اللہ عربوں کے قدیم شہر بھی دیکھوں گا اور ان پر لکھوں گا بھی .....''۔[2] ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو لندن جانے کے ۹ بجے شب لاہور سے فرنٹیئر میل پر سوار ہوئے۔[3] ۱۹ اکتوبر کو بمبئی پہنچے۔ وہاں سے سید امجد علی کے ساتھ کونٹے روسو نامی جہاز میں سوار ہو کر یورپ کے لیے روانہ ہوئے اور سب سے پہلے اٹلی کی بندرگاہ وینس جا اترے اور وہاں سے وہ ریل کے ذریعے پیرس پہنچ گئے۔[4] پیرس میں اپنے میزبان امراؤ سنگھ مجیٹھا کے ساتھ نپولین کی قبر پر گئے۔ اقبال کو نپولین سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ بقول جاوید اقبال وہ کہتے ہیں نپولین کے آباؤ اجداد عرب سے آئے تھے۔ یہ اس لیے قرین قیاس ہو سکتا ہے کیونکہ سولہویں صدی عیسوی میں اندلس سے ہزاروں مسلمان فرانس جا بسے تھے۔ فرانس کا بادشاہ انہیں دباؤ کے طور پر سپین کے لیے استعمال کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ نپولیں کے آباؤ اجداد بھی انہی میں سے ہوں اور وہ عیسائی ہونے کے بعد فرانس کے معاشرے میں گھل مل گئے ہوں۔[5] موسیو لیبان کے بیان کے مطابق فرانس پر قبضے کے دوران بھی مسلمان اُن شہروں میں جہاں ان کی فوجیں قابض تھیں بس گئے تھے۔ اب بھی ان کے خون کا اثر فرانسیسیوں کے خون میں باقی ہے۔ علم اقوامِ انسانی کی رو سے ہمیں اس اندرونی معاشرت کے اثرات کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اتنی صدیوں کے بعد بھی فرانس کے بعض حصوں میں عرب نسل کا پتہ ملتا ہے۔ مثلاً صوبہ کروز کے ہوت آلپ میں خاص طور پر مونٹ مور کے مختلف مقامات میں۔ اس کے علاوہ بین کی صوبہ میں اور

قصبات لاندور وزیاں، ولانگے ڈاٹ و بیرن میں عربوں کی نسل با آسانی پہچانی جاتی ہے۔ جس کا رنگ گندمی، سیاہ بال اور خم دار ناک، اسی طرح عورتوں کا رنگ سانولا، لمبا قد، بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔ ان لوگوں نے فرانسیسیوں کے ساتھ ازدواجِ امتزاج کو قائم نہیں رکھا۔ اس لیے اپنی نسلی خصوصیات کو تلف ہونے سے بچالیا۔[6] اِن میں سے کچھ عرب تو جینوا (سوئٹزرلینڈ) تک پہنچ گئے تھے جہاں آج بھی ابوزید (Abo Zat) کے نام سے ایک سڑک موسوم ہے۔[7]

''نپولین کے مزار پر'' کے عنوان سے اقبال نے بال جبریل میں ایک نظم بھی لکھی ہے۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیل ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب و فراز
صف جنگاہ میں مردانِ خُدا کی تکبیر
ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس
عوض یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز!
''عاقبت منزلِ ما وادیِ خاموشاں است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز!''

مشہور فرانسیسی محقق اور عالم میسی نوں Massignon سے اقبال کی ملاقات پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق یکم نومبر ۱۹۳۲ء کو ہوئی۔ میسی نون نے عربوں کے عہد کی تاریخ اندلس پر قابلِ قدر تحقیقی کام کیا تھا۔ اس کے اعلیٰ علمی ذوق کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دوسری متعدد تصانیف کے علاوہ اس نے شیخ محی الدین ابن عربی (صاحب فصوص الحکم) کے نظریات پر ایک مربوط اور مستند کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے حلاج کی کتاب الطواسین کے عربی متن کو ایک مدلل مقدمے اور تحقیقی حواشی کے ساتھ شائع کیا تھا۔[9] دورانِ گفتگو علامہ اقبال نے کہا کہ مغرب کے مورخین کو اسلام سے جو بغض و عناد ہے وہ وقت گزرنے کے ساتھ کم ہو رہا ہے۔ اور اسلام کی صداقت و حقیقت ان پر آشکار اور واضح ہوتی جا رہی ہے اس کے بارے میں آپ کی

رائے کیا ہے؟

فرانسیسی عالم نے جواب دیا کہ یہ بات درست ہے کہ اب مغربی مورخین نسبتاً غیر جانبدار نقطہ نظر سے اسلامی تحریکوں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ میسی نون نے یہ بھی کہا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ پر مسلمانوں کے عظیم احسانات ہیں۔ انہوں نے تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا اور تعلیم و معاشرت کے بہت سے شعبوں میں مغرب کی ترقی کے لیے مواقع عطا کیے۔ میسی نون سے ڈاکٹر صاحب کی ملاقات کافی دیر رہی اور وہ ڈاکٹر صاحب کی باتیں کافی انہماک اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ میسی نون نے اس ملاقات کے بارے میں لکھا ہے، کہ اقبال نے دورانِ ملاقات اس بات کا اقرار کیا کہ وہ وحدت الوجودی نہیں بلکہ وحدت الشہودی ہیں۔[10]

علامہ اقبال کی برگساں سے ملاقات نہ ہو سکی، اور اُن سے گول میز کانفرنس سے واپسی پر ملاقات کا پروگرام بنایا۔

پیرس میں چند دِن گزارنے کے بعد علامہ اقبال ۱۲ نومبر ۱۹۳۲ء کو برطانیہ پہنچے۔[11]۔ ۱۷ نومبر کو کانفرنس شروع ہوئی اور ۲۴ دسمبر کو ختم ہو گئی۔[12]۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۳۲ء کو علامہ صاحب نے مہر صاحب مدیر انقلاب کے نام لندن سے سفر کے پروگرام کی تفصیل کے بارے میں خط لکھا۔

''کل ۲۴ دسمبر کو کانفرنس ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد دو تین روز یہاں ٹھہروں گا۔ اور پھر چند روز کے لیے ہسپانیہ جاؤں گا۔ اور انشاء اللہ اگر قرطبہ کی مسجد واگزار ہوئی تو وہاں نماز ادا کروں گا۔ وہاں سے پیرس آ کر جرمنی، آسٹریا، ہوتا ہوا جینوا سے جہاز ہندوستان کا لوں گا۔ یہ جہاز ۲۶ جنوری کو چلتا ہے۔ اس حساب سے فروری کے پہلے ہفتے کے آخر میں بمبئی پہنچوں گا۔ بوداپسٹ کے مفتی اعظم کا خط آیا ہے کہ یہاں ضرور آؤ۔ غرضیکہ وہاں سے ملتا ہوا اٹلی (جینوا) پہنچ کر وکٹوریہ جہاز پر سوار ہوں گا۔ اگر اس میں ترمیم ہو گئی تو پھر لکھوں گا یا کہیں سے تار دوں گا۔ بمبئی آ کر افغانستان کے قونصل خانے میں یا خلافت ہاؤس میں ایک آدھ روز ضرور ٹھہر جاؤں گا۔[13]

علامہ نے لندن میں ایک غزل لکھی جس کا مطلع اور دو اشعار یہ ہیں۔

تو ابھی رہگذر میں ہے قیدِ مقام سے گذر!
مصر و حجاز سے گذر پارس و شام سے گذر!
گرچہ دل کشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار
طائرِ بلند بال دانہ و دام سے گذر!

کوہ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشادِ شرق و غرب
تیغ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گذر![15]

اس کے علاوہ علامہ نے ۲۹ دسمبر کو لندن سے ایک اور خط لکھا جس میں پروگرام کی تبدیلی کا ذکر ہے۔ مذکورہ خط کی نقل درج ذیل ہے۔

۲۹ دسمبر ۱۹۳۲

لندن

برخوردار مختار و جاوید بعد دعا کے واضح ہو کہ اس سے پہلے میں نے جو خطوط اپنے بمبئی پہنچنے کی تاریخ کے متعلق چوہدری صاحب یا منشی طاہر دین یا کسی اور کو لکھے ہیں۔ ان سب کو منسوخ تصور کیجئے۔ پہلے ارادہ یہی تھا۔ مگر بعد میں دیکھا تو جہازوں کی روانگی کی موزوں تاریخیں نہ ملیں۔ اس واسطے اب ہسپانیہ، جرمنی اور آسٹریا سے ہوتا ہوا ۱۰ فروری ۱۹۳۳ء کو وینس سے بمبئی کے لیے جہاز لوں گا۔ اس جہاز کا نام ''کانٹے وردی'' ہے۔ اور یہ بمبئی ۲۲ فروری کی صبح کو پہنچے گا۔[14]

اقبال کے قدر دانوں کو ان کے سفرِ اندلس کے اہمیت کا اندازہ تھا۔ ان کی شاعری پر اس سفر کے دور رس نتائج کے بارے میں بھی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ ۱۵ جنوری ۱۹۳۳ء کو اخبار ''انقلاب'' میں سید زبیر ہزاروی ایم اے کا ایک مضمون ''شاعر اسلام اندلس میں'' شائع ہوا تھا۔ جس کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

''اخبارات سے معلوم ہوا کہ ہمارا شاعر امسال اسی سرزمین کی سیاحت کا ارادہ رکھتا ہے۔ جس میں مسلمانوں کی ایک شاندار تہذیب مدفون ہے۔۔۔۔ جس کی آب و گل میں مسلمانوں کے خونِ جہاد کے قطرات مقدس کی خراش و تراش صاف طور پر نظر آتی ہے۔ جس کے شہروں کا اندازِ تعمیر ہنوز اسلامی، جس کے باشندوں کے خدوخال میں عربی و حجازی نسبت و قومیت۔۔۔۔

اس اجڑی ہوئی بستی میں، اس وطن بے مہری و دیار بے وفائی میں اقبال کا جانا تاریخ اسلام کا کوئی معمولی واقعہ نہیں اور اگر آج علامہ مقری (جنہوں نے اندلیہ کی تاریخ میں ان نفوس کا ذکر کیا ہے جو باہر سے اسپین میں وارد ہوئے) زندہ ہوتے تو مشرق کے اس شاعر اعلیٰ مقام کے دورہ کا حال بھی جلی قلم سے بیان کرتے۔۔۔۔ اقبال کے سفرِ اندلس ہمارے نزدیک

اس لیے بے حد اہم ہے کہ اقبال آج دیدہ بینائے قوم ہو کر ایک ایسی اجڑی ہوئی محفل میں جا رہا ہے جس میں صحبتِ شب کے داغِ فراق کو نمایاں کرنے کے لیے کوئی ''خاموش شمع'' تک بھی موجود نہیں۔ حقیقت میں ہم ان احساسات کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جن سے قلب اقبال لبریز ہوگا۔ خدا معلوم غم نصیب اقبال کا کتنا لہو پانی ہوگا۔ کسے خبر کہ اقبال کے دِل سے کتنی آہیں نکلیں گی۔ یہ آہیں کن خونی نغموں کی شکل اختیار کریں گی۔ یہی وجہ ہے کہ میرے نزدیک اقبال کا سپین پہنچنا قیامت سے کم نہیں۔ کیونکہ وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ہماری قومی خرابیوں کا نبض شناس بھی ہے۔ ہمارے کلچر کے حسن و قبح کا ماہر کامل بھی ہے۔ ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر بھی ڈال سکتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس وقت پھر دنیا میں مسلمانوں کی عظمت کا خواب بھی دیکھ رہا ہے۔ اور اس کی نگاہیں زمان و مکان کے مطلع غبار آلود سے گزر کر ایک آنے والے سوار اشہب دوراں کو بھی پا رہی ہیں۔ پس ایک ایسے کلیم کا اندلس میں جانا اس امر کے مترادف ہے کہ وہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب کا جغرافیائی مشاہدات کی روشنی میں تجزیہ کرے گا اور ان اسباب کی حکیمانہ تحلیل کے بعد ہمارے سامنے نیا تعمیری نسخہ پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔''[17]

علامہ اقبال جرمنی اور آسٹریا بھی جانا چاہتے تھے۔ لیکن اس پروگرام پر عمل نہ ہو سکا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۲ء کو اقبال دوبارہ پیرس پہنچے۔ اور جنوری ۱۹۳۳ء کے پہلے ہفتے میں برگساں سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بڑھاپے اور بیماری کے سبب لوگوں سے اس کی ملاقات پر پابندی تھی۔ لیکن علامہ اقبال سے اس کی تقریباً دو گھنٹے ملاقات رہی۔ برگساں کے نظریات سے اقبال متاثر تھے۔ اور اقبال کے خیال کے مطابق اُن کا نظریہ 'تصور واقعیت زماں' (Reality of Time) اسلامی نقطہ نگاہ کے بہت قریب تھا۔[18] زیادہ تر گفتگو کا موضوع یہی نظریہ رہا۔ دوران گفتگو جب اقبال نے ان کے روبرو اللہ تعالیٰ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بیان کی

"لاتسبو الدهران لدهر هو الله"

جسے سن کر برگساں اچھل پڑا۔ اور بار بار اقبال سے پوچھتا کہ کیا یہ قول واقعی درست ہے۔[19] لیکن افسوس ہے کہ اس ملاقات کا تفصیلی ریکارڈ محفوظ نہ رہ سکا۔

عرب شمالی افریقہ سے جبل الطارق کے راستے اندلس میں داخل ہوئے اور فرانس کے جنوبی صوبوں تک پہنچ کر رُک گئے۔ اقبال نے ان کے مخالف سمت سے اپنا سفر شروع کیا اور جنوبی فرانس سے ہوتے ہوئے ۵ یا ۶ جنوری ۱۹۳۳ء کو اندلس میں داخل ہوئے۔ سب سے پہلے وہ

اندلس کے دارالحکومت میڈرڈ آئے۔ یہاں سے مہر صاحب کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

ڈیئر مہر صاحب!

کل مع الخیر میڈرڈ پہنچے۔ یہاں سے قرطبہ، غرناطہ وغیرہ جائیں گے۔ ۶ جنوری تک وینس پہنچنا ہے۔ آج یہاں کے وزیر تعلیم سے ملاقات ہوئی اور پروفیسر آسن سے بھی جنہوں نے دانتے کی ''ڈوائن کامیڈی اور اسلام'' پر کتاب لکھی۔ صدر جمہوریہ سے غالباً ملاقات ہوگی۔[20]

'چوہدری صاحب سے مضمون واحد

محمد اقبال

میڈرڈ عربوں کے دور میں چھوٹا سا قصبہ تھا۔ سولہویں صدی میں فلپ دوم نے جزیرہ نما اسپین کے وسط میں ہونے کی وجہ سے اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے بعد بوربون بادشاہوں نے اسے کافی ترقی دی اور آج یہ جدید سپین کا سب سے بڑا شہر ہے۔[21]

اقبال کے میڈرڈ میں میزبان پروفیسر آسن پیلا کیوس تھے۔ جنہوں نے اقبال کو لندن سے میڈرڈ یونیورسٹی میں لیکچر دینے کی دعوت دی تھی۔ سپین کے وزیر تعلیم سے بھی اقبال کی ملاقات ہوئی۔ میڈرڈ کے بعد اقبال اسکوریال گئے۔ جو میڈرڈ سے تقریباً ۳۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں فلپ دوم نے ایک محل بنوایا تھا جس کا ایک حصہ زیر زمین بھی ہے اس کے اندر سو میل سے زیادہ غلام گردشیں، چھیاسی زینے، تین عبادت خانے، پندرہ کھلے صحن کے صومعے اور ہزاروں کھڑکیاں ہیں۔[22] اسکوریال میں اقبال کے لیے سب سے بڑی کشش کی بات یہ تھی کہ وہاں عربی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ یہ ایک روایت کے مطابق مراکش کے بادشاہ کا کتب خانہ ایک جہاز کے ذریعے کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہا تھا کہ اسے عیسائیوں نے سمندر میں سے لوٹ لیا۔ ان کے علاوہ بہت سی قدیم عربی کتب کے نسخے جو اندلس کے اندر مختلف شہروں سے دستیاب ہوئے۔ وہ بھی یہاں محفوظ ہیں۔ اسی کتاب خانے کے بارے میں اقبال ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''اسکوریال کی لائبریری ☆ بڑی عظیم الشان لائبریری ہے۔ افسوس یہ ہے کہ عربوں

☆ اسکوریال میں سترھویں صدی تک عربی مخطوطات ہزاروں میں تھے۔ ۱۶۷۱ میں آگ لگنے سے اس بیش بہا علمی خزانے کا تین چوتھائی حصہ جل گیا۔ ایک طویل عرصے بعد حکومتِ اسپین نے ایک مستشرق کازیری کو مقرر کیا کہ وہ عربی مخطوطات کی فہرست بنائے اس نے بڑی محنت سے ۱۸۵۰ کتابوں کی (اگلے صفحہ پر)

کے زمانے کی قلمی تحریروں کا ذخیرہ متعصبین نے پہلے ہی غارت کر دیا تھا۔ اب تھوڑا ذخیرہ رہ گیا ہے۔ جس میں زیادہ تر مولانا ماجامی اور حضرت حافظ کی قلمی تحریریں ہیں''۲۴

اسکوریال کے کتب خانے میں عربوں کی بہت سی کتابیں ہیں لیکن اس کے متعصب نگران انہیں عام لوگوں اور خاص طور پر مسلمانوں کو نہیں دکھاتے۔ خود ایک اسپینی محقق کا بیان ہے کہ اسے اجازت لینے کے لیے کئی سال لگ گئے اور بڑی مشکل سے اسکوریال کے کتب خانے سے استفادہ کی اجازت ملی۔ اس نے یہاں صرف ابن رشد کی کتابوں کی فہرست دو سو سے زیادہ کی دیکھی ہے۔۲۵

اسکوریال سے علامہ اقبال طلیطلہ پہنچے۔ یہ شہر اگرچہ ابتدائی عہد میں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود دوسرے شہروں کی نسبت کافی حد تک عربی تمدن رکھتا ہے۔ اس کی فصیل، برج اور بعض دروازے عربوں کے ہی بنائے ہوئے ہیں۔ اس کے بارے میں اقبال کہتے ہیں۔

''عربوں کا تمدن اسپین سے بالکل فنا نہیں ہوا۔ چنانچہ شہر طلیطلہ عربی تمدن کی زندہ مثال ہے۔ قدرتی مناظر حسن کے علاوہ۔ یہاں کی معاشرت بھی آرام دہ اور دلکش ہے۔ وہاں پہنچ کر میں نے محسوس بھی نہیں کیا کہ اجنبی ملک میں ہوں۔ یہاں کے بازار، مکانات، بالکل مشرقی نمونے کے ہیں۔ اور غذا بھی وہی جو ہم لوگوں کو مرغوب ہے۔ چنانچہ پلاؤ کا مجھے وہی مزا آیا جو مجھے لاہور میں آتا ہے۔ لوگ خلیق اور ملنسار ہیں اور ان کے رہنے سہنے کا طریقہ بھی مشرقی ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی بالکل سادہ وضع کی مسجد ہے۔ جو اپنی ابتدائی حالت میں اب تک قائم ہے۔ غالباً کسی مسلمان سپاہی نے فتح طلیطلہ کے بعد اسے بنوایا تھا۔ موجودہ حکومت نے اسے آثار قدیمہ قرار دے کر محفوظ کر دیا ہے۔۲۶۔۔اسی ضمن میں مزید لکھتے ہیں:

''محکمہ آثار قدیمہ نے عربوں کی عمارتیں کئی جگہ سے کھدوا کر نکالی ہیں۔ ان میں خلفاء کے زمانے کی چند عمارتیں نکل آئی ہیں۔ ان کے بعض حصوں میں ٹوٹی پھوٹی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔۲۷۔ اس بیان میں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اگرچہ تصویر سازی شرعاً ممنوع سمجھی جاتی ہے لیکن

فہرست بنائی جو ۱۷۶۰ اور ۱۷۷۰ کے درمیان شائع ہوئی۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات، از عبداللہ نعمان، ترجمہ محمد عبدالوہاب ظہوری، نفیس اکیڈمی، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۷ء۔ ص ۲۴۲

اندلس کے اسلامی عہد کی عمارتیں تصویروں سے مزین کی جاتی تھیں۔

طلیطلہ کے بعد علامہ اقبال قرطبہ پہنچے۔ یہی وہ شہر ہے جو مسلم تہذیب کا سب سے بڑا درخشان و روشن مرکز تھا۔ جس کی دس لاکھ کی آبادی میلوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں ایک شخص دس میل تک چراغوں کی روشنی میں سفر کر سکتا تھا اور جہاں صرف کتابوں کی بیس ہزار دوکانیں موجود تھیں۔۲۸

قرطبہ پہنچنے کے بعد آپ وہاں کی یگانہ روزگار مسجد میں تشریف لے گئے جو اب گرجا بن چکی ہے۔ وہاں علامہ اقبال نے نماز ادا کی جس کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں۔

''اقبال مسجد کی شان و شوکت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ علامہ اقبال نے بے اختیار چاہا کہ مسجد قرطبہ میں تحیۃ المسجد کے نفل ادا کریں اس عمارت کے نگران سے پوچھا اس نے کہا میں بڑے پادری سے پوچھ آؤں۔ ادھر وہ پوچھنے گیا ادھر علامہ اقبال نے نیت باندھ لی اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی ادائے نماز سے فارغ ہو گئے۔''۲۹

اس بارے میں سر مالکم ڈارلنگ بیان کرتے ہیں۔

''اقبال نے مجھے اپنے قیام اسپین کی بڑی خوشگوار کہانی سنائی انہوں نے بتایا کہ وہ قرطبہ کی شاندار مسجد دیکھنے گئے تھے جو اب کلیسیا میں تبدیل ہو چکی ہے۔ انہوں نے گائیڈ سے اس جگہ نماز ادا کرنے کی اجازت طلب کی۔ کیونکہ یہ کسی زمانے میں مسجد رہ چکی ہے۔ گائیڈ نے کہا کہ کلیسا کے راہب اس پر خوش نہ ہوں گے۔ لیکن انہوں نے اس کی پروانہ کی اور مصلیٰ بچھا دیا۔ اتنے میں ایک پادری احتجاج کے لیے نکلا۔ اقبال نے گائیڈ سے کہا پادری سے کہہ دو ایک بار مدینہ میں عیسائیوں کا وفد کچھ مطالبات لے کر رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملنے آیا۔ حضور ﷺ نے انہیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا۔ جب عبادت کا وقت آیا تو عیسائی متردد تھے کہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کر سکیں گے۔ جب سرور کائنات کو اس بات کا علم ہوا تو آپ نے انہیں بخوشی عبادت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ جب ہمارے نبی ﷺ عیسائیوں کو اپنی مسجد میں عبادت کی اجازت دے دی تھی تو اس جگہ جو کسی وقت مسجد تھی کیا نماز ادا نہیں کر سکتا؟ پادری سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا اور اقبال نے نماز ادا کرنا شروع کر دی۔ جب اقبال نے نماز ختم کی تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کلیساء کے تمام پادری اس منظر کو دیکھنے کے لیے جمع ہو چکے ہیں۔ بلکہ ان میں سے تو ایک نے اس منظر کی تصویر بھی لے لی۔ اس کے بعد اقبال نے کہا غالباً میں پہلا واحد مسلمان تھا جس

نے گذشتہ چار سو سال میں یہاں پہلی بار نماز ادا کی"۔۳۱

مذکورہ بالا بیان میں علامہ اقبال سے سہواً ہوا ہے۔ ان کے ذہن میں سقوط غرناطہ تھا۔ کیونکہ قرطبہ پر عیسائیوں کا قبضہ ۱۲۳۶ء میں ہوا اس طرح علامہ اقبال نے سات سو سال بعد یہاں نماز ادا کی۔

فقیر سید وحید الدین کا بیان بھی سر مالکم ڈارلنگ سے ملتا جلتا ہے۔ البتہ اس میں یہ اضافہ ہے کہ اقبال نے وہاں اذان بھی دی۔۳۲۔ سید امجد علی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے علامہ اقبال نے ایک خط میں لکھا تھا کہ مسجد قرطبہ میں انہوں نے نماز سے قبل اذان بھی دی تھی۔ اور ان کی خوشی و مسرت ایسی تھی جیسے بچہ کوئی نادر اور غیر متوقع چیز پا کر خوشی کے مارے وارفتہ ہو جاتا ہے۔۳۳

محمود الرحمٰن نے امتیاز محمد خان کے حوالے سے ایک نئی کہانی بیان کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"قیام لندن میں اقبال کا ارادہ ہوا کہ سپین کے مسلم آثار الحمراء و مسجد قرطبہ وغیرہ کی زیارت کریں۔ یہ خیال آتا تھا کہ دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کسی نہ کسی طرح مسجدِ قرطبہ میں نماز ادا کرنے کا موقع بھی مل جائے تو کیا کہنے۔ سپین کی عیسائی حکومت نے مسجد میں اذان اور نماز دونوں کی ممانعت کر رکھی تھی اور اس مسجد کو گرجا بنا دیا تھا۔ علامہ اقبال کا دل اس صورتِ حال پر خون کے آنسو رونے لگا۔ اقبال مسلمانوں کی عظیم الشان یادگار مسجد میں حاضری دے اور خدا کے حضور دو رکعت نماز بھی ادا نہ کر سکے۔ اسی ادھیڑ بن میں ان کو اپنے استاد ڈاکٹر آرنلڈ یاد آئے۔ وہ ان دنوں بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ اور لندن میں ہی مقیم تھے۔ اقبال سیدھے اُن کے پاس گئے اور مدعا بیان کیا۔ پہلے تو موصوف کچھ سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے حکومت ہند کے ہوم سیکرٹری کو ایک خط لکھا کہ وہ اس امر کی اجازت حاصل کرے کہ علامہ اقبال سفرِ قرطبہ کے دوران مسجد قرطبہ میں باقاعدہ نماز ادا کر سکیں۔ پروفیسر آرنلڈ کی یہ کوشش بارآور ثابت ہوئی۔[۳۴] اقبال کو اس شرط کے ساتھ اجازت مل گئی کہ جب وہ مسجد کے اندر داخل ہو جائیں گے تو مسجد کا دروازہ بند کر دیا جائے اور اس پر قفل لگا دیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

"اقبال حسبِ قرارداد مسجد میں داخل ہوئے تو آپ نے پوری آواز کی پوری شدت سے اذان دی۔ اقبال کہتے ہیں، میں اس جذبے، رکیف کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جو اس وقت مجھ پر طاری تھا۔ سالہا سال کے بعد مسجد کے اندر پہلی مرتبہ "اللہ اکبر" کی آواز محراب و منبر سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ اذان سے فارغ ہونے کے بعد اقبال نے مصلیٰ بچھایا اور نماز ادا کرنے لگے۔

علامہ اقبال مسجد قرطبہ میں نماز ادا کر رہے ہیں

دوران نماز ان پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ مسجد میں گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ اس دوران عالم رویا میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے، ''اقبال تم نے میری مثنوی کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اسے مسلسل پڑھتے رہو اور میرا پیغام دوسروں تک پہنچاؤ۔'' جب اقبال ہوش میں آئے تو دل کو سکون اور اطمینان حاصل ہو چکا تھا۔۳۵

اس موضوع پر اقبال نے عبدالرشید طارق سے گفتگو کرتے ہوئے کہا، ''میں نے ہسپانیہ کے تاریخی مقامات کا معائنہ کیا۔ مسجد قرطبہ میں جس کی فضا صدیوں سے بے اذان پڑی ہے۔ حکام کی اجازت لے کر نماز ادا کی۔ سجدے میں گر کر خدا کے حضور میں گڑگڑایا کہ اللہ اللہ یہ وہی سرزمین ہے جہاں مسلمانوں نے سینکڑوں برس حکومت کی، یونیورسٹیاں قائم کیں اور یورپ کو علم و فضل سکھایا۔ جن کے دبدبے سے شیروں کے دل دہلتے تھے۔ اور جن کے احسان کے نیچے آج سارا فرنگستان دبا ہوا ہے۔ اور آج میں اسی قوم کا فرد انہیں کی تعمیر کردہ مسجد میں اغیار کی اجازت لے کر نماز ادا کر رہا ہوں۔ میری آنکھوں مین خونِ جگر آنسو بن کر ٹپک رہا تھا۔ اور میرے دل سے یہ دعا نکل رہی تھی کہ اے خدا!، ''یہ تیرے پاک بندوں کی زمین ہے۔ یہ پرشکوہ مسجد یہ قصر الحمراء اور یہ عالیشان قلعے انکی عظمت کے گواہ ہیں۔''۳۶

ان سارے بیانات سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ علامہ اقبال نے محکمہ آثار قدیمہ کی خاص اجازت سے مسجد قرطبہ میں اذان دی اور نماز ادا کی۔ یہ اجازت سیکرٹری ہند کی وساطت سے ملی ہو یا پروفیسر آسن اور وزیر سپین کے ذریعے سے۔ اس لیے علامہ اقبال نے جلدی جلدی نماز ادا نہیں کی بلکہ بڑے اطمینان اور پورے خشوع خضوع کے ساتھ یہ فریضہ ادا کیا۔ اس وقت حکومت اسپین بھی اسلامی دنیا کے ساتھ روابط بڑھانا چاہتی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ اسلامی دنیا کے دانشور اور علماء سپین آئیں اور یہاں اپنے ماضی کے متعلق چھان پھٹک کریں۔ اس لیے انہوں نے علامہ اقبال کو مسجد میں جانا اور نماز کی اجازت دینے کے ساتھ ساتھ اسے سیاحت کے لیے ایک مفید اور اہم کام سمجھا۔ اس لیے ان کی تصاویر بھی اتاری گئیں جو مختلف اخبارات میں شائع ہوئیں۔ اب جو سیاح وہاں جاتے ہیں ان کے بیان کے مطابق اب وہاں بہت زیادہ زائرین مسجد قرطبہ اور اسپین جاتے ہیں۔۳۷

مسجد قرطبہ کے پراثر ماحول اور شان و شوکت کے زیر اثر علامہ اقبال نے جب نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو پوری دعا اشعار کی صورت میں ڈھل گئی۔ اس کے بارے میں فقیر

وحیدالدین علامہ اقبال کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جب انہوں نے مسجد قرطبہ میں نماز ادا کرنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ان پر یکا یک اشعار کا نزول ہونے لگا۔ حتیٰ کہ انہوں نے پوری دعا اشعار کی صورت میں مانگی۔۳۸

یہی نظم ''بال جبریل'' میں ''دعا'' کے عنوان سے درج ہے جس کا مطلع یہ ہے،

ہے یہی میری نماز یہی میرا وضو　　میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو!

ایک اور شعر ہے۔

تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبح نشور　　تجھ سے میرے سینے میں آتش اللہ ہو!

اقبال کے لیے یہ بات باعث خوشی و مسرت تھی کہ وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے صدیوں بعد اس مسجد میں اذان دی اور نماز پڑھی۔

آثار قدیمہ کی طرف سے مسجد کی حفاظت اور نگرانی ایک جدید تحریک کا نتیجہ ہے۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں، ''ہسپانیہ میں قومیت اور وطنیت کی ایک نئی لہر دوڑ رہی ہے۔ ملک میں ایسے نوجوان اور فضلا نکل آئے ہیں جو ہفت صد سالہ اسلامی حکومت ہسپانیہ کے کارناموں کو فخریہ بیان کرتے ہیں اور اس دور کو اندلس کا بہترین زمانہ کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ اس تحریک کا نتیجہ یہ ہے کہ مسجدِ قرطبہ کو کیتھولک چرچ کے مختلف فرقوں سے چھین لیا گیا۔ حالانکہ فتح کے بعد عیسائیوں نے اس مسجد میں جابجا چھوٹے چھوٹے گرجے بنا دیئے تھے۔ اور کئی سو سال تک ان فرقوں نے مسجد کے مختلف حصوں میں اپنی عبادت گاہیں بنا لی تھیں۔ وطنیت کی اس تحریک کا چونکہ مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا اس لیے مسجدِ قرطبہ کو آثار قدیمہ کے محکمے کے حوالے کر دیا گیا۔ محکمہ آثار قدیمہ ان چھوٹے چھوٹے گرجوں کو صاف کر کے مسجد کو اصل حالت میں لانے کی تدبیریں کر رہا ہے۔''۳۹

ان گرجوں کو کوئی بھی غیر ملکی خواہ وہ عیسائی ہو یا کسی اور مذہب کا ہو۔ کسی نے بھی پسند نہیں کیا بلکہ سب نے اس وقت کے عیسائیوں کی کور ذوقی پر نہایت افسوس کیا۔ گرجوں کو ابھی تک اسی حالت میں رہنے دیا گیا ہے۔

اس ضمن میں علامہ اقبال نے حکمتِ الٰہی کی ایک دل پذیر بات یہ سنائی کہ مسلمانوں کے اخراج کے بعد جب مسجد قرطبہ جو تعمیری جمالیات کے لحاظ سے دنیا کی نادر ترین مسجدوں اور عمارتوں میں سے ہے۔ عیسائی راہبوں کے قبضے میں آئی تو انہوں نے آیات قرآنی پر جو سنہرے حروف میں مسجد کی دیواروں اور محرابوں پر لکھی ہوئی تھیں پلستر کروا دیا تھا۔ آج قریباً چھ سو سال بعد

جب پلستر محکمہ آثار قدیمہ کے حکم سے اکھاڑا جاتا ہے تو وہی نقوش اسی شان کے ساتھ دنیا کے سامنے آجاتے ہیں۔ اگر پلستر نہ ہوتا تو غالباً یہ نقوش اس وقت بالکل محو ہو جاتے۔"[40]

یہ قرآنی آیات مسجد کے بہت تھوڑے حصے پر باقی ہیں۔ باقی تمام دیواروں اور محرابوں سے یہ نقش مٹا دیئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال مسجدِ قرطبہ کے بارے میں مزید لکھتے ہیں۔ "میری رائے میں آج تک اس سے زیادہ خوبصورت اور شاندار مسجد روئے زمین پر بنی ہی نہیں۔ اس کے نقوش دیکھ کر جو لذت قرآن اور اسلام کے مفہوم کے متعلق میں نے حاصل کی وہ بیسیوں تفسیروں سے حاصل نہ کر سکا۔"[41]

ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ایک آدمی نے مجھ سے پوچھا کہ مسجدِ قرطبہ کو دیکھ کر آپ پر کیا اثر ہوا تو میں نے کہا۔

" It is a commentary on the Quran wirtten in stones" 42

(یہ قرآن کی وہ تفسیر ہے جو پتھروں پر لکھی گئی ہے۔

اقبال نے قرطبہ میں وہ غزل کہی جس کا آخری شعر یہ ہے۔

ہوئے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا مری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہد شباب [43]

اسی شہر میں انہوں نے اپنی مشہور و معروف اور خوبصورت ترین نظم "مسجد قرطبہ" بھی لکھی۔

اقبال قرطبہ کے جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اس کے مالک سے انہوں نے سب سے پہلے پوچھا کیا اس علاقے میں قدیم مراکشی نسل کے لوگ آباد ہیں؟ اس نے جواب دیا بڑی تعداد میں انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے ان میں سے کسی سے ضرور ملایا جائے۔ منیجر مسکرا کر بولا اس کام کے لیے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود مراکشی نسل میں سے ہوں۔ (جنوبی اندلس کے ان باشندوں کو مورسکو (Morisco) کہا جاتا ہے۔) حسنِ اتفاق سے آپ کو پرانی عمارتیں دکھانے کے لیے جو انگریزی دان گائیڈ مقرر کیا گیا تھا وہ بھی مراکشی نسل کا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا اس علاقے میں عربی مراکشی اثر چہروں کی ساخت میں بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ مسجدِ قرطبہ کے ان اشعار میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشین

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے!
رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے! [45]

قرطبہ سے ہی ۲۰ جنوری کو سر ولیم کو خط لکھا۔

"میں ان دنوں جنوبی اسپین میں سیاحت کر رہا ہوں۔ یہاں عربوں کے بنائے ہوئے محل اور مسجدیں فنِ تعمیر کا نادر اور کمال کا نمونہ ہیں۔ امید ہے چند ہی دنوں میں وینس پہنچ جاؤں گا۔ کہ ۱۰ فروری کو (Contverdi) جہاز میں ہندوستان کے لیے روانہ ہو سکوں۔[46] اس کے علاوہ قرطبہ سے علامہ اقبال نے دو خط ہندوستان بھی لکھے۔ ایک مولانا غلام رسول مہر مدیر انقلاب لاہور کے نام اور دوسرا اپنے بیٹے جاوید کے نام۔ پہلے خط میں صرف اتنا لکھا۔

"مرنے سے پہلے قرطبہ ضرور دیکھو" [47]

دوسرے خط میں (اپنے بیٹے کو) لکھا۔

میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ میں اس مسجد کو دیکھنے کے لیے زندہ رہا، یہ مسجد دنیا کی تمام مساجد سے بہتر ہے۔ خدا کرے تم جوان ہو کر اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو۔[48]

(تقریباً ۴۲ سال بعد اقبال کی یہ دعا قبول ہوئی اور جاوید اقبال ۱۹۷۵ میں مسجد کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے) قرطبہ کے بعد علامہ اقبال اشبیلیہ☆ آئے۔ جو اسلامی دور کا بڑا اہم شہر تھا۔ اور بعض اوقات سیاسی طور پر قرطبہ کا ہم پلہ ہو جاتا تھا۔ امریکہ دریافت ہونے کے بعد اس کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ نئی دنیا سے سونے سے بھرے جہاز اسی بندرگاہ پر آتے تھے۔ یہ شہر مسلمانوں کی بہت سے نشانیاں سنبھالے ہوئے ہے۔ شاہی محل[50] اور جیرالڈہ کا مینارہ[51] سب سے اہم ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر مکانات بھی عربی طرز کے ہیں۔ علامہ اشبیلیہ کے بعد غرناطہ گئے

☆ یہ شہر آج بھی اپنی زندہ دلی کے لیے مشہور ہے۔ اسلامی دور میں بھی دریا کے کنارے رات دن لوگ چہل قدمی کرتے رہتے تھے۔ اس شہر کے عیسائی حاکم پیٹر نے (۱۳۶۹ء-۱۳۳۲ء) اپنے مہمان جو غرناطہ کا بادشاہ ابوسعید تھا۔ اس نے جو جواہرات پہنے ہوئے تھے اسکو ہتھیانے کے لیے رات کے وقت اپنے محل میں قتل کر دیا تھا۔ برطانیہ کے قلعہ ٹاور میں ایک ہیرا ان ہیروں میں سے ابھی بھی ہے) اسی طرح کا واقعہ پنجاب میں بھی ہوا تھا۔ جب رنجیت سنگھ نے کوہ نور ہیرا لینے کی غرض سے اپنے مہمان والی کابل سردار احمد شجاع کے مکان کی ناکہ بندی کر دی تاکہ خوراک اندر نہ جا سکے آخر کار سردار احمد شجاع نے اسے کوہ نور ہیرا دے دیا۔

جہاں مسلمانوں نے طلیطلہ، قرطبہ اور اشبیلیہ سے نکالے جانے کے بعد دو سو سال تک اپنے سیاسی وجود کو برقرار رکھا اور مزید ڈیڑھ سو سال تک عیسائیوں کے محکوم رہے آخر سترھویں صدی میں ان کو اندلس سے بے دخل کر دیا گیا۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے مذہب اسلام سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ یہاں علامہ اقبال نے مشہور عالم ''قصر الحمرا'' دیکھا۔ اس کے بارے میں ایک مرتبہ اپنے تاثرات کا یوں اظہار فرمایا۔

''مسلمانوں کی عمارات دو قسم کی ہیں۔ جلالی اور جمالی اور یہ دونوں قسم کی عمارات اپنے بنانے والوں کے کردار کا آئینہ ہیں۔ جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر میں محبت کا عنصر زیادہ تھا۔ اس لیے تاج محل، شاہدرہ، شالامار اور شاہی مسجد لاہور حسن و جمال کا مظہر بن گئیں۔ شیر شاہ سوری پیکر جلال تھا اس لیے اس کی تعمیر کردہ قلعوں سے ہیبت برستی ہے۔ یہی حال فراعنہ مصر کا تھا۔ الحمرا کے بانی بنو نصر تھے۔ جن میں شدت اور سخت گیری زیادہ تھی۔ اسی لیے الحمرا کو دیکھ کر خوف آنے لگتا ہے۔ میں نے الحمرا میں ہر جگہ ہوا لغالب لکھا ہوا دیکھا۔ اور ایسے حصوں کو بھی تلاش کرتا رہا جس سے انسان کے غالب ہونے کا تصور پیدا ہو۔ لیکن مری یہ کوشش ناکام رہی۔''[52]

اس کے علاوہ مزید کہا۔

''اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی فنِ تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن جوں جوں زندگی کے قواعد شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصر زہرا☆ دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مسجد قرطبہ مہذب دیووں کا مگر الحمرا محض مہذب انسانوں کا۔''[53]

الحمرا ایسی خوبصورت جگہ تعمیر کیا گیا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ دریا کے کنارے بلند پہاڑی پر جس کے سامنے سرسبز میدان ہے اور اس سے آگے کوہ سیرانوادا کی برف پوش چوٹیاں ہیں۔ غرناطہ کی اہمیت فرڈی ننداور ازبیلا کے نزدیک اتنی زیادہ تھی کہ انہوں نے اپنی قبریں بھی اسی شہر میں بنوائیں۔

غرناطہ سے علامہ اقبال دوبارہ میڈرڈ آئے۔ میڈرڈ سے مس ویگے ناست کے نام

☆ مدینۃ الزہرا کے بارے میں اقبال کے تاثرات اس مطالعہ کا نتیجہ ہو سکتے تھے۔ جو انہوں نے اسلامی سپین کی تاریخ کا کیا ہے۔ کیونکہ اس کی تمام عمارات عربوں اور بربروں کی خانہ جنگی (۱۰۱۰ء) کے دوران تباہ و برباد ہو گئی تھیں۔

یہ خط لکھا۔

۲۱ جنوری ۱۹۳۳ء

میں جنوبی ہسپانیہ کے سفر کے بعد آج میڈرڈ پہنچا ہوں۔ افسوس ہے کہ میرے لئے اس مرتبہ ہائیڈل برگ آنا ناممکن ہوگا۔ مجھے وہ سارے ٹکٹ منسوخ کرانے پڑے جو میں نے لندن سے خریدے تھے۔ کیونکہ میرے لیے لازم ہے کہ میں وینس سے دس فروری ۱۹۳۳ء کو روانہ ہونے والا جہاز کونتے وردی پکڑوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں اپریل میں پھر انگلستان آؤں۔''[55]

آپ کا مخلص
محمد اقبال
(یورپ میں)

میڈرڈ یونیورسٹی میں ''اسپین اور فلسفہ اسلام'' کے موضوع پر پروفیسر آسن کی زیر صدارت ۲۴ جنوری ۳۳ء کو ایک لیکچر دیا۔ اس جلسے کی پوری کاروائی میڈرڈ کے اخبار ''ال دی بیت'' میں شائع ہوئی اس کا ترجمہ یہ ہے۔

''سر محمد اقبال ایک سیاح کی حیثیت سے اور عربک سکول کے ہسپانوی دانشوروں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے سپین آئے ہیں۔ گذشتہ شام انہوں نے مانکلو (Moncloa) میں فلسفہ و ادب کی فیکلٹی کی نئی عمارت میں ''اسلام کی فکری دنیا میں سپین'' کے زیر اہتمام ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ مسٹر آسن پیلائیش (Asim Polocious) نے کہا کہ علامہ اقبال ایک نکتہ سنج فلسفی اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ آپ ان منتخب ہستیوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے خوش قسمی سے اسلامی سپین میں شاعری کے آسمانی فن اور مابعد الطبیعات کے گہرے مطالعے کا ذوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے مزید کہا کہ علامہ اقبال (ایک فلسفی اور شاعر ہی نہیں بلکہ ایک سیاستدان کی حیثیت سے) گاندھی اور دیگر قابلِ ذکر ہندو اور مسلمان راہنماؤں کے ساتھ گول میز کانفرنس کے اعلیٰ کونسل کا اعزاز بھی رکھتے ہیں۔ (انہوں نے کہا) لیکن ہمارے مہمان (اقبال) گاندھی ایسے سیاستدانوں اور مقدس قوم پرست شخص سے مختلف ہیں۔ اقبال ایک دانشور ہیں۔ سیاست اور گول میز کانفرنس میں ان کی شرکت محض ایک اتفاقی امر ہے۔ گاندھی کے برخلاف انہوں نے یورپی طور طریقوں سے عدم مطابقت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جب کہ گاندھی نے اپنا مخصوص

لباس تبدیل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی تہذیبی نشوونما کیمبرج کی قانون کی یونیورسٹی میں ہوئی ہے۔ اس لیے وہ ایک نئے طرز کی جیکٹ کی حد تک یورپی لباس پہنتے ہیں۔ ان کے نسلی امتیاز کی علامت صرف ان کی ٹوپی ہے۔ اس سفر میں ان کے ساتھ ان کی صاحب زادی ہیں۔ دبلی پتلی (اس لڑکی کا) چہرہ کسی یورپین کی طرح گورا چٹا ہے۔

اپنے خطبے میں اقبال نے واضح کیا کہ اسلامی سپین کے شعراء اور فلسفیوں نے مشرق کے دور دراز حصّوں میں بسنے والے مسلم دانشوروں کو بے حد متاثر کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مشرق میں کس طرح (ان علماء) خصوصاً ابن عبدوں المسعودی اور الکندی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ان بے شمار تحقیقات کا بھی ذکر کیا جو اس سلسلے میں کی جا رہی ہیں۔

مسٹر آسن نے اپنی تعارفی تقریر میں اقبال کو ایک ایسا ماہر قانون قرار دیا جو اسلامی مشرق کی دور افتادہ حدود سے مسلمانوں کی روح کی صدائے بازگشت لے کر آئے ہیں۔ جو رومانوی انداز میں ہمیں قرونِ وسطیٰ کے اندلس کی یاد دلاتی ہے۔ انہوں نے تاریخ تصوف کے سلسلے میں اقبال کی کتاب ''فلسفہ عجم'' کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس میں انہوں نے ایرانی صوفیاء کے نظریات کا سراغ لگایا ہے۔ جن کا تعلق مرسیہ کے ابن عربی سے ہے جو شوپن ہار اور ہارٹ مین کے نظریات کے مطابق لاشعور کے اصول کا پیش رو ہے۔ سر محمد اقبال نے ابنِ عربی کی طرح فلسفیانہ نظریات کو اپنی عمدہ نظم ''اسرار خودی'' کے موزوں عنوان کے تحت شاعری کے موثر سانچوں میں ڈھالنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

وہ ابن عربی کے بارے میں کی جانے والی تحقیقات کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ہندوستان اور سپین جو کہ اسلامی دنیا کی دو انتہاؤں پر واقع ہیں۔ تہذیب کے مورخین کے نزدیک اس مشترکہ خصوصیت کے مالک ہیں۔ جس کی رو سے ان دونوں ملکوں کو تہذیبی امتزاج کی تجربہ گاہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کو آریائی اور سامی عناصر سے واسطہ پڑا اور اندلس میں یونانی، رومی اور عیسائی عناصر سے دوچار ہونا پڑا۔ ہندوستان میں یہ تہذیب تا حال جاری ہے، جبکہ اندلس میں صرف تاریخی تحقیق کا موضوع ہے اس کے باوجود اِن دونوں دور افتادہ ممالک کی عظیم ہستیاں اور فنون کی کشش یکساں طور پر محسوس کرتی ہیں۔ ۵۶

اس رپورٹ میں اخبار کے نامہ نگار سے ایک جگہ سہواً ہو گیا ہے کہ علامہ اقبال کا مفہوم کچھ اور ہوگا۔ لیکن نامہ نگار اسے غلط سمجھا۔ ابن زیدون تو اندلس کا ہی ہے۔ البتہ المسعودی اور

الکندی مشرق کے ہیں۔ اس کے علاوہ نامہ نگار کے ساتھ دوسرے لوگوں نے بھی اقبال کے ساتھ شریک سفر لڑکی کو اُن کی بیٹی سمجھا۔ اس سلسلے میں جاوید اقبال کے مطابق یا تو وہ ایک عام گائیڈ ہو گی یا انگریزی حکومت کی طرف سے علامہ اقبال کی نگرانی کے لیے ایک جاسوس کی شکل میں ہمراہ کر دی گئی ہو گی۔ کیونکہ ان دنوں یورپ میں سیاسی کش مکش عروج کی طرف جا رہی تھی۔ علامہ اقبال کا پروگرام آسٹریا اور جرمنی جانے کا بھی تھا اور پچھلے سال وہ اٹلی کے مسولینی سے مل بھی چکے تھے۔ دوسری وجہ زیادہ قرین قیاس لگتی ہے۔ اور شاید اسی بنا پر علامہ اقبال نے اپنا مجوزہ پروگرام منسوخ کر دیا ہو۔ اس کے بارے میں چوہدری خاقان حسین کے ذریعے ایک کہانی بھی بن گئی ہے اس کے بیان کے مطابق

''ایک دِن آپ (اقبال) نے سپین کے سفر کا ایک اچھوتا واقعہ سنایا جس کے پس منظر کا شاید ہی کسی کو علم ہو۔ فرمانے لگے کہ لندن کے قیام کے دوران وہ نواب آف بھوپال سے ملنے گئے تو انہوں نے فرمایا اقبال اسپین کیوں نہیں جاتے؟ میں نے عرض کیا کہ اگر میں بھی نواب بھوپال ہوتا تو اب تک ہو آیا ہوتا۔ بات آئی گئی ہو گئی دوسرے روز مجھے میرے ہوٹل میں نواب صاحب بھوپال کا ایک چیک چھ ہزار روپے کا ملا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سفر کے لیے ہے۔ چنانچہ میں نے اخبار میں ایک سیکرٹری کی ضرورت کا اشتہار دیا۔ اور ایک موزوں لیڈی سیکرٹری کا انتخاب کر کے اسے سفر کی تفصیلات بتائیں اور یہ ہدایت کی کہ روانگی سے اختتام سفر تک وہ مجھ سے کوئی گفتگو نہیں کرے گی۔ چیک کی ساری رقم میں نے اس کے حوالے کر دی اور سفر کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہ اس قدر کارگزار سیکرٹری ثابت ہوئی کہ مجھے سفر میں کہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی اس نے میری رہائش کا بہت اچھا انتظام کیا۔ اس سیکرٹری کے بارے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال کی عادت اور مزاج سے واقف ہونے کے بعد اس نے اچانک اپنا رویہ تبدیل کر دیا اور پرائیویٹ سیکرٹری سے بڑھ کر ایک مرید کی طرح آپ کی خدمت گزاری میں مصروف ہو گئی۔ جب علامہ نے اس اچانک اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا آپ مجھے کوئی آسمانی مخلوق معلوم ہوتے ہیں۔ ۵۷۔

اس میں پہلے حصے کی تردید سب نے کی ہے۔ البتہ دوسرے حصے کے بارے میں عطیہ بیگم فیضی کو لکھتے ہیں۔

''..... اسپین میں میری پرائیویٹ سیکرٹری نے (جو ایک انگریز خاتون تھی) کچھ عرصہ ساتھ رہنے کے بعد اپنا رویہ تبدیل کر دیا اور روزمرہ کے معمول میں بالکل ایک مرید کی طرح میری

خدمت شروع کر دی۔ میں نے اس کے اس یک لخت رویے کو محسوس کر کے اس سے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ اس راز کا اس پر انکشاف ہو گیا ہے کہ میں ایک غیر مرئی ہستی اور ولی ہوں۔ ایسی صورت میں میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں اپنے متعلق یقین کے ساتھ کچھ کہہ سکوں سوائے اس کے کہ اپنی اس حیثیت سے انکار کر دوں کہ میں بے وقوف نہیں ہوں۔ ۵۸

صبا لکھنوی کی ایک اور روایت جس میں کہا گیا ہے کہ قیام لندن یا سفر کے دوران علامہ اقبال کی ایک نوٹ بک جس میں کلام اور یادداشتیں تھیں کہیں گم ہو گئی ہے۔ [59] ناقدین کے مطابق اگر ایسا ہوتا تو علامہ اقبال اس کا ذکر ضرور کسی اور سے بھی کرتے۔ جب اندلس سے واپس آنے لگے تو نظم ''ہسپانیہ'' کہی جس کا ابتدائی شعر یہ ہے۔

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امین ہے مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں ۵۹

۲۶ جنوری ۱۹۳۳ء کو اندلس سے پیرس واپس پہنچ گئے۔ یہیں سے یکم فروری ۱۹۳۳ء کو مہر صاحب کے نام مندرجہ ذیل خط لکھا۔

ڈیر مہر صاحب

السلام علیکم! کل ''انقلاب'' کے بہت سے نمبر اقبال شیدائی صاحب سے مل گئے۔ جن کو پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔ ۲۶ جنوری کو ہسپانیہ کے سفر سے واپس آیا۔ اب ۱۰ فروری کو وینس سے اطالوی جہاز ''کانٹے وردی'' پر سوار ہو کر ۲۲ کی صبح کو انشاء اللہ العزیز بمبئی پہنچ جاؤں گا۔ ہسپانیہ میں جو کچھ دیکھا ایک خط کے ظرف تنگ میں کیوں کر سما سکتا ہے۔'' ۶۰

دوسرا خط منشی طاہر دین کو لکھا

پیرس ۲۶ جنوری ۱۹۳۳ء

ڈیئر منشی طاہر دین۔ السلام علیکم

میں آج شام ہسپانیہ سے مع الخیر واپس آ گیا ہوں۔ خدا کے فضل و کرم سے وہاں ہر طرح کی خیریت رہی اور اپنی خواہش کے مطابق مسجد قرطبہ میں نماز پڑھی۔ اب یہاں چند روز قیام کر کے وینس جاؤں گا۔ وہاں سے جہاز ۱۰ فروری کو چلتا ہے۔ انشاء اللہ ۲۶ فروری کی صبح کو بمبئی پہنچ جاؤں گا۔ احباب سے دُعا کی درخواست کریں۔ ۲۴ جنوری کی شام میں میڈرڈ (دارالسلطنت ہسپانیہ) میں ''اسلام اور ہسپانیہ'' پر وہاں

کے وزیر تعلیم کی درخواست پر لیکچر دیا۔'' ۶۱

قیام پیرس کے دوران انہوں نے ایک غزل کہی جس کا مطلع ہے۔

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام

اس کے تین اور شعر بھی ملاحظہ فرمایئے

حلقہ صوفی میں ذکر ، بے نم و بے سوز و ساز
میں بھی رہا تشنہ کام! تو بھی رہا تشنہ کام
عشق تیری انتہا ، عشق میری انتہا
تو بھی ابھی ناتمام ، میں بھی ابھی نا تمام
آہ کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مالِ فقیر سلطنتِ روم و شام ۶۲

فروری کے ابتدائی ہفتہ میں علامہ اقبال یورپ میں ہی رہے وہاں انہوں نے دو بڑی خوبصورت اور پر تاثیر غزلیں کہیں جو فنی اور معنوی لحاظ سے اعلیٰ مقام رکھتی ہیں پہلی غزل کا مطلع ہے۔

زمستانہ ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی ۶۳

دوسرا شعر ہے

کہیں سرمایہ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہیں سب کو پریشان کر گئی میری کم آمیزی! ۶۴

دو شعر اور دیکھئے

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی! ۶۵
سوادِ رومتہ الکبرائے میں دلی یاد آتی ہے
وہی غیرت ، وہی عظمت، وہی شانِ دلآویزی! ۶۶

دوسری غزل کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے۔

خِرد نے مجھ کو عطا کی نظرِ حکیمانہ
سِکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ!

مقام عقل سے آسان گزر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ! ۶۷

۲۲ فروری ۳۳ء کو بمبئی پہنچے۔ وہاں کے اخبار خلافت کے نامہ نگار کو انہوں نے سیاحت اندلس کے بارے میں جو انٹرویو دیا اس کے چند اقتباسات یہ ہیں۔

''مجھے لندن میں اسپین جا کر لیکچر دینے کی دعوت ملی تھی۔ اسلام کے اس مرکز کو دیکھنے کا مجھے پہلے ہی سے شوق تھا۔ اس لیے میں نے دعوت قبول کر لی۔ مجھے وہاں پہنچنے سے پہلے تقریر کے موضوع کا کوئی علم نہ تھا۔ البتہ خواہش یہ تھی کہ ایسا موضوع ملے جس پر تقریر کرتے ہوئے اسلامی ثقافت و تمدن اور اسلامی فلسفہ پر کچھ کہہ سکوں وہاں پہنچنے پر پروفیسر آسن کو میں نے انتخاب مضمون کا اختیار دے دیا۔ اتفاق سے انہوں نے بھی وہی مضمون تجویز کیا جس کا میں خود خواہش مند تھا۔ یعنی

''اسپین اور فلسفہ اسلام''

میرا لیکچر میڈرڈ کی جدید یونیورسٹی میں ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ جس میں میں نے اسپین کے مسلمانوں کے تمدن، فلسفہ اور ان کی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کی تشریح و تفسیر بیان کرتے ہوئے حاضرین سے اپیل کی کہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کریں نہ ہسپانیوں کے غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہوں بلکہ عربوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔

میں نے موقع غنیمت سمجھ کر ملک کے متعدد مشہور تاریخی مقامات و آثار کا بہ نظر غائر معائنہ کیا۔ میں اپنے تاثرات کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح یہودیوں کے لئے ارض موجودہ فلسطین ہے۔ اسی طرح عربوں کے لیے غالباً اسپین کی سرزمین موعودہ تھی۔ اس قدر خوبصورت، اس درجہ پر فضاء اور آرام دہ ملک .....

''پروفیسر آسن عربی زبان کے پروفیسر اور بہت ہی خوش خلق و ملنسار آدمی ہیں۔ ان کا ایک شاگرد قرطبہ کی قدیم یونیورسٹی کا پرنسپل ہے۔ اس یونیورسٹی میں عربی کی تعلیم پر بہت زور دیا جا رہا ہے۔''

ایک سوال کے جواب میں علامہ اقبال نے فرمایا۔

''اس وقت تو وہاں کوئی مسلمان نہیں۔ لیکن تعلیم یافتہ طبقہ اب عربی النسل ہونے پر فخر کا اظہار کرنے لگا ہے۔ اور ہر اچھی چیز کو مورش (مورسکو) کہہ دیتا ہے۔ یعنی ان میں اسلام کی طرف سے بغض و عناد کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور وہ اسلامی تہذیب و تمدن اور فلسفہ مذہب کا مطالعہ بڑے ذوق کے

ساتھ کرتے ہیں۔ اسپین میں اکثریت رومن کیتھولک کی ہے۔ لیکن یہ مذہب روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ گرجے آباد تو ہیں مگر ان میں غریب طبقہ جاتا ہے۔ یہ حالت تقریباً ہر یورپین ملک کی ہے۔''

عربوں کے زمانے کی عمارتوں کے متعلق سوال کیا گیا تو علامہ اقبال نے اس کا یہ جواب دیا۔

''جن مسجدوں کو گرجا میں تبدیل کر دیا گیا تھا وہ اب تک مسجدوں کی شکل میں نہیں آئیں۔ البتہ چند واگزاشت ہو گئی ہیں۔ اور باقی کے متعلق امید ہے کہ تعصب و عناد کی کمی ہونے پر واگزاشت ہو جائیں گی۔ اسپین کی زبان میں عربی الفاظ بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ 'ال' تو اکثر الفاظ میں ملا ہوتا ہے۔''

اقبال نے آخر میں مشورہ دیا۔ ضرورت ہے کہ یہاں سے دو چار ایسے تعلیم یافتہ طلبہ اسپین بھیجے جائیں جو فلسفہ الٰہیات، عربی تمدن، اسلامی تاریخ اور مذہب سے اچھی طرح واقف ہوں تاکہ وہ اسلام کا صحیح معنوں میں نمونہ پیش کر سکیں۔'' ۶۸

۲۵ فروری ۱۹۳۳ء کو علامہ اقبال فرنٹیر میل سے واپس لاہور پہنچ گئے۔ ۶۹۔ اور بقول جاوید اقبال گفتگو زیادہ تر سیاحت ہسپانیہ کے متعلق ہی ہوئی۔ بار بار مسجد قرطبہ کا ذکر فرماتے رہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا مسجد قرطبہ ہمیشہ کے لیے ان کے دل میں بس گئی ہے۔ ۷۰

۲۶ فروری کو سفر اندلس کے بارے میں روزنامہ انقلاب لاہور ہی میں ان کا ایک بیان شائع ہوا جس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

''یورپ کے مختلف ممالک میں پھرنے اور موجودہ زمانے کی ابتری دیکھنے کے بعد میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کو بحیثیت دین قبولیت پانے کا یہ بہترین وقت ہے۔ آج لاکھوں نہیں کروڑوں یورپ کے مرد اور عورتیں اسلام اور اس کے کلچر کی تعلیمات سمجھنے کے خواہاں ہیں۔ نوجوان جس قدر جلد اس حقیقت کو سمجھ لیں اتنا ہی اچھا ہے۔ یورپ کے مسلمان اب اس حقیقت کو ضرور سمجھتے ہیں وہ آئندہ اگست میں جینوا میں ایک کانفرنس منعقد کر رہے ہیں جس کے اغراض و مقاصد محض معاشرت اور کلچر تک محدود ہوں گے۔ مجھے امید ہے ایشیاء اور افریقہ کے مسلمان کانفرنس کو کامیاب بنانے میں دلی تعاون پیش کریں گے۔'' ''میں نے قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، طلیطلہ اور میڈرڈ کی سیاحت کی قرطبہ کی تاریخی مسجد اور غرناطہ کے قصر الحمرا کے علاوہ مدینہ الزہرا کے کھنڈر بھی دیکھے ہیں۔ یہ مشہور عالم قصر عبدالرحمٰن ثالث نے اپنی چہیتی بیوی زہرا کے لیے

ایک پہاڑ پر تعمیر کرایا تھا۔ آج کل یہاں کھدائی کا کام جاری ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں ایک مسلمان موجد نے یہاں سب سے پہلے اپنے ایک ہوائی جہاز کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہاں پر منجملہ اور لوگوں کے وزیر تعلیم ہسپانیہ سے بھی ملاقات ہوئی یہ صاحب ہسپانیہ کی موجودہ روایات کے خلاف بہت خلیق اور روشن خیال ہیں۔ ان کے علاوہ ''ڈوائن کامیدی اینڈ اسلام'' کے شہرہ آفاق مصنف پروفیسر آسن سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔'' جنوبی اسپین میں رہنے والے لوگ اپنی موری الاصل ہونے اور اسلامی تہذیب کی عظیم الشان یادگاروں کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ اب ملک بھر میں بیداری کی ایک لہر دوڑ رہی ہے۔ اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ اسے اور بھی فروغ حاصل ہوگا۔ لوتھر کی اصلاحی تحریک ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ یورپ کے مختلف ممالک میں اب بھی یہ تحریک خاموشی سے اپنا کام کر رہی ہے۔ اور بالخصوص ہسپانیہ میں پادریوں کا اثر آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے۔ ۷۱

۲۸ فروری کو لاہور میں لارڈ لوتھین کے نام یہ خط لکھا۔

''میں جب (اسپین میں) پرادامیوزیم (مجریطہ میڈرڈ) دیکھنے گیا تھا تو میں نے بار بار آپ کے مصورانہ کمالات کو مشعل راہ بنا کر یورپ کے عظیم مصوروں کو سمجھنے کی کوشش کی تھی ان اساتذہ فن کی بنائی ہوئی تصویریں کس خوبصورتی کے ساتھ اس میوزیم میں سجی ہوئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میوزیم مجھے لوور (پیرس) کے مقابلے میں کہیں زیادہ دلچسپ معلوم ہوا۔ ۷۲

اقبال نے سفر اندلس کے مشاہدات و تاثرات مختلف صحبتوں میں بیان کیے جن میں چند باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔

''ہسپانیہ میں میں نے ایک چیز کا بغور مشاہدہ کیا اور وہ مسلمانوں کا انمٹ نقش ہے جو وہاں کے در و دیوار سے ہویدا ہے۔ وہاں کی فضاء میں عربوں کی نشاۃ ثانیہ (Mosrish Reniual) کے آثار پیدا ہیں۔ ۷۳

ایک صحبت میں اقبال نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ ہسپانیہ میں کسی مسلمان کا مزار نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔

''مسلمانوں نے سپین میں آٹھ سو برس حکمرانی کی لیکن اس سرزمین پر کسی مسلمان کا نشان مزار تک نظر نہیں آیا۔'' ۷۴

اس عجیب بات کی توجیہہ انہوں نے یوں کی کہ ہسپانیہ میں مسلمانوں سے حکومت چھن جانے کے بعد مسلمانوں کی ہر چیز کو مٹا دیا گیا یا غارت کر دیا تھا۔ مزاروں کو زمین کے برابر کر دیا

گیا۔ (اب اندلس میں صرف غرناطہ کے آخری بادشاہ ابوعبداللہ کے چچا کی قبر ایک پہاڑی پر موجود ہے۔ یہ بھی غرناطہ کا بادشاہ تھا۔) اس پہاڑی کو ''مولائی حسن'' کہتے ہیں۔ اس قبر کے سوا اندلس میں کسی مسلمان کی قبر کا نشان نہیں ہے۔ سیاحت اندلس کے دوران ایک اور عجیب بات ان کے مشاہدے میں یہ آئی کہ اس ملک میں پرانی مساجد کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مسلمانوں کے ہسپانیہ سے اخراج کے بعد تعصب سے عیسائیوں نے ان تمام مساجد کو سخت بیدردی سے گرا دیا ہوگا۔ اور یا پھر خود مراکشی مسلمانوں کو بے ضرورت مساجد تعمیر کرنے کا وہ شوق نہ تھا۔ جو ہندوستان کے مسلمانوں کو ہے۔ ۷۵

علامہ اقبال کی دوسری توجیہہ غالباً درست نہیں ہے کیونکہ ہمیں اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اس ملک میں بے شمار مسجدیں تھیں۔ صرف قرطبہ میں مساجد کی تعداد سات سو بیان کی گئی ہے اس کے علاوہ موجودہ زمانے میں بھی بہت سے گرجے اسپین میں ایسے ہیں جن کی ساخت سے صاف طور پر اُن کے مساجد ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ پہلی وجہ جو بیان ہوئی ہے وہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ ۷ مارچ کو لارڈ لوتھین کو لکھتے ہیں۔

..... ہسپانیہ اور فرانس میں میرا وقت بہت دلچسپی سے گزرا۔ پیرس میں قیام کے دوران برگساں سے ملاقات ہوئی۔ جدید فلسفے اور تمدن (Civilization) پر ہماری گفتگو تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہی۔ کچھ وقت ہم نے برکلے پر تبادلہ خیال کیا جس کے فلسفہ پر بعض فرانسیسی فلاسفروں نے بعض دلچسپ مشاہدات پیش کیے ہیں۔ ہسپانیہ میں قیام کے دوران میں عربی کے بہت سے پروفیسروں سے میرا رابطہ قائم ہوا جو اسلام کے کلچر کے بارے میں بہت پرجوش نظر آتے ہیں۔ میڈرڈ یونیورسٹی نے Spain and the International World of Islam کے موضوع پر مجھ سے یونیورسٹی میں خطاب کرنے کی درخواست کی میرے خطاب کو بے حد سراہا گیا۔ صدارت پروفیسر آسن نے کی جو Divine Comody of Islam کے معروف مصنف ہیں۔ ہسپانیہ کی نئی حکومت غرناطہ کو دنیائے اسلام کے لیے ایک طرح کا ''تہذیبی مکہ'' بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ میرے خیال میں مناسب ترین وقت یہی ہے کہ انگلستان کو اسلام کے تہذیبی پہلو میں سنجیدگی کے ساتھ دلچسپی لینی چاہیے۔ درحقیقت ایک معاشی نظام کی حیثیت سے اسلام کہیں زیادہ دلچسپ ہے اور ہماری موجودہ مشکلات کے کہیں زیادہ عملی حل تجویز کرتا ہے۔'' ۷۶

۲۷ مارچ ۱۹۳۳ء کو علامہ اقبال نے محمد اکرم کو خط لکھا جس میں اندلس کی سیاحت کے

تاثرات مرقوم ہیں۔ اس خط کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

''آج صبح دہلی سے واپسی پر عنایت نامہ وصول ہوا یاد آوری کے لیے ممنون ہوں۔ ہسپانیہ پر نظم یوں تو تمام پرسوز ہے لیکن طارق کے متعلق اشعار بالخصوص دل گداز ہیں۔ میں اسے محفوظ رکھوں گا اور کوشش کروں گا کہ یہ اشعار اردو میں منتقل ہو سکیں۔ میں اپنی سیاحتِ اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجدِ قرطبہ پر لکھی جو کسی وقت شائع ہو گی۔ الحمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا۔ لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت پر پہنچا دیا جو پہلے مجھے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ میڈرڈ یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ''ہسپانیہ اور اسلام کے ذہنی ارتقاء'' کے زیر عنوان ایک لیکچر دوں۔ یہ لیکچر نہایت پسند کیا گیا پروفیسر آسن کے جو Divine Comody and Islam کے مصنف ہیں بحیثیت صدر اپنی اختتامی تقریر میں میری تعریف و توصیف میں خوب مبالغہ کیا۔'' ۷۷

اس خط میں ایک الجھاؤ ہے۔ ''ہسپانیہ'' پر جو نظم ہے وہ بھی اردو میں ہے اور ''طارق کی دعا میدان جنگ میں'' یہ بھی اردو میں ہے۔ اب علامہ اقبال کا یہ جملہ کہ 'میں کوشش کروں گا' کہ یہ اشعار اردو میں منتقل ہو سکیں۔'' قابل فہم نہیں۔

جامعہ دہلی کی طرف سے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے علامہ اقبال کو سیاحت یورپ کے بارے میں ایک لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔ چنانچہ علامہ صاحب نے ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کے خط میں نیازی صاحب کے ذریعے یہ پیغام پہنچایا۔

''سید ذاکر حسین صاحب سے کہہ دیجئے کہ ۱۴ اپریل کو مسئلہ ایجوکیشن پر وائسرائے کے ہاں کانفرنس ہے۔ اس کے نوٹس میں مجھے مدعو کیا گیا ہے۔ کیونکہ لندن میں جو سب کمیٹی اس کے لیے بنی تھی۔ اس کا میں بھی ممبر تھا۔ غالباً دو تین روز یا ممکن ہے ایک ہی روز یہ کانفرنس رہے۔ ذاکر صاحب ۱۵ اپریل کو میرا لیکچر رکھ سکتے ہیں جس کا عنوان ہوگا

"From London to Granada"

اقبال ۱۵ اپریل کو دہلی پہنچے۔ اس شام کو تقریر ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بحیثیت صدر جلسہ اور شیخ جامعہ علامہ اقبال کا تعارف کروایا۔ علامہ اقبال نے اپنی تقریر میں لندن سے غرناطہ تک کے سفر کے حالات بتائے۔ برگساں سے ملاقات کا ذکر بھی کیا۔ پھر اندلس، الحمرا اور قرطبہ کے متعلق بتاتے رہے۔ لیکچر کے خاتمے پر ان سے تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی گئی۔ اقبال نے

''مسجد قرطبہ'' کے مندرجہ ذیل دو بند تحت اللفظ سنائے جس وقت آپ اشعار پڑھ رہے تھے سارے مجمع پر وجد کا عالم طاری تھا۔

کعبۂ ارباب فن ! سطوت دین مبین
تجھ سے حرم مرتب اندلسیوں کی سرزمین

ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلمان میں ہے اور نہیں ہے کہیں

آہ ! وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حامل ''خلق عظیم'' صاحب صدق یقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہل دِل فقر ہے، شاہی نہیں!

جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب
ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دِلی و گرم اختلاط، سادہ و روشن جبیں

آج بھی اِس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دِل نشیں

بوئے یمن آج بھی اسکی ہواؤں میں ہے !
رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے!

دیدہ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

کون سی وادی میں ہے کون سے منزل میں ہے
عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جاں

دیکھ چکا المنی ، شورش اصلاح دین
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں

حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیر کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیء نازک رواں

چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں

ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

روح مسلم میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہ نہیں سکتی زباں!

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا ! ۸۷

اِس کے بعد بھی اکثر اوقات ذکر اندلس ہوتا رہتا تھا۔ اقبال اپنے سفر کے بارے میں اکثر مجلسوں میں آخری ایام تک اپنے تاثرات سے لوگوں کو آگاہ کرتے رہے۔

ادارہ معارفِ اسلامیہ کے تحت اس کا پہلا اجلاس ہیلی ہال پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ۱۵ اپریل ۱۹۳۳ء زیر صدارت علامہ اقبال ہوا۔ جس میں علامہ اقبال نے یورپ کے کتب خانوں میں مسلمانوں کے محفوظ ذخائر کی تلاش پر زور دیا۔ انہوں نے کہا: ''وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اب ہم

فقہی جذبات کی چھان بین کی بجائے ان اہم شعبہ ہائے علم کی طرف متوجہ ہوں جو ہنوز محتاج تحقیق ہیں۔ ریاضیات، عمرانیات، طب اور طبعیات میں مسلمانوں کے شاندار کارنامے ابھی تک دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مستور و پنہاں ہیں جن کے افشاء کی سخت ضرورت ہے۔ یورپ کے علماء بیسویں صدی میں جن نظریات، انکشافات کو زمانہ حال کا سمجھتے ہیں ان پر عرب علماء و فضلاء صدیوں پہلے سیر حاصل بحثیں کر چکے ہیں۔ آئن سٹائن کا نظریہ اضافت یورپ کی نزدیک نیا ہو تو ہو لیکن علمائے اسلام کی کتابوں میں صدہا سال پہلے اس کے مبادی زیر بحث آچکے ہیں۔ برگساں کے فلسفہ امتیازی کو سمجھنے کے لیے ابن خلدون کے افکار و خیالات کا مطالعہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ آپ نے پنگلر کی شہرہ آفاق کتاب ''زوال مغرب'' کے ان ابواب کا حوالہ دیا جن میں عربی تمدن پر بحث و تمحیص کی گئی ہے۔ آپ نے مصنف کے استنتاج پر ناقدانہ تبصرہ فرماتے ہوئے خود مسلم علماء و فضلاء کو دعوت دی کہ وہ اپنے تمدن کی گہرائیوں کا مطالعہ کریں۔ اور ان اسرار و ممکنات کو قوم کی تقدیر کے روشن کرنے اور قوم کے متخیلہ کی تربیت کرنے میں صرف کریں۔ تا کہ مسلمان اپنے قابل صد فخر و مباہات تمدن کو بیش از بیش خوبی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔''۹۷

☆☆☆

حواشی

(۱) عطاالله شیخ مرتب ''اقبال نامہ'' حصہ دوم، ناشر شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۵۱ص۔۔۲۸۴

(۲) ایضاً ص۔۲۳۰

(۳) روز نامہ انقلاب لاہور ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء

(۴) جاوید اقبال، زندہ رود، حصہ سوم ص ۲۱۱

(۵) امیر شکیب ارسلان، جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے، ترجمہ نجم الدین احمد شکیب انجمن ترقی اردو کراچی۔۱۹۸۷

(۶) گستاؤلی بان تمدن عرب مترجم سید علی بلگرامی، مقبول اکیڈمی، لاہور۔ص ۴۵۲

(۷) امیر شکیب ارسلان۔ص۔۲۸۶، (۸) اقبال بال جبریل ص 150-149

(۹) جاوید اقبال، زندہ رود، ص 496

(۱۱) روز نامہ انقلاب لاہور ۱۳۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء

(۱۲) روز نامہ انقلاب لاہور ۲۷ نومبر ۱۹۳۲ء

(۱۳) اس وقت موجود ملک بوسینیا، اسٹریا اور یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کی دینی راہنمائی بوڈاپسٹ کا مفتی اعظم ہی کرتا تھا۔

(۱۴) روز نامہ انقلاب لاہور، ۱۱ جنوری ۱۹۳۳ء

(۱۵) اقبال، بال جبریل، ص ۴۶

(۱۶) بشیر احمد ڈار، مرتب انوار اقبال، اقبال اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۷ء ص ۱۰۱

(۱۷) روز نامہ انقلاب، ۱۵ جنوری ۱۹۳۳ء

(۱۸) غلام دستگیر رشید، آثارِ اقبال، ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن، ۱۹۴۴، ص ۱۵۷

(۱۹) جاوید اقبال، زندہ رود، حصہ سوم۔ص ۲۱۲

(۲۰) بشیر احمد ڈار، انوار اقبال، ص ۱۰۳

(۲۱) ڈارتھی لوڈر، ہسپانیہ ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔۱۹۶۴ء

(۲۲) ڈارتھی لوڈر، ہسپانیہ ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔۱۹۶۴ء ص ۷۳

(۲۴) عبداللہ قریشی، آئینہ اقبال، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۶۷۔ص ۱۴

(۲۵) لین پول، مورزان سپین، مترجم حامد علی صدیقی، ایم۔ایم سعید کمپنی کراچی سن ندارد ص ۴۰

(۲۶) محمد عبداللہ قریشی، ص ۱۴

(۲۷) محمد عبداللہ قریشی ص ۱۴۔ مدینۃ الزہرا کی پہلی کھدائی، ۱۹۱۰ء میں دوسری کھدائی ۱۹۳۰ء

میں ہوئی۔ مزید تفصیل کے لیے Islamc Studies Page: 129 دسمبر ۱۹۹۱ء، اسلام آباد۔

(۲۸) نکہت شاہجہاں پوری، موازنہ حبیب کتاب منزل لاہور، ۱۹۶۰ء۔ ص ۱۷

(۲۹) گرجا بننے کی وجہ سے مسجد مسمار ہونے سے بچ گئی۔

(۳۰) عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، بزم اقبال لاہور۔ ۱۹۵۵ء ص ۱۸۲

(۳۱) جاوید اقبال۔ زندہ رود۔ ص۔ ۱۷۔ ۲۱۶

(۳۲) وحیدالدین فقیر، فقر روزگار، جلد اول، سید برادرز لاہور، ۱۹۵۰ء ص ۱۳۹

(۳۳) عبدالسلام خورشید سرگزشت اقبال، قومی کتب خانہ، لاہور ۱۹۵۸ء۔ ص۔ ۴۱۹

(۳۴) راوی کو اس ہستی کے نام کے سلسلہ میں سہو ہوا ہے۔ ڈاکٹر آرنلڈ۔ ۱۹۳۰ء میں انتقال کر چکے تھے۔ اس لیے ڈاکٹر اقبال کی مدد کرنے والے ڈاکٹر آرنلڈ کی بجائے شاید کوئی دوسرے استاد ہوں گے۔ ڈاکٹر رحیم بخش شاہین، ڈاکٹر اقبال ریویو، جولائی۔ ۱۹۷۷ء

(۳۵) ڈاکٹر رحیم بخش شاہین، اقبال ریویو، جولائی۔ ۱۹۷۷ء

(۳۶) محمود نظامی، ملفوظات اقبال اشاعت منزل لاہور، ۱۹۴۹ء۔ ص ۳۱۸

(۳۷) سید اختر درانی، ''اقبال یورپ میں''

(۳۸) وحیدالدین فقیر۔ ص۔ ۱۳۹

(۳۹) عبدالحمید، اقبال کے چند جواہر ریزے۔ اقبال اکیڈمی لاہور، ۱۹۴۷ء ص۔ ۴۳

(۴۰) عبدالحمید۔ ص ۴۳۔

(۴۱) ص ۴۴

(۴۲) یوسف سلیم چشتی اقبال ریویو۔ کراچی جولائی ۱۹۴۴ء

(۴۳) اقبال، بال جبریل، ص ۵۷

(۴۴) مزید تفصیل کیلیے دیکھئے داستان مور سکو اور تمدن اندلس کا زوال، تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات۔ ص ۲۲۳

(۴۵) اقبال، بالِ جبریل ص ۹۹

(۴۶) مظفر حسین برنی، مرتبہ کلیاتِ مکاتیب اقبال جلد سوم اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۳ء، ص ۳۹

(۴۷) روزنامہ انقلاب لاہور۔ ۹ فروری ۱۹۳۳ء

(۴۸) روزنامہ انقلاب لاہور۔ ۹ فروری ۱۹۳۳ء

(۵۰) اس کا زیادہ تر حصہ عیسائی بادشاہ نے مسلمان کاریگروں سے بنوایا تھا۔ جو اس کی رعایا تھے۔

(۵۱) اسکو جبرالڈہ کہا جاتا ہے یہ اس مسجد کا مینار ہے جسے المنصور نے ۱۱۹۵ء میں تعمیر کرایا تھا۔

(۵۲) محمود نظامی۔ ص۔ ۱۵۸۔ ملفوظات اقبال

(۵۴) محمود نظامی۔ ص۔ ۱۸۰

(۵۵) مظفر حسین برنی، کلیات، مکاتیب اقبال، جلد سوم۔ ص۔ ۳۱۰

(۵۶) رحیم بخش، شاہین، ڈاکٹر اقبال ریویو، جولائی اکتوبر، ۱۹۷۷ء۔ ص

(۵۷) صبا لکھنوی، اقبال اور بھوپال، اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۷۳ء۔ ص

(۵۸) ابواللیث صدیقی ڈاکٹر، روح مکاتیب اقبال بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۷ء ص ۶۹۵

(۵۹) اقبال، بالِ جبریل۔ ص۔ ۱۰۳۔

(۶۰) بشیر احمد ڈار، انوار اقبال۔ ص۔ ۱۰۲

(۶۱) رفیع الدین ہاشمی، خطوط اقبال، مکتبہ خیابانِ ادب لاہور۔ ۱۹۷۴ء ص۔ ۲۱۱

(۶۲) اقبال کلیات اقبال اردو، ص۔ ۳۵۴

(۶۳) اقبال، بال جبریل۔ ص ۶۱

(۶۵) اقبال بال جبریل۔ ص۔ ۶۱

(۶۷) اقبال بال جبریل۔ ص۔ ۷۶ (۶۸) عبداللہ قریشی مرتبہ آئینہ اقبال۔

(۶۹) روزنامہ انقلاب۔ لاہور، ۲۶ فروری ۱۹۳۳ء

(۷۰) جاوید اقبال زندہ رود حصہ سوم۔ ص۔ ۲۳۰

(۷۱) روزنامہ انقلاب، لاہور، ۲۶ فروری ۱۹۳۳ء

(۷۲) مظفر حسین برنی کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، حصہ سوم ص ۳۱۹

(۷۳) محمود نظامی، ملفوظات اقبال، ص ۳۱۹

(۷۴) وحیدالدین فقیر، روزگارِ فقیر۔ حصہ اول۔ ص ۴۸

(۷۵) غلام دستگیر آثار اقبال، ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۴ء، ص ۷۷

(۷۶) رفیع الدین ہاشمی۔ خطوط اقبال۔ ص۔

(۷۷) شیخ عطاءاللہ۔ اقبال نامہ جلد دوم، شیخ محمد اشرف۔ ۱۹۵۱ء۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲

(۷۸) رئیس احمد جعفری، اقبال، شیخ نذیر احمد کتب خانہ، تاج آفس بمبئی، سن ندارد ص ۱، ۳، ۲۹

(۷۹) محمد رفیق افضل گفتار اقبال۔ ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور، نومبر ۱۹۷۷ء۔ ص۔ ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰

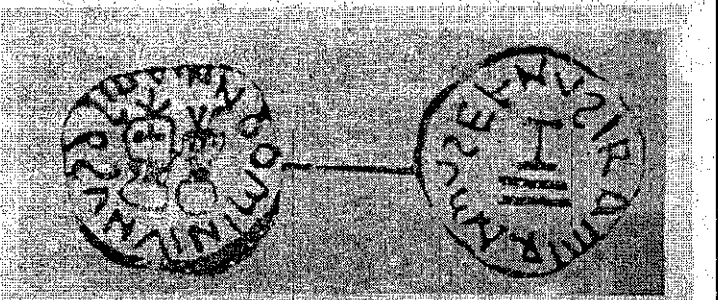

1. Copper coin (fals) of Musa bin Nusayr with Latin inscription.

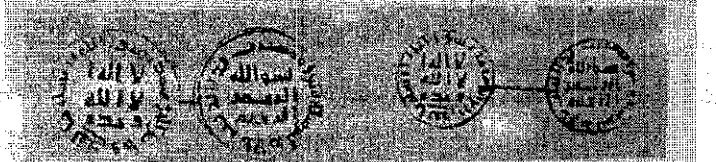

2. Gold coins *(dinars)* of the year 102 H/720-21 A.C.

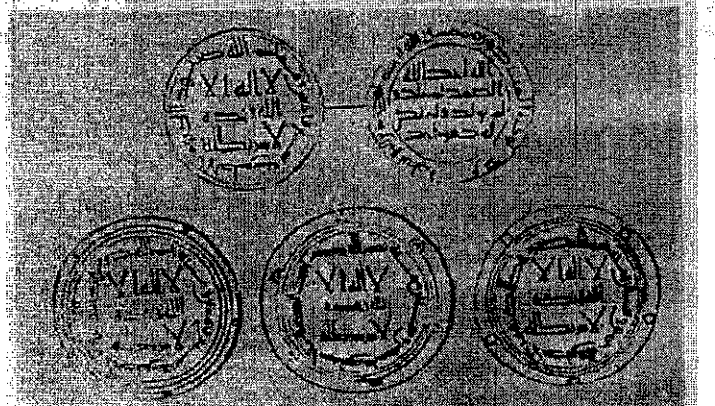

3. Silver coins *(dirhams)* of 'Abd al-Rahman I, dated 149 H/66- / A.C.

چوتھا باب

اندلسی شخصیات سے اقبال کے جذباتی و فکری روابط

اقبال کے لیے اندلس کی تاریخ کے مصادر و مراجع، ادب، آثار اور میراث خاص طور پر مصدر الہام تھے۔ انہوں نے اندلسی شخصیات سے متاثر ہونے کے علاوہ ان کے نظریات و افکار سے اخذ و استفادہ بھی کیا علامہ اقبال کے سامنے انگلستان جانے سے پہلے تاریخ اندلس سے متعلق کئی کتابیں ہندوستان میں طبع ہو چکی تھیں۔ معلومہ کتب میں سب سے پہلے ابوالفدا کی عربی کتاب کا ترجمہ تھا۔ جو ۱۸۴۸ء میں دہلی سے سپرنگر نے طبع کرایا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں گستاؤلی بان کی کتاب ''تمدن عرب'' کو فرانسیسی سے خلیل نے اردو ترجمہ کر کے لاہور سے شائع کیا۔ ماریا کالیکٹ کی تاریخ اسپین ہے۔ جس کا اردو ترجمہ نواب سید محمد خاں بہادر نے ۱۸۹۸ء میں کیا تھا۔ حامد علی صدیقی نے لین پول کی تاریخ ''مورز ان اسپین'' کا ترجمہ کیا۔ اسی زمانے میں مولوی سید محمد احمد نے میری میڈ کی کتاب ''تاریخ اندلس'' کو اردو میں منتقل کیا۔ نواب ذوالفقار جنگ نے ''خلافت اندلس'' کے نام سے ۱۹۰۴ء میں ایک کتاب لکھی اس کے بعد مولوی احمد حسن نے ''تاریخ ابن خلدون'' کا ترجمہ کیا جس میں اندلس کی تاریخ بھی درج ہے۔ یہ وُہ کتب ہیں جو علامہ اقبال کے یورپ جانے سے قبل شائع ہو چکی تھیں۔ اصل انگریزی کتب یا اُن کے تراجم علامہ اقبال نے یورپ جانے سے پہلے ضرور دیکھے ہوں گے۔

علامہ اقبال ۱۹۰۵ء تک قرطبہ اور غرناطہ کا ذکر بغداد و دِلّی کے ساتھ کرتے ہیں لیکن قیام یورپ میں جب انہیں وہاں عربی کتب نیز مستشرقین کی تحقیقات کے مطالعے کا موقع ملا تو انہیں اسلامی دنیا میں اندلس کی اسلامی میراث سب سے زیادہ روشن اور عظیم الشان نظر آئی۔ اس تہذیبی و ثقافتی عظمت میں اندلسی شخصیات کے کارہائے نمایاں سامنے آنے پر انہیں اُن سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ان شخصیات کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے اسلامی میراث کو دنیا کے سامنے ایک سنہری کارنامہ کے طور پر چھوڑا ہے۔ ان ناموں میں کچھ یہ ہیں۔ ''ابن بشکوال، ابن البیطار، ابن جبیر، ابن حبیب، ابن حزم، ابن الخطیب، ابن خلدون، ابن رشد، ابن زہر، ابومروان بن عبدالملک، ابوالعلا، ابن الحفید، ابن زیدون، ابن سیدہ، ابن طفیل، ابن عمار، ابن العوام، ابن فرخ اشبیلی، ابن فرحون، ابن ہانی، ابواسحاق ابیری، ابوحامد الغرناطی، ابوجیان، ابو الصلت، امیہ، ابوعبید البکری، ابومدین، ابن ظفر، ابن عاصم، ابن عباد، ابن عبدربہ، ابن عربی، ابن فرخی، ابن قزمان، ابن حی، ابن اقوطیہ، ابن مرۃ، ابن میمون، الادریسی وغیرہ''

اقبال کو بھی ان میں سے بعض سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے بعض کی ذات سے متاثر ہو کر اشعار کہے۔ بعض کے فلسفہ افکار سے اخذ و استفادہ کیا اور بعض کے نظریات سے اختلاف بھی کیا۔ ان میں طارق بن زیاد، عبدالرحمٰن الداخل، ابن حزم، ابن عربی، معتمد بن عماد، ابن رشد، ابن خلدون، علامہ طرطوسی، علامہ شاطبی، قاضی عیاض، ابن تومرت، موسیٰ بن میمون شامل ہیں۔

ان شخصیات میں انہوں نے کسی کو شام کا ستارہ کہا اور کسی کو مسلم تہذیب و تمدن کا سب سے زیادہ روشن اور تابناک مظہر۔ انہی اندلسی شخصیات کی کاوشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں۔

''نفس انسانی، مابعد و طبعی مسئلے مثلاً حیات بعد الموت۔ زمان و مکاں کے بارے میں ہمارے علمائے اسلام بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ ان کی نظر ہر بات پر تھی وہ تہذیب و تمدن اور اجماع و عمران کے مسائل سے غافل تھے نہ علم و حکمت اور مابعد الطبعی افکار سے جس میں قرآن مجید نے ان کی رہنمائی کی۔ یہ انہی کا تو کہنا تھا کہ قرآن مجید خلاصہ کائنات ہے۔''(۱)

علم کے ذرائع اور اسلامی ممالک کے مسلم علماء میں اندلسی علماء اور مفکرین کے قابلِ فخر کارناموں اور ان کے کمالات و انکشافات کے بارے میں علامہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

''علم کے چار ذرائع ہیں اور قرآن مجید نے ان چاروں کی طرف واضح رہنمائی کی ہے۔ مسلمانوں نے ان کی تدوین کی اور دنیائے جدید اس باب میں ہمیشہ مسلمانوں کی منت کش رہے گی۔ پہلا ذریعہ ''وحی'' ہے۔ اور وُہ اب ختم ہو چکا۔ دوسرا ذریعہ آثار قدما و تاریخ ہے۔ جس پر آیات قرآن متوجہ کر رہی ہیں۔ ''سیرُ وفی الارض'' اس آیت نے علم آثار کی بنیاد رکھ دی جس پر مسلم مصنفین نے عالیشان قصر تعمیر کیے۔ ''ذکر باایام اللہ'' یہ آیت کریمہ تاریخ کا ابتدائی نقطہ ہے۔ جس نے ابن خلدون جیسے باکمال محقق پیدا کیے۔ علم کا تیسرا ذریعہ ''علم النفس'' ہے جس کا آغاز ''فی انفسکم افلا تبصرون'' سے ہوتا ہے۔ اس کو حضرت جنیدؒ اور ان کے رفقاء و اتباع نے کمال تک پہنچایا۔ آخری ذریعہ صحیفہ فطرت ہے۔ جس پر قرآن مجید کی بے شمار آیات دلالت کر رہی ہیں۔ مثلاً **"الی الارض کیف سطحت"** اس علم پر علمائے اندلس نے بہت توجہ مبذول کی۔(۲)

غرضیکہ علم اخلاق، فلسفہ، طب، شاعری، ہیئت، ریاضی، نجوم وغیرہ سب میں اندلسی مسلمانوں کے قابلِ قدر کارنامے ہیں اور جن کی شہادت خود یورپی علماء دے رہے ہیں۔

علامہ اقبال کو جن اندلسی شخصیات سے بطور خاص دلی اور ذہنی وابستگی ہے اور جن سے انہوں نے اپنے افکار و خیالات میں استفادہ کیا ہے۔ اِن شخصیات سے اقبال کے ذہنی اور فکری روابط کی وضاحت کے لیے اُن کا مفصل تعارف نہایت ضروری ہے۔

طارق بن زیاد

تاریخ اسلام کا نامور سپاہی ایک غلام کی حیثیت سے اسلامی معاشرے میں داخل ہوا اور سپہ سالاری کے مرتبہ کو پہنچا۔ وہ اعلائے کلمۃ اللہ قیامِ امن، دافع مفاسد، اور مظلوموں کی مدد کی غرض سے اندلس گیا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ

ان الله يحب الذين يقاتلون فى سبيله صفاً۔

''یقیناً اللہ ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھے ہوئے (جم کر) لڑتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''۱

المقری نے ابن بشکوال کی روایت کے مطابق طارق کے باپ کا نام عمر لکھا ہے۔ مگر مشہور طارق بن زیاد ہی ہے۔ بعض مورخوں نے اسے افریقی اور بعض نے اسے بربر کہا ہے۔۲

اقبال نے قرون اولیٰ کے جن مسلمان سپاہیوں کی جرأت، پامردی، استقلال اور شجاعت کے اوصاف بیان کئے ہیں ان میں طارق بن زیاد بھی ہے جس کے دِل میں حُب رسول ﷺ، عشق خداوندی، توحید کی عظمت، یقین محکم، اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل بھروسہ ہونے کے ساتھ ساتھ صدق و یقین، عزم و ثبات، صبر و شکر، نظم و ضبط اور ایثارِ نفس بھی تھا۔ یہ سب اوصاف اِس کے کردار و عمل میں ہمیں نظر آتے ہیں۔ اندلس کی فتح ہی پیش خیمہ ہے اس اساس کا جس کی بدولت اندلس ایک عظیم الشان تہذیب و تمدن اور اسلامی میراث کا مالک بنا۔

علامہ اقبال نے طارق کے اندلس کے ساحل پر اُترنے اور کشتیاں جلانے کے پورے واقعہ کو ایک ڈرامائی تصویر کشی کے ذریعے صرف تین اشعار کے قالب میں بڑی خوبصورتی اور انتہائی فنکارانہ مہارت کے ساتھ ڈھالا ہے۔ جو 'المملک للہ' کے عنوان سے پیام مشرق میں قطعے کی صورت میں ہے۔

طارق چوں بر کنارہ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تُو بہ نگاہِ خرد خطا اَست
دوریم از سوادِ وطن باز چُوں رسیم؟
ترک سبب زردیٔ شریعت کُجا رَوا اَست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملکِ ما است کہ ملکِ خدائے مَاست ۳

اس قطعے میں اقبال نے عقل و عشق، طاقت (شمشیر) اور ارض اللہ کو موضوع سخن بنایا ہے۔ طارق کے ورودِ اندلس کے تاریخی پس منظر کا ایک اجمالی جائزہ پیشِ خدمت ہے۔

اندلس پر اس وقت ایک غاصب بادشاہ راڈرک حکمران تھا۔ جو شاہ وٹیزا (Witiza) کو قتل کر کے بادشاہ بنا تھا۔ اسی کے دورِ حکومت میں سبطہ کا حکمران کاؤنٹ جولین تھا۔ جو اس کے سابق حکمران کا داماد بھی تھا۔ شاہ وٹیزا کے بیٹے اور جولین کے دِلوں میں راڈرک کے خلاف رنجش تھی۔ لیکن فوری واقعہ جو عداوت کا سبب بنا وہ کاؤنٹ جولین کی بیٹی فلورنڈرا کی عصمت دری کا تھا۔ فلورنڈرا دوسرے امراء کے بچوں کے ساتھ طلیطلہ کے شاہی محل میں بظاہر تعلیم و تربیت کے لیے رکھی گئی لیکن حقیقتاً بطور یرغمال تھی تاکہ کاؤنٹ جولین اور دوسرے امراء بغاوت نہ کر سکیں۔ فلورنڈرا نے خفیہ طور پر اس کی اطلاع اپنے باپ کو افریقہ میں کر دی، اس وقت شمالی افریقہ کو موسیٰ بن نصیر، ولید بن عبدالمالک کے عہد خلافت میں فتح کر چکا تھا۔ لیکن کاؤنٹ جولین کا علاقہ ابھی آزاد تھا۔ کاؤنٹ جولین موسیٰ بن نصیر سے مِلا اور اسے اندلس پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ موسیٰ بن نصیر نے دربار خلافت سے اجازت لیکر طارق کو سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ سمندر پار بھیجا۔

طارق بن زیاد نے اقبال کے مردِ مجاہد کے صحیح روپ کے طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل بھروسہ کرتے ہوئے اپنی کشتیاں جلا دیں کہ اب ان کو دشمن سے مرعوب ہونے کے بجائے فتح کے تصور کو ہی سامنے رکھنا ہے۔ طارق ساحل اندلس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا تو وہاں کے حاکم تدمیر نے مسلمان سپاہیوں کی وضع قطع دیکھتے ہوئے راڈرک کو یہ پیغام بھیجا۔

''ہماری زمین پر ایک قوم اتر پڑی ہے ہم نہیں جانتے یہ آسمان سے نازل ہوئی ہے یا زمین سے نکل پڑی ہے۔''۵

راڈرک ایک لاکھ سپاہ کے ساتھ مقابلے میں آیا۔ ۱۹ جولائی ۷۱۱ء کو طارق بن زیاد اور راڈرک کی فوجوں کا وادی لیت کے کنارے آمنا سامنا ہوا۔ اسی اثناء میں طارق کی امداد کیلئے مزید پانچ ہزار سپاہی افریقہ سے آ پہنچے تھے۔ طارق بارہ ہزار کا لشکر لے کر آگے بڑھا۔ ابھی لڑائی شروع نہیں ہوئی کہ شام کا اندھیرا چھا گیا۔

طارق تمام رات بارگاہِ ایزدی میں سربسجود رہا اور اللہ تعالیٰ سے فتح و نصرت کی دُعا کرتا رہا۔ مورخین کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے طارق کو خواب میں فتح کی بشارت دی۔۶

علامہ اقبال نے اِس واقعہ کو ''طارق کی دعا میدان جنگ میں'' کے عنوان سے شعروں کا

روپ دیا ہے۔

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم اُن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم کو کرتی ہے بیگانہ دِل سے — عجب چیز ہے لذّت آشنائی !
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن — نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی !

خیابان میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے !

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا — خبر میں ، نظر میں ، اذانِ سحر میں !
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو — وہ سوز اُس نے پایا انہی کے جگر میں !
کشادہ درِ دِل سمجھتے ہیں اُس کو — ہلاکت نہیں موت اُن کی نظر میں !
دِل مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے — وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں !

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلمان کو تلوار کر دے

ان اشعار کے بارے میں علامہ اقبال شیخ محمد اکرام کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''طارق کے متعلق اشعار بالخصوص دِل گداز ہیں''[8] اقبال کے یہ اشعار طارق کی اس تقریر سے مطابقت رکھتے ہیں جو اس نے جنگ شروع ہونے سے پہلے میدانِ جنگ میں اپنی فوج کے سامنے کی تھی طارق نے اپنے سپاہیوں کو اس طرح خطاب کیا۔

''(حمد وثنا کے بعد) ساتھیو!

یہ خوب سمجھ لو اب تمہارے ٹھہرنے کی جگہ کہاں ہے؟ سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن تمہارے آگے۔ خدا کی قسم اب سوائے پامردی اور استقلال کے تمہارے لیے کوئی چارہ نہیں رہا۔ یہی دونوں طاقتیں مغلوب نہیں ہو سکتیں۔ یہی دونوں فتح مند فوجیں ہیں جنہیں فوج کی قلت تعداد نقصان نہیں پہنچا سکتیں اور نہ کسی فوج کی کثرت، بزدلی، سستی، نامردی اختلافات اور غرور کے ساتھ کسی کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ سمجھ لو تم اس جزیرے میں ایسے ہی ہو جیسے لیفائی بخیلوں کے دسترخوان پر ہوتے ہیں۔ تمہارے دشمن اپنی فوج اور سامانِ جنگ کے ساتھ تمہارے سامنے آ چکے ہیں۔ ان کے پاس رسد کے ذخائر بھی وافر ہیں۔ بجز تمہاری تلواروں کے، تمہارے لیے کوئی رسد

نہیں سوائے اس کے کہ تم اپنے دشمنوں کے ہاتھوں سے چھین کر حاصل کر لو۔ اگر تم نے کوتاہی کی اور کچھ حاصل نہ کیا تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور تمہارے دشمنوں کے دل میں تمہارا رعب پیدا ہونے کی بجائے تم سے مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے تم اپنے آپ کو کسی رسوائی میں ڈالنے سے پہلے اِس سرکش (رزریق) کو زیر کر لو جو اس قلعہ بند شہر سے تمہارے مقابلے میں نکلا ہے اگر تم اپنی جانوں پر کھیل جاؤ تو کامیابی تمہارے قدم چومنے کے لیے فرشِ راہ ہے۔ میں تمہیں کوئی ایسی دعوت نہیں دیتا جس کو خود قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ میں تمہیں ایسے مقام پر لایا ہوں جہاں سب سے سستی چیز انسانوں کی جانیں ہیں۔ اور سب سے پہلے میں اپنے آپ سے شروع کرتا ہوں۔ یہ خوب یقین رکھو کہ اگر تھوڑی دیر کی تکلیف اُٹھا لو گے تو اس کے بدلے میں ایک زمانہ دراز تک عیش وراحت اٹھاؤ گے۔ تم اپنی جانوں کو میری جان سے زیادہ قیمتی نہ بناؤ۔ تمہارا اور میرا حصہ برابر ہے۔ اس وقت جو کچھ جزیرے میں ہے وہ سب کچھ تمہارا ہے۔ یہیں وہ حوروش یونانی لڑکیاں ہیں جو موتی اور مرجان سے مزین سنہرے لباس میں ملبوس اور امراء و تاجدار سلاطین کے محلوں کی زینت ہیں۔ امیر المومنین ولید بن عبدالملک نے تم جیسے بہادروں کو اس لیے منتخب کیا ہے کہ تم اس جزیرے کے تاجداروں اور رئیسوں کے داماد بن جاؤ۔ یہاں کے بہادروں اور شہسواروں سے دو دو ہاتھ کر لو۔ تم اِس جزیرے میں اللہ کے بول اور اُس کے دین کو سر بلند کرنے کے لئے آئے ہو۔ اور اس کا اجر پاؤ گے۔ یہاں کا مالِ غنیمت صرف تمہارے واسطے ہے تم جس عزم پر استوار ہو گے اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور دونوں جہاں میں تمہارا نام باقی رہ جائے گا۔

یہ خوب سمجھ لو! میں تمہیں جو دعوت دے رہا ہوں اس کو قبول کرنے والا سب سے پہلا شخص میں ہی ہوں۔ مجھے تم جو کچھ کرتے دیکھو اس کی پیروی کرو اگر میں حملہ کروں تو تم بھی ٹوٹ پڑو۔ اگر میں رک جاؤں۔ تم بھی ٹھٹھک کر رہ جاؤ۔ لڑائی کے میدان میں سب مل کر ایک شخص واحد کی ہیت اختیار کر لو۔ جس وقت دونوں فوجیں ٹکرائیں گی اس وقت میں خاص طور پر اُس سرکش (رزریق) کی طرف رُخ کروں گا۔ اگر میں سرکش کا کام تمام کرنے کے بعد مارا جاؤں تو تمہارے کام کو پورا کر جاؤں گا۔ تم بہادر اور عقلمند ہو اس کے بعد تم اپنے کاموں کو خود سنبھال سکتے ہو۔ اور اگر میں اس تک پہنچنے سے پہلے ہی مارا جاؤں تو تم میرے اس عزم کو پورا کر لینا اور اس پر حملہ آور ہو کر اس کا کام تمام کرنا اور اس جزیرے کی فتح کو مکمل کر لینا۔ کیونکہ اس کے قتل ہونے کے بعد ان کی ہمتیں چھوٹ جائیں گی۔ اگر میں مارا جاؤں تو غمگین نہ ہونا، رنج و ملال نہ کرنا اور نہ آپس میں

جھگڑنا ورنہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور دشمنوں کے لیے تم پیٹھ پھیر دو گے اور قتل و گرفتار ہو کر برباد ہو جاؤ گے۔ خبردار! خبردار! پستی کو قبول نہ کر لینا اور اپنے آپ کو دشمنوں کے حوالے نہ کر دینا۔ تمہارے لیے محنت اور جفاکشی کے ذریعے شرف و عزت، راحت و آرام اور حصولِ شہادت کے لیے ثوابِ آخرت مقدر کیا گیا ہے۔ ان سعادتوں کو حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھو۔ اگر یہ سب کچھ تم نے کر لیا تو اللہ کا فضل و احسان تمہارے ساتھ ہے۔ وہ تمہیں آئندہ ہونے والے بڑے گھاٹے سے اور کل اپنے جاننے والے مسلمانوں کے درمیان بُرے لفظوں سے یاد کیے جانے سے بچائے گا۔ پس اب میں حملہ آور ہوں گا اور اس پر چھا جاؤں گا۔ میرے حملہ آور ہوتے ہی بہادرو تم بھی جھپٹ پڑنا"۔ ۹

مسلمانوں کی عسکری تاریخ میں یہ ایک یادگار تقریر ہے۔ جس کے ذریعے سے مسلمانوں میں ایک مجاہدانہ روح پیدا کی گئی ہے۔ اقبال کے ہاں بھی طارق بن زیاد کا ذکر جوشِ جہاد، اسلام کی عالمگیریت اور شوق شہادت کے سلسلے میں ملتا ہے۔ اقبال کو سراپا عمل انسانوں سے محبت ہے۔ طارق بن زیاد بھی انہی میں سے ایک ہے۔ جس کے نزدیک قوتِ ایمان ہی اصل قوت اور جنگ میں مادی وسائل سے زیادہ اس کی اہمیت ہے۔

☆☆☆☆

عبدالرحمٰن الداخل

عبدالرحمٰن اندلس کا پہلا اموی حکمران تھا۔ شام میں جب بنو عباس نے بنی امیہ سے عنانِ اقتدار چھین لیا تو انہوں نے اموی خاندان کے افراد کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ لہذا بہت سے اموی بھاگ کر اِدھر اُدھر چھپ گئے۔ اس کے بعد بادشاہ کی طرف سے اشتہار جاری ہوا کہ سب کو امان دی جاتی ہے۔ ستر کے قریب اموی واپس آ گئے لیکن ان کو ایک دعوت میں قتل کر دیا گیا۔ اور ان کی لاشوں پر دسترخوان سجایا گیا۔ عبدالرحمٰن نے ایک آدمی کو اس دعوت کا حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا وہ یہ حال دیکھ کر واپس آ رہا تھا کہ عباسی سپاہیوں کو پتا چل گیا اور انہوں نے اسے بھی پکڑ کر قتل کر دیا۔ عبدالرحمٰن اور اس کا بھائی یحییٰ دونوں وہاں سے بھاگے یحییٰ پکڑا گیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ عبدالرحمٰن اپنے ایک اور بھائی کے ساتھ دریائے فرات کے کنارے ایک باغ میں چھپا ہوا تھا کہ عباسی سپاہی آ گئے اور انہوں نے باغ کو گھیرے میں لے لیا۔ دونوں بھائیوں نے دریا میں چھلانگیں لگا دیں۔ کنارے پر کھڑے سپاہیوں نے ان کو آوازیں دیں کہ واپس آ جاؤ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ چھوٹا بھائی ان کی باتوں پر یقین کر کے کنارے پر آ گیا۔ عبدالرحمٰن جب دوسرے کنارے پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کے بھائی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ یہاں سے وُہ افریقہ بھاگ گیا اور نفزہ نامی بربری قبیلے میں، جہاں اس کی ننھیال تھی۔ پناہ گزین ہوا ۱۰۔ عبدالرحمٰن اگر آرام طلب ہوتا تو ایک معمولی آدمی کی طرح گمنامی کی زندگی بسر کرتا۔ لیکن بیس برس کے بعد اس نوجوان کے دل و دماغ میں بڑے بڑے عزم اور حوصلے بھرے ہوئے تھے۔

آخر افریقہ کا والی بھی امویوں کے خلاف ہو گیا اور عبدالرحمٰن کو ناچار پھر بھاگنا پڑا۔ مسلسل پانچ برس وُہ چھپتا پھرا لیکن ہمت نہ ہاری۔ ایک دفعہ تو ایک عورت کے لہنگے کے نیچے چھپ کر جان بچائی اور غالباً تاریخ میں یہ پہلا اس قسم کا واقعہ ہے۔ بعد میں اندلس کا بادشاہ بننے کے بعد اس عورت کو ایک بڑی جاگیر عطا کی۔ آخر کار ۱۳۸ھ میں عبدالرحمٰن نے اندلس کے اموی امراء سے ساز باز کی اور اس طرح اندلس میں جا اترا۔ قسمت نے یاوری کی اور بالآخر اس نے اندلس کی بادشاہت حاصل کر لی۔ ۱۱

عبدالرحمٰن بڑا زیرک، اولوالعزم اور بہادر تھا۔ کڑی سے کڑی آزمائش سے کبھی نہ گھبراتا تھا۔ اس کے دشمن بھی اس کی تعریف کرتے تھے۔ اور اُسے "صقرِ قریش" (قریش کا شاہین) کہتے

تھے۔ ڈاکٹر سید محمد یوسف، صدر شعبہ عربی، کراچی یونیورسٹی، کا خیال ہے کہ عبدالرحمٰن الداخل کا لقب (صقرِ قریش) اور اس کی شانِ جلالی اقبال کے تصورِ شاہین کا ماخذ معلوم ہوتی ہے۔ عبدالرحمٰن شاعر بھی تھا۔ اس نے عربی شاعری کی روایت کے مطابق فخریہ اشعار کہے ہیں۔ جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

میں وُہ ہوں
جو عزم کی تلوار سونت کر چلا اور دشمنوں کی مقابلے میں شمشیر برہنہ
ہو گیا۔ بیابانوں سے گزرتا اور سمندروں کو چیرتا چلا گیا۔ فوجوں
سے بے سروسامانی سے نبرد آزما ہوا۔
تا آنکہ بلند کارنامہ انجام دیا اور بہ زور ایک ملک اور ایک منبر قول
فیصل کا چھین لیا۔

لشکر جو نابود تھا اسے از سرِ نو منظم کیا
اور شہر جو خالی ہو چکے تھے انہیں آباد کیا۔ [12]

عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور، عبدالرحمٰن الداخل کا سب سے بڑا حریف اور سب سے بڑا مداح تھا۔ ان ابیات میں عبدالرحمٰن نے جو کچھ اپنی بابت کہا اور اس کی تصدیق تقریباً انہیں الفاظ میں اس کے انصاف پسند حریف ابو جعفر منصور سے منقول ہے۔

"ایک دفعہ منصور نے اپنے ندیموں سے پوچھا بتاؤ، "صقر (شاہین) قریش" کون ہے؟ انہوں نے کہا، امیر المومنین ہی ہیں جنہوں نے بادشاہوں کو زیر کیا۔ خلفشار کو دور کیا، دشمنوں کا خاتمہ کیا اور مفاسد کا قلع قمع کیا۔ منصور نے کہا یہ تو کوئی بات نہ ہوئی انہوں نے کہا، پھر معاویہ۔ وہ بھی نہیں۔ انہوں نے کہا عبدالمالک بن مروان؟ اس نے کہا، یہ بھی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے کہا امیر المومنین پھر اور کون ہو سکتا ہے؟ اس نے کہا "صقر قریش" تو عبدالرحمٰن بن معاویہ ہے جس نے سمندر پار کیا۔ بیاباں طے کیئے اور یک و تنہا ایک عجمی ملک میں داخل ہو کر شہر آباد کیے، لشکر منظم کیئے، دفاتر ترتیب دیے اور سب کچھ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد حسن تدبیر اور زورِ بازو سے ایک بڑی سلطنت قائم کی۔ معاویہ نے تو ایک ایسی سواری کو قابو کیا جس پر انہیں عمرؓ اور عثمانؓ نے بٹھایا تھا اور خوب سدھایا تھا۔ عبدالمالک کے پاس بیعت تھی جس کی گرہ خوب مضبوط تھی۔ امیر المومنین کے حق میں خاندان والوں کا اصرار اور طرف داروں کا اجتماع تھا۔ اور عبدالرحمٰن تو یک و تنہا تھا۔ اس کی

تائید میں صرف اس کی رائے تھی اور اس کا ساتھ دینے والا صرف اس کا عزم تھا۔ اس نے مضبوط بنیادوں پر اندلس میں خلافت قائم کی۔ سرحدیں فتح کیں۔ بے دینوں کو قتل کیا اور بڑے بڑے باغیوں کو زیر کیا۔ اس پر حاضرین بولے، بخدا، امیر المومنین، آپ نے بالکل سچ کہا۔" [13]

"صقر" (شاہین) ان تمام صفات کی علامت ہے جو عبدالرحمٰن کی سیرت اور اس کے کارناموں میں جلوہ گر ہیں۔ ان کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ اقبال کے شاہین کا اس صقرِ قریش سے کتنا قریبی تعلق ہے۔ عبدالرحمٰن کی شخصیت کے جمالی پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد یوسف لکھتے ہیں۔

"عبدالرحمٰن اعلیٰ ادبی ذوق رکھتا تھا۔ اور خود بلند پایہ شاعر تھا۔ غم نے اس کی جوانی کو لطف خواب سے بیدار کیا تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے اس کے احساس میں اتنی ہی تیزی، گہرائی، لطافت اور نزاکت آ گئی تھی جتنی کہ عقل میں پختگی اور طبیعت میں اولوالعزمی اور خود اعتمادی ماضی کی کسک ہو یا حال کی ترنگ یا مستقبل کی امنگ وہ اپنے احساسات میں ڈوب کر شعر کہتا ہے۔ اس کے رومان میں ایک حیویت ہے جو صرف مردان عمل کا خاصہ ہے۔" [14]

عربی شاعری میں کھجور کے درخت کی جو اہمیت ہے وُہ محتاج بیان نہیں۔

وما العيش الا نومة تبطح
وتمر رأس النخيل ومَلہ

عربی شاعری کا اثر فارسی شاعری پر پڑا اور پھر فارسی شعرا کا اثر اُردو شاعری پر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی اور اردو شاعری میں بھی کھجور کا ذکر اکثر آتا ہے۔ اقبال نے تو براہِ راست عربی ادب سے استفادہ کیا تھا۔ اس لئے ان کے کلام میں عربی شاعری کے بہت سے عناصر موجود ہیں۔ چنانچہ کھجور کا درخت بھی ان کے یہاں کئی جگہ تشبیہ و استعارہ کے پیرائے میں آیا ہے۔

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیری کشت و نخیل (بانگ درا) [16]

مجھ کو خبر نہ تھی کہ علم نخیل بے رطب (بال جبریل) [17]

مسجد قرطبہ میں تو کھجوروں کے جھنڈ کا تصور ایک حسین تشبیہ کی صورت میں رونما ہوا ہے۔

تیری بنا پائیدار تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل (بال جبریل) [18]

یہ تو اقبال کا ذکر تھا جس کے وطن میں کھجور کا درخت نہ ہونے کے برابر ہے۔ عبدالرحمٰن پر کیا گزری ہوگی جو کھجوروں کے جھنڈ چھوڑ کر پردیس میں آبسا تھا۔ اندلس اگرچہ باغوں اور سبزہ زاروں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن ایک کھجور کا درخت نہ ہونے سے عبدالرحمٰن کو یہ ملک اجنبی لگتا تھا۔ عبدالرحمٰن نے قرطبہ کے شمال میں ایک باغ لگوایا اور اس کا نام بھی وہی رکھا جو شام میں اِس کے دادا ہشام نے اپنے باغ کا رکھا تھا۔ یعنی "رصافہ"۔ رصافہ میں عبدالرحمٰن نے کئی ملکوں سے قسم قسم کے پودے منگوا کر لگائے شام سے اپنی بہن کے ذریعے جو وہیں رہ گئی تھی، کھجور کا پودا بھی منگوایا اور اسے باغ میں لگوایا تا کہ پردیس میں کچھ تو وطن کی جھلک نظر آئے۔ ڈاکٹر محمد یوسف نے عبدالرحمٰن کے اس فعل کی رومانی توجیہہ کی ہے وُہ لکھتے ہیں۔

"اس رومان میں کیسی طہارت اور پاکیزگی ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فرصت کے اوقات میں وُہ ٹکٹکی باندھے اس کھجور کے درخت کو دیکھا کرتا تھا لیکن وہ بُت کی طرح اس کی پرستش نہیں کرتا۔ بلکہ اِس کے وجود سے اپنے احساس میں گرمی اور تیزی پیدا کرتا ہے۔ پھر بھی منظر فطرت کو اپنی زندگی اور احساس بخشتا ہے۔ یہی رومان کی حقیقت ہے۔ ۱۹

عبدالرحمٰن جب اکیلا ہوتا تھا تو اکثر باغِ رصافہ میں ٹہلتا اور جب بھی اس کی نظر کھجور کے درخت پر پڑتی وہ فوراً اس کے قریب آجاتا اور اس کے جذبات بے اختیار شعروں کی صورت میں نمودار ہوتے جو اپنی سادگی اور تاثیر میں بے مثال ہیں۔ اِس کی بہت سی نظمیں کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ہر زبان کے اہلِ علم نے ان کی تعریف کی ہے۔ عبدالرحمٰن کھجور کے درخت کو دیکھ کر اپنے جذبات و احساسات کو الفاظ میں یُوں بیان کرتا ہے۔

تبدت لنا وسط الرصافت نخلة
تنات بارض الغرب عن بلد النخل
فقلت شبهي بالتغرب والنوىٰ
وطول التنائي عن نبي و عن اهلي
نشاط بارض انت فيه غريبة
فهاأنت في الاقصاء مسلك ۲۰

ترجمہ:

(۱) رصافہ کے وسط میں ہمیں کھجور کا تنہا درخت نظر آیا جو اپنی دنیا سے علیحدہ ہو کر مغرب کی

سرزمین میں اُگ آیا ہے۔

(۲) میں نے درخت سے مخاطب ہو کر کہا کیا جدائی اور اہل و عیال سے طول فرقت میں میرے جیسا ہے۔؟

(۳) تو ایسی سرزمین میں پل رہا ہے جہاں تو اجنبی ہے اپنے جنم بھومی سے دُور تو میری مانند ہے۔

ایک اور نظم میں اپنے کھجور کے درخت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

يانخلة انت غريبده مثلي — في الارض ناتية الاهل
ولوا انها غفلت اذا بكت — هاء الفرات و مثبت انخل
نيكي و هل تبكي مسكمة — عجماء له تجبل على جبل
لكما حرمت و اخرجي — للغضتي بني العباس عن اهلي ۲۱

ترجمہ:

(۱) اے نخل تو مغرب میں میری طرح غریب الوطن اور اصل سے دور ہے۔

(۲) اسے رونا آتا ہوتا تو وُہ بھی ضرور روتی، فرات کے پانی اور کھجور کی سرزمین کے لیے۔

(۳) اور تو بھی رو مگر جو گونگی ہو منہ ڈھانکے ہوئے اور جس کی جبلت میں آہ و زاری نہ ہو وہ بھی کبھی روئی ہے۔؟

(۴) لیکن وُہ بے حس ہے اور اپنے اہل خاندان کی بابت میں بھی بے حس ہو گیا ہوں۔ یہ سبب اِس بغض کے جو مجھے بنو عباس سے ہے۔ ۲۲

اقبال بھی عبدالرحمٰن کے ان اشعار سے متاثر ہوئے اور اُن میں سے کچھ کا آزاد ترجمہ انہوں نے اردو میں یوں کیا ہے۔

میری آنکھوں کا نور ہے تو — میرے دِل کا سرور ہے تُو
اپنی وادی سے ہوں میں — میرے لیئے نخل طُور ہے تُو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا — صحرائے عرب کی حُور ہے تو
پردیس میں ناصبور ہوں میں — پردیس میں نا صبور ہے تُو
غربت کی ہوا میں بار در ہو — ساقی تیرا نم سحر ہو! ۲۳

نظم کا یہ پہلا بند تو عبدالرحمٰن کے اشعار کا ترجمہ ہے۔ لیکن دوسرا بند اقبال کا اپنا ہے۔

عالم کا عجیب ہے نظارہ — دامانِ نگہ ہے پارہ پارہ

ہمت کو شناوری مبارک　　پیدا نہیں بحر کا کنارہ!
ہے سوزِ دروں سے زندگانی　　اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
صبح غربت میں اور چمکا　　ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے　　مومن کا مقام ہر کہیں ہے ۲۴

اقبال کی نظم کا یہ دوسرا بند عبدالرحمٰن الداخل کے کردار، اس کی زندگی، اندلس کی تاریخ وجہ غربت اور شام کا ستارہ، فنکارانہ مہارت اور معانی کا حسین امتزاج ہے۔

☆☆☆

علامہ ابن حزم

ابو محمد علی بن احمد بن سعید ابن حزم ۳۸۴ھ (۹۹۴ء) میں قرطبہ کے نواح میں پیدا ہوئے۔ ۴۵۶ھ (۱۰۶۴ء) میں وفات پائی دینی علوم اور فلسفہ و منطق میں اپنے زمانے کا ماہر کامل تھے۔ بہت بڑے شاعر بھی تھے پہلے شافعی تھے۔ پھر ظاہری ہو گئے علامہ شبلی کہتے ہیں کہ تاریخ اسلام میں دو شخص ایسے تھے جو علوم حدیث اور فلسفہ میں کمال رکھتے تھے۔ امام ابن تیمیہ اور دوسرے ابن حزم، امام غزالی نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔ ابن حزم علمائے کبار میں سے ہیں اور اجتہاد کی تمام شرائط اُن میں پائی جاتی ہیں۔ ۲۵" اِروِنگ IRVING کے الفاظ میں ابن حزم پہلا یورپی تقابل ادیان کا بانی ہے۔"۲۶

ابن صاعد اندلسی لکھتے ہیں۔

"ابن حزم نے علوم شرعیہ کی بکثرت تحصیل کی اور وہ وہ باتیں حاصل کیں جو ان سے پہلے اندلس میں کسی شخصیت کو حاصل نہیں ہوئیں انہوں نے ان علوم پر بکثرت کتابیں لکھیں جو عمدہ موضوع پر مشتمل ہیں۔ مجھے ان کے بیٹے الفضل ابو رافع نے اطلاع دی ہے کہ حدیث و اصول حدیث، فقہ، ملل و نحل وغیرہ میں اُن کی تصانیف کی تعداد مع تاریخ انساب، ادب، ردّ و مناظرہ کے کوئی چار سو کے قریب ہیں جو تقریباً آٹھ ہزار اوراق پر مشتمل ہیں۔ ان سے پہلے عہد اسلام میں یہ بات صرف ابو جعفر بن جریر طبری کو نصیب ہوئی ہے۔ کہ ایک وہی اس قدر کثیر التصانیف تھے۔ علاوہ بریں ابن حزم کو نحو، لغت، شاعری اور خطابت میں بھی بہرہ دافی حاصل تھی۔ انہوں نے اپنی ایک تحریر میں مجھے لکھا ہے کہ وہ ماہِ رمضان کی آخری تاریخ کو ۳۸۴ھ میں نماز سحر کے بعد طلوع آفتاب سے قبل پیدا ہوئے تھے۔"۲۷

انہوں نے اپنے عشق کی داستان کو طوق الحمامہ کے نام سے بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ ان کے علم و فضل کی بناء پر انہیں خلیفہ عبدالرحمٰن خامس کے عہد میں وزارت کا منصب حاصل ہوا بنو امیہ کا اقتدار روبہ زوال تھا۔ لیکن ابن حزم آخری دم تک خلیفہ کے وفادار رہے اور اس کے اقتدار کو بحال کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے بنو امیہ کے مخالفین کے ہاتھوں کئی بار گرفتار بھی ہوئے۔

ابن حزم نے عقلی انداز میں تاریخ بھی لکھی اس وجہ سے اندلس میں فلسفہ تاریخ کا بانی

ابن حزم ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ ابن عذاری مراکشی نے اپنی تاریخ البیان المغرب کی جلد اول میں ابن حزم کی تاریخ کی ایک تحریر نقل کی ہے جو انکی عقل و دانش اور تاریخی سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کا یہ اقتباس دیکھئے۔

اب بنوامیہ کی حکومت ختم ہوگئی باوجود اپنی خرابیوں کے وہ ایک عربی دولت تھی۔ بنوامیہ نے کوئی دارالحکومت یا محل سرائے نہیں بنائی۔ ان میں ہر امیر کی سکونت اسی مکان اور اسی احاطے میں ہوتی تھی جو قبل خلافت اس کا ہوا کرتا تھا۔ نہ انہوں نے مسلمانوں کو اس امر پر مجبور کیا کہ ان سے عبودیت اور شاہانہ طریقہ کے ساتھ خطاب کریں یا زمین یا پاؤں کو بوسہ دیں۔ ان کا اصول نیابت دور دراز علاقوں میں اپنا حکم چلانا تھا۔ جیسے اندلس، چین، سندھ، خراسان، آرمینیا، یمن، شام، عراق، مصر، مغرب وغیرہ واسلامی دنیا۔'' ۲۸

ایک اور جگہ بنوعباس کے متعلق یہ تحریر ہے۔

''بنی عباس کی سلطنت گویا ایک عجمی سلطنت تھی۔ جس میں عربی حکمرانی معدوم ہوگئی اور خراسان کے عجمی برسر پیکار ہوگئے۔ سلطنت ایک کردی انداز میں آگئی۔ ہاں مگر یہ بات ضرور تھی کہ کسی صحابیؓ کو بُرا بھلا نہیں کہا جاسکتا تھا۔ بنی عباس کے زمانہ میں مسلمانوں کا اتحاد جاتا رہا اور اسلامی جماعت پر مختلف پارٹیوں کا غلبہ ہوگیا۔ اُن خانہ جنگیوں میں کافروں نے اندلس اور سندھ کے اکثر شہروں پر قبضہ کرلیا۔'' ۲۹

ابن حزم کی سب سے مشہور کتاب الملل والنحل ہے اس میں مختلف مذاہب فلاسفہ کے مسالک اور اقوام کے عقائد بیان کرکے اُن پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ زمین کا کروی ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ ابن حزم زمین کو عمامے کے پیچ سے تشبیہ دیتا ہے۔ اور چپٹی ہونے کو مختلف مثالوں سے رد کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآنی آیات بھی پیش کرتا ہے۔ ابن حزم کے زمانہ میں بعض لوگ اور بھی دنیاؤں میں آبادی کے قائل تھے لیکن ابن حزم دوسری دنیاؤں کا قائل تو تھا مگر اُن میں انسانی آبادی کا قائل نہ تھا۔ اس کتاب میں مختلف علوم وفنون کی جزئیات کی تفصیلات پڑھ کر انسان حیران اور مسحور ہوجاتا ہے۔ اور ایسے لگتا ہے کہ اس وقت علوم وفنون میں سندھ، ایران، ترکستان اور مصر وشام کا رابطہ اندلس سے اتنا زیادہ تھا۔ جتنا آج کے ترقی یافتہ دور میں اسلامی ممالک کا آپس میں نہیں ہے۔ الملل ونحل کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

''اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ایک سے زائد مقامات پر اصول براہین کی تصریح

فرمائی ہے اپنی اس کتاب کے ایک سے زائد مقامات پر ہمیں اس سے آگاہ کیا ہے اور ہمیں آسمان وزمین کی پیدائش پر غور کرنے کی ترغیب دی ہے۔ ان دونوں کی پیدائش کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ بغیر اس کے کہ ان کی ہیت اپنے افلاک میں کواکب کا منتقل ہونا مغرب ومشرق میں ہوتے ہوئے ان کی حرکات کا اختلاف انکی گردش کے افلاک، اُن گردشوں اور دوروں کا جبکہ یہ ایک ہی مرتبے پر ہوں باہمی تعارض کی معرفت حاصل ہو۔'' ۳۰

انہوں نے سحر اور جادو کی حقیقت پر بھی بڑی مدلل بحث کی ہے۔ کیونکہ سحر کا لفظ مذہبی کتابوں میں آگیا ہے۔ اس لیے یہ ایک مذہبی مسئلہ بن گیا ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ سحر اور جادو کوئی چیز ہے۔ لیکن بحث یہ ہے کہ سحر درحقیقت انقلاب ماہیت ہوتا ہے یا صرف شعبدہ بازی یا نیرنگ سازی کو سحر کہتے ہیں۔ اکثر اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ سحر کے ذریعے تمام خرقِ عادات وجود میں آسکتے ہیں۔ اور افسوس ہے کہ عام طور پر یہی عقیدہ تمام مسلمانوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ابن حزم نے بڑے زور وشور سے سحر کا انکار کیا ہے۔ اور حسب ذیل دلیلیں پیش کی ہیں۔

''خدا تعالیٰ نے کائنات کی جو ترتیب قرار دی ہے وہ بدل نہیں سکتی، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ **لا مبدل لکلماته** ابن حزم نے قرآن کریم کی کئی آیات دے کر لکھا ہے کہ خدا نے اس دنیا میں جو ترتیب دی ہے وہ بدل نہیں سکتی اس کے بعد ابن حزم نے سحر ومعجزہ کے بارے میں کہا ہے کہ دونوں میں فرق کیا ہوگا۔ اگر جادو قلب ماہیت کا نام ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو اس صورت میں پیغمبر اور جادوگر میں کیسا فرق رہے گا۔ ابن حزم کہتا ہے کہ جادو کے ثبوت میں اکثر لوگ فرعون کے جادوگروں کا واقعہ پیش کرتے ہیں۔ جو قرآن مجید میں ہے۔ ابن حزم نے قرآن مجید کی آیات سے ثابت کیا ہے کہ وہ صرف شعبدہ بازی تھی۔ ایک آیت مبارکہ میں درج ذیل ہے۔

تخیل الیه من سحرهم انها تسعی حضرت موسیٰ کو جادو کی وجہ سے خیال ہوتا تھا کہ انکی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہے

انما صنعوا کید ساحر ان لوگوں نے جادو کا کرتب کیا۔

واقعہ ہاروت وماروت میں ہے کہ لوگ ان دونوں سے جادو سیکھتے تھے۔ جس کے ذریعہ میاں بیوی میں جدائی کرادیتے ہیں۔ ابن حزم کہتا ہے کہ یہ بات تو کوئی بھی چغل خور کرسکتا ہے۔

بعض مسائل میں علامہ ابن حزم کا نقطہ نظر جدید طرزِ فکر کے عین مطابق ہے۔ مثلاً اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہ کیا عورت خلیفہ ہوسکتی ہے یا نہیں یا عورتوں کا درجہ مردوں سے کم ہے۔ انہوں نے

عورت کو مشروط طور پر خلافت کا اہل قرار دیا ہے اور قرآن مجید کی وہ آیات جن سے مردوں کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، ان کا جواب دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ عورتوں کا درجہ مردوں کے برابر ہے۔ بلکہ انہوں نے قرآنی آیات سے عورتوں کی نبوت کے دلائل بھی دیئے ہیں

مسلمانوں میں بہت سے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ زمین پر ہونے والے واقعات انسان کے مستقبل اور قسمت پر اجرام فلکی کا اثر پڑتا ہے۔ ایک حدیث مبارکہ ہے، "کہ جس نے ستاروں پر یقین کیا اس نے کفر کیا"۔

ابن حزم کا کہنا ہے کہ اجرام فلکی جن کے اختیارات اتنے محدود ہیں کہ وہ ایک خاص قسم کی حرکت یعنی دوری حرکت ہی کر سکتے ہیں اور اپنی مرضی سے اس کے علاوہ کسی اور طرح کی حرکت پر بھی قادر نہیں وہ بھلا کسی دوسرے کی قسمت پر کیسے اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ابن حزم کی رائے میں ستاروں کا اثر زیادہ سے زیادہ اس نوعیت کا ہو سکتا ہے جیسے آگ اکثر اشیاء کے جلانے پر اور سورج کا اثر ان کو گرمی پہنچانے پر مطلب یہ ہے کہ صرف طبعی اثرات ممکن ہیں اس کے علاوہ وہ کہتے ہیں کہ تجربات سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ نجوم کی بہت سی پیش گوئیاں غلط ثابت ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ علم نجوم کے نظریات کی تصدیق نہ تو شریعت سے ہوتی ہے اور نہ ہی عقل و تجربہ اس پر شاہد کامل ہے۔ ۳۱

اقبال نے بہت سے فلسفیانہ اور مذہبی مسائل مثلاً زمان و مکان، بقا و فنا، خالق و مخلوق، توحید باری تعالیٰ، نفس، ذات، اجر، دعا، دعا کا عمل، ماہیت کی تحقیق، (ذات الٰہ کا تصور) حیاتِ ثانیہ (حیات بعد الموت) حرکت و سکون جبر و قدر اور خلافت کے موضوعات میں ابن حزم سے استفادہ کیا ہے اس کے علاوہ اقبال اور ابن حزم دونوں کا نقطہ نظر قرآن کے بارے میں ایک ہی ہے کہ مسلمانوں کی راہنمائی صرف اسی کتاب سے ہو سکتی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ "The Development of Metaphysics in Persia" میں سب سے زیادہ مدد ابن حزم کی کتاب الملل والنحل اور شہرستانی سے لی ہے۔

علامہ اقبالؒ ایران کے قدیم مذہب زرتشت کے مختلف فرقوں کے نظریات کے بارے میں بتاتے ہیں۔ اور ابن حزم کے حوالے سے ایک فرقے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں جس نے ظلمت کی یہ توجیہ کی ہے۔ کہ ظلمت خود اسی نور کی اساسی قوت کے ایک جزو کے اخفا کا نام ہے۔ ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ ابن حزم ایران کی ملحدانہ فرقہ بندیوں کو عربوں کے خلاف ایک مسلسل پیکار

سمجھتا ہے۔ اس پُر امن طریقہ سے ایرانیوں نے عربوں کی قوت کے استحصال کی کوشش کی ہے۔ علامہ اقبال ابن حزم کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"پس اسماعیلی تحریک اس مسلسل جنگ کا ایک پہلو ہے جس کو ایسے ایرانیوں نے جن کو ذہنی آزادی حاصل تھی اسلام کے مذہبی و سیاسی نصب العین کے خلاف برپا کر رکھا تھا۔ ۳۲۔ اس طرح ابن حزم نے معمر اور ابو ہاشم کے خدا کی صفات کے بارے میں ان کی رائے بیان کی ہے۔ اقبال نے بھی اسی کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "خدا کے علم کے مطابق کوئی بات نہیں کہی جا سکتی کیونکہ اس کو جس چیز کا علم ہوگا وہ خود اس کی ذات ہوگی۔ ۳۳

اس طرح نظام کے نظریہ کو بھی ابن حزم کی کتاب سے لیا ہے۔ نظام نے یہ تعلیم دی ہے کہ مادہ لامحدود طور پر قابل تقسیم ہے۔ اس لیے جوہر و عرض کے باہمی امتیاز کو مٹا دیا۔" ۳۴۔

اس مقالے میں علامہ اقبال اندلس کے عربوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"بہر حال میں اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ عربوں کی ذہانت بالکل عملی تھی۔" ۳۵

ابن حزم بہت بڑے اجتہادی بھی تھے۔ اقبال نے اپنے ایک لیکچر (اجتہاد فی اسلام) میں ابن حزم کی مثال پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بھی ماضی کے غلط اور بے جا احترام کے قائل نہیں تھے۔ ضرورت سے زیادہ تنظیم کار جحان جس کا اظہار تیرھویں صدی اور بعد کے فقہاء کی کوششوں سے ہوتا ہے۔ اسلام کی اندرونی روح کے منافی ہے۔" ۳۶

ایک اور جگہ اقبال نے زمان و مکان کے مسئلہ پر ابن حزم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ اُن کا نظریہ جدید ریاضی کے مطابق ہے۔

"اور یہی وجہ ہے کہ اشاعرہ نے مکان و زماں کا لامتناہی تجزیہ تسلیم نہیں کیا برعکس اس کے یہ رائے قائم کی کہ مکان و زمان اور حرکت کا وجود جن نقطوں اور لمحوں پر مشتمل ہے اور انکا مزید تجزیہ ممکن نہیں۔ گویا وہ حرکت کا اثبات لاتجزیات کے اثبات سے کرتے تھے۔ کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مکان و زماں کے تجزیئے کی حد ہے تو یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ زمانے کے ایک متناہی وقفے کے اندر ہم ایک نقطہ مکانی سے دوسرے نقطہ مکانی تک حرکت کر سکتے ہیں۔ لیکن ابن حزم نے اشاعرہ کے لاتجزیات کا وجود تسلیم نہیں کیا اور جدید ریاضیات کو بھی اس سے اتفاق ہے۔" ۳۷

ابن حزم کی رائے تھی کہ دُعا ایک عمل ہے۔ یہی بات اقبال نے ذات الٰہ کے تصور اور

حقیقت دعا کے بارے میں دہرائی ہے۔ ذات الٰہ کے تصور کے مسئلے میں ایک جگہ علامہ اقبال نے ابن حزم سے اختلاف بھی کیا ہے۔

''ذات الٰہیہ کو ذات انسانی پر قیاس کرنے کا یہی اندیشہ تھا کہ جس کی بنیاد پر ہسپانوی عالم ابن حزم کو اس امر میں تامل ہوا کہ ذات باری تعالیٰ سے زندگی کا اسناد کرے اور جس نے باکمال ذہانت پھر یہ نقطہ پیدا کیا کہ ہم اُسے زندہ کہتے ہیں تو اس لیے کہ قرآن مجید نے اسے زندہ کہا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابن حزم کی نگاہیں واردات شعور کی سطح سے آگے نہیں بڑھیں اور وہ ان کے عمیق تر پہلو سے بے خبر رہا وہ سمجھا کہ زندگی عبارت ہے تغیر بالتواتر یعنی کسی متزاحم ماحول میں ایک رویئے کے بعد لگاتار دوسرا رویہ بدلنے سے اس میں کوئی شک نہیں کہ جس تغیر میں تواتر کی کارفرمائی ہے۔ وہ نقص کی علامت ہے۔ اور اس لئے ذات الٰہیہ کی کاملیت کا اثبات کیا جائے تو اس سے زندگی کا اسناد ناممکن ہوگا۔ لہٰذا ابن حزم کو یہی بہتر نظر آیا کہ اس کی صفتِ حیات کو اس کے کمال ذات پر قربان کردے۔'' ۳۸

اس بارے میں مزید بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''لہٰذا اس میں تغیر کی موجودگی کا یہ مطلب تو ہے نہیں کہ ہم اس کو بدلتے ہوئے رویوں کا ایک تواتر قرار دیں برعکس اس کے یہاں اس کی حقیقی نوعیت کا اظہار مسلسل خلاقی میں ہو رہا ہے۔ جس میں تھکن کا شائبہ ہے نہ اونگھ اور نیند کا اس کو بے تغیر ٹھہرایا گیا ہم اس کا تصور محض ایک تعطل، ایک بے مقصد اور بے حرکت بے رنگی یا ایک مطلق لاشئے ہی کے طور کر سکیں گے۔ دراصل ایک ایسے انا کے لیے جو سرتاسر خلاق ہو تغیر کے معنی نقص کے نہیں ہو سکتے اس لیے جو ہستی اپنی ذات میں کامل ہے اور ہمہ تن خلاق ہے اس کی کاملیت کے فہم میں یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ہم اُسے مکانیاتی قسم کے عدم حرکت ہی سے تعبیر کریں۔ جیسا کہ ارسطو کے زیر اثر شاید ابن حزم کا خیال تھا۔ خلاق مطلق کا کمال ذات یہ ہے کہ اس کی تخلیقی فعالیت کے سرچشمے بے پایاں ہیں۔ بعینہ جیسے اس کی تخلیق بصیرت کی کوئی حد نہیں۔ اس کی زندگی انکشاف ذات کی زندگی ہے۔ اس لیے کہ وہ کسی نصب العین کے درپے نہیں انسان کا ہنوز تو بے شک جستجو کی علامت ہے۔ ناکامی اور نامرادی کی۔ لیکن خلاق مطلق کا ہنوز عبارت ہے ان لاانتہا تخلیقی امکانات سے جو اس کے اپنے وجود میں مضمر ہیں۔ اور لازم ہے ایک حقیقت بن کر منصۂ شہود پر آئیں۔ لیکن جس کی شان کلیت میں اس سارے عمل کے باوجود سرمو فرق نہیں آتا بقول گوئٹے۔

اپنی ہی ذات کے بے پایاں تکرار میں
کیونکہ وہ سدا رواں دواں ہے
کتنی محرابیں ہیں جو بڑھ بڑھ کر اور مل مل کر
اتنے بڑے قالب کو سہارا دیتی ہیں
ہر شے سے زندگی کی محبت پھوٹ رہی ہے
بلند ترین ستارہ ہو یا حقیر ترین ذرہ
یہ ساری کشمکش اور ساری جدوجہد
ابدی سکون ہے ذات خداوندی میں

امام ابن تیمیہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔'' ۳۹

''مذہب ظاہری کے موسس ابن حزم ظاہری کی طرح انہیں بھی فقہ حنفی کے اصول قیاس اور اجماع سے جیسا کہ فقہائے متقدمین ان کی تعبیر کرتے چلے آئے ہیں انکار تھا۔ ان کی رائے تھی کہ اجماع ہی ہر قسم کے توہمات کا سرچشمہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عہد کے اخلاقی اور ذہنی ضعف اور فرسودگی پر نظر رکھیئے تو ان کا یہ خیال سرتاسر حق بجانب تھا۔'' ۴۰

اشاعرہ کے نزدیک کائنات کی ترکیب جواہر یعنی اِن لا انتہا چھوٹے چھوٹے ذروں سے ہوئی جن کا مزید تجزیہ ناممکن ہے۔ لیکن خالق کائنات کی تخلیق فعالیت کا سلسلہ چونکہ برابر جاری ہے۔ اس لیے جواہر کی تعداد بھی لامتناہی ہے۔ کیونکہ ہر لحظہ نئے نئے جواہر پیدا کئے جا رہے ہیں۔ اور اس لیے کائنات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ قرآن مجید کا بھی یہی ارشاد ہے۔

"و الله يزيد فى الخلق ما يشاء"

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ جواہر کی حقیقت کا دارومدار ان کی ہستی پر نہیں ہستی وہ صفت ہے جو اللہ تعالیٰ جواہر کو عطا کرتا ہے جب تک یہ صفت عطا نہیں ہوتی جواہر گویا قدرت الٰہیہ کے پردے میں مخفی رہتے ہیں۔ وہ ہستی میں آتے ہیں تو اس وقت جب یہ قدرت مرئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لہٰذا بہ اعتبار ماہیت جوہر قدر سے عاری ہے۔ گویوں کہیے کہ اسکا ایک محل بھی ہے۔ لیکن مکان سے بے نیاز۔ کیونکہ یہ صرف جواہر کا اجتماع ہے جس سے ان میں امتداد کی صفت پیدا ہوئی اور مکان کا ظہور ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن حزم نے اس نظریئے پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ اصطلاح قرآنی عمل تخلیق اور شے مخلوق میں کوئی فرق نہیں ہم جسے شے کہتے ہیں۔ وہ صرف ان اعمال کا

مجموعہ ہے جن کا اظہار جواہر کی شکل میں ہو رہا ہے۔"[۴۱]

اقبال نے اپنے خطبات میں اکثر جگہ ابن حزم کی کتاب الملل والنحل کے حوالے دیئے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کا بطور خاص مطالعہ کیا تھا اور انہیں اپنے لیکچروں میں اس کتاب سے کافی مدد ملی۔ علامہ اقبال نے علم ظاہر اور علم باطن کے عنوان سے ۱۹۱۶ء میں ایک مضمون لکھا تھا اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"اہل نظر کو معلوم ہے کہ صوفیائے اسلام میں ایک گروہ ایسا بھی ہے۔ جو شریعت اسلامیہ کو علم ظاہر کے حقارت آمیز خطاب سے یاد کرتا ہے۔ اور تصوف سے وہ باطنی دستور العمل مراد لیتا ہے۔ جس کی پابندی سے مالک کو فوق الادراک حقائق کا عرفان یا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔

صوفیاء کے اس گروہ کے خیالات کی عمارت کا بنیادی پہلو علم ظاہر اور علم معارف کا امتیاز ہے ..... یہ امتیاز نتائج کے اعتبار سے نہایت خطرناک تھا اور جو اثر اس نے مسلمانوں کے علوم اور ان کے ادبیات اور ان کے تمدن و معاشرت اور سب سے بڑھ کر ان کے شعائر ملیہ پر کیا ہے۔ وہ ایک افسردہ کرنے والی داستان ہے۔[۴۲]"

اس بارے میں اب سے ایک ہزار سال قبل ابن حزم لکھتے ہیں۔

"تمہیں جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا دین ظاہر ہے۔ جس میں کوئی باطن نہیں علانیہ ہے جس کے نیچے کوئی خفیہ راز نہیں سب کا سب برہان ہے۔ جس میں کسی قسم کی درگزر اور چشم پوشی نہیں ہے۔ جو بغیر برہان کے پیروی کرنے کو بلائے اسے قبیح سمجھ جو دین کے لیے راز باطن کا دعویٰ کرے تو یہ بھی محض دعوے اور جہل حماقت کی باتیں ہیں۔"[۴۳]

اقبال صوفیاء کے اس گروہ کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کے نزدیک علم باطن ایک مرتب و منظم دستور العمل ہے جو شریعت اسلامیہ کے خلاف ہے اور جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرامؓ میں سے بعض کو نہ دی۔"[۴۴]

اقبال کہتے ہیں ..... "احادیث صحیحہ میں کوئی ایسی روایت ہماری نظر سے نہیں گزری جس سے معلوم ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علم رسالت میں سے کوئی خاص بات خاص علم بعض صحابہ کو سکھایا اور بعض سے چھپایا بادی النظر میں بھی یہ بات خلاف شانِ رسالت محمدیہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ یہ آخری رسالت تمام جہانوں کے لیے رحمت ہے اور ایسا عقیدہ رکھنا حقیقت میں بعض جلیل القدر صحابہؓ کی توہین ہے۔"[۴۵] اس موضوع پر ابن حزم رقم طراز ہیں۔

"تمہیں جاننا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی شریعت کا ایک کلمہ یا اس سے کم کو بھی نہیں چھپایا نہ کبھی ایسا کیا کہ آپ نے کسی امر شریعت کی اطلاع دینے میں اپنے خاص لوگوں کو مثلاً زوجہ یا دختر یا چچا یا چچازاد بھائی یا کسی ساتھی یا دوست کو مخصوص کیا ہو سرخ یا سفید بکری کے چرواہوں تک سے چھپایا ہو۔ نہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی سر، رمز یا باطن تھا بجز اس کے جس کی آپ لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔ اگر آپ لوگوں سے کچھ بھی چھپاتے تو ہرگز وہ تبلیغ نہ کر سکتے جس کا آپ کو حکم دیا گیا۔[۴۶]"

ابن حزم کواکب کے بارے میں کہتا ہے وہ عالم کی تدبیر نہیں کرتے وہ خود مجبور و بے اختیار ہیں۔ انکی حرکت ایک ہی حرکت ہے۔ جس میں اختلاف نہیں ہوتا حالانکہ صاحب اختیار ایسا نہیں ہوتا، اس بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں۔

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار و زبوں [۴۷]

☆☆☆

معتمد بن عباد

محمد بن عباد المعتمد علی اللہ گیارھویں صدی عیسوی اشبیلیہ کا عرب حکمران تھا۔ اس زمانے میں قرطبہ، اشبیلیہ، طلیطلہ اور بطلیموس میں خودمختار حکومتیں بن گئی تھیں۔ لیکن سب سے اہم اشبیلیہ تھی۔ اگرچہ سیاسی زوال اور طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ مگر یہی شعر و ادب اور فلسفہ کا زریں دور بھی تھا۔ معتمد اپنی فیاضی، مہمان نوازی اور علم و ادب سے لگاؤ کے باعث کافی شہرت کا حامل تھا۔ اس کے دربار میں بہت سے شعراء و ادبا تھے جن میں خاص طور پر ابنِ عمار اور ابنِ زیدون دربار کی زینت تھے۔

اقبال، معتمد کے حالات سے بہت متاثر تھے۔ بالِ جبریل میں ''قید خانے میں معتمد کی فریاد'' کے عنوان سے ایک نظم ہے۔ جس کے نیچے یہ اضافی نوٹ ہے۔

(معتمد اشبیلیہ کا بادشاہ تھا اور عربی شاعر تھا۔ ہسپانیہ کے ایک اور حکمران نے اس کو شکست دے کر قید خانے میں ڈال دیا تھا۔ معتمد کی نظمیں انگریزی میں ترجمہ ہو کر ''وزڈم آف دی ایسٹ سیریز'' میں شائع ہو چکی ہیں۔)

الفانسو نے طلیطلہ پر قبضے کے بعد اشبیلیہ پر قبضہ کرنا چاہا تو معتمد نے مرابطین سے مدد چاہی، اس کے بیٹے نے مخالفت کی اور کہا اس طرح سلطنت ہاتھ سے نکل جائے گی۔ معتمد نے بے ساختہ جواب دیا۔

رعی الجمال خیر من رعی الخنازیر

''اونٹ چرانا، سور چرانے سے زیادہ بہتر ہے۔''[۴۸]

اقبال معتمد کے حالاتِ زندگی سے بہت متاثر تھے۔ جو شمشیر و سناں کا دلدادہ، آزادی کا متوالا اور غیرت و حمیت کا پروانہ تھا۔ معتمد کسی عظیم سلطنت کا بادشاہ نہ تھا۔ اس کی شہرت کا سبب اس کا شاعرانہ مزاج اور فن کارانہ خصوصیات ہیں۔ جو عموماً بادشاہوں میں نہیں پائی جاتیں۔ ہم اس کا مقابلہ مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ، بہادر شاہ ظفر سے کر سکتے ہیں دونوں شاعر تھے۔ اور دونوں کو معزول کر کے نظر بند کیا گیا۔ فرق یہ تھا کہ بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری غیروں کے ہاتھوں ہوئی تھی لیکن معتمد اپنوں کے ہاتھوں پابندِ سلاسل ہوا تھا۔ اس کے علاوہ معتمد نے لڑائی کے وقت اور قید کے دوران بھی حالات کا انتہائی کمال ہمتی اور بلند ظرفی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ جس طرح ہندوستان کے

مسلمان بہادر شاہ ظفر کو یاد کر کے روتے تھے۔ اسی طرح اُندلس اور دیگر عرب ممالک کے مسلمان معتمد کے ماتم گسار رہے۔ اور اس طرح اسے ایک ہیرو کا مقام حاصل ہو گیا۔

معتمد نہایت حساس انسان اور نازک خیال شاعر تھا۔ اس کا کلام اس کی زندگی کا آئینہ دار اور اس کے حساس دِل کی نازک کیفیات و جذبات کا مرقع ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اقبال کی دلچسپی کی وجہ بنی۔ معتمد نے قید خانے میں جو نظمیں کہی ہیں ان سے اقبال جیسے صاحب درد کا متاثر ہونا لازمی تھا۔

معتمد ۴۳۲ھ میں پیدا ہوا۔ یہ وُہ زمانہ تھا جب اُندلس میں مُسلمان ''طاؤس و رُباب'' کے آخری مرحلے سے گزر رہے تھے۔ اور مسلمان اُمراء کی زندگی عیش و نشاط کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی۔ معتمد بھی اس ماحول کا پروردہ تھا۔ اس لیے اس کی زندگی قابل ذکر سیاسی کارناموں سے خالی ہے۔ لیکن قرطبہ کی فتح اور اشبیلیہ کے دفاع میں بہادری کے جوہر دکھائے ہیں لیکن شعر و سخن کے میدان میں بھی اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

گیارہ برس کی عمر میں اس کے باپ نے اُسے صوبہ ولبہ کا حاکم مقرر کر دیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد محاصرہ شلب میں لشکرِ اشبیلیہ کی سپہ سالاری سپرد ہوئی۔ اس زمانے میں معتمد کی ملاقات محمد بن عمار سے ہوئی جس کا اس کی زندگی پر بڑا اثر پڑا۔ محمد بن عمار بھی شاعر تھا۔ ہم مشربی اور ہم مذاقی کی وجہ سے معتمد اسے بہت چاہتا تھا۔ معتمد کی محبوب ملکہ رمیکیہ بھی شاعرہ تھی۔ جس سے وُہ انتہا درجے کی محبت کرتا تھا۔ اُنتیس سال کی عمر میں معتمد اپنے باپ معتضد کے تخت پر بیٹھا۔ عیش پرستی اور فن دوستی کے باوجود معتمد کی فطرت میں جرات اور شجاعت کے جوہر موجود تھے۔ اس نے اپنی بعض نظموں میں رجز خوانی کی ہے۔ اور اپنی فتوحات پر تفاخر کا اظہار کیا ہے۔ ۴۶۳ھ میں معتمد نے قرطبہ پر قبضہ کر لیا تو اس معرکے کو نظم میں یوں بیان کرتا ہے۔

''میں نے پہلے ہی حملے میں خوبصورت قرطبہ کو حاصل کر لیا۔ قرطبہ وہ بہادر عورت تھی جو ہمیشہ تلوار اور برچھی سے اُن لوگوں کو جو اُس سے شادی کرنا چاہتے تھے دُور رکھا کرتی تھی۔ اب میں اس کے قصر میں شادی رچاتا ہوں۔ دوسرے نامراد اور میرے رقیب بادشاہ روتے اور خوف سے کانپتے ہیں۔۔۔ اے نفرت کے قابل دشمنو!

تمہارا خوف سے لرزنا درست ہے کیونکہ کوئی دم میں شیر تم پر جست کرنے والا ہے۔''[۴۹]

معتمد نے اکثر نظموں میں اپنے آپ کو ایک ''شیر'' سے تشبیہ دی ہے۔ کچھ لوگوں نے

اس کے ایک وزیر کے خلاف اشعار میں اس کی شکایت کی اس کا جواب معتمد نے حکیمانہ اور دانشمندانہ انداز میں دیا۔

کذبت منکم
صرحوااوجمجموا فالذین امتن
والسجیة اکرم خنتم و رمتم اِن
اخون وانما حادلتم ان یستحفا
یلهلم وارد تم لضییق صدرلم یضق
والسحر فی ثغو النحورتحطم
وزحفتم لمحا لکم لمجرب مازال
یثبت المحان فیهزم انی رجوتم
عذر من جربتم
منعة الوفاء و ظلم من لایظلمانا
ذلکم لا البغی ثمر غرسه عندی و
لا مبنی الضیعة یهدم کفوو
الافارقبوالی بطشة یبقی السفیه
بمثلها یتحلر

تمہاری خواہشیں غلط ہیں۔ ان کی تصریح کرو خواہ مبہم رکھو اس لیے کہ دین سب سے طاقتور اور اخلاق سب سے زیادہ شریف ہے تم لوگوں نے خیانت کی اور یہ چاہا کہ ہم بھی خیانت کریں اور تم نے چاہا کہ کوہِ یلملم اپنی جگہ سے ہٹ جائے اور تم نے ایک ایسے سینہ کو تنگ بنانا چاہا جو اس حالت میں بھی تنگ نہ ہو جبکہ سینہ کے حلقوں میں نیزے ٹوٹتے رہتے ہیں اور تم نے اپنے حیلوں سے ایک آزمودہ شخص پر حملہ کیا جو ہمیشہ دشمنوں کے مقابلے میں ثابت قدم رہتا اور شکست دیتا ہے۔ تم ایک ایسے شخص سے جس کی وفاداری کو تم آزما چکے ہو بے وفائی کی اور جو ظلم نہیں کرتا اس سے ظلم کی امید کیونکر قائم کر لی۔ ہم وہ ہیں کہ فساد کا درخت ہمارے پاس پھل نہیں دیتا اور نہ احسان کی عمارت منہدم ہوتی ہے۔ باز آؤ ورنہ ہماری ایسی گرفت کے منتظر رہو جس قسم کی گرفت سے احمق شخص عقلمند بن جاتا ہے۔ ۵۰

جب مرابطین نے معتمد کی سلطنت پر قبضہ کر لیا اور اسے گرفتار کر لیا تو یہیں سے اُس کی حبسیہ شاعری کا آغاز ہوا جو حزن وملال سے لبریز ہے۔ معتمد کی حبسیہ نظمیں عربی شاعری کی سادگی اور حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ گرفتاری سے لے کر آخری دم تک اُسے جن جن مراحل سے گزرنا پڑا اور قید و بند کی جو جو صعوبتیں جھیلنی پڑیں ان سب کی روداد نہایت موثر اور دلکش پیرائے میں معتمد نے بیان کی ہے۔ معتمد کو اشبیلیہ سے گرفتار کیا گیا۔

اشبیلیہ کے محاصرے کے دوران میں اس نے ایک نظم لکھی جو اس کی حبسیہ شاعری کا نقطہ آغاز ہے۔

ان یسلب القوام العدا
ملکی و تسلمنی الجموع
فالقلب بین صلوعه
لم تسلکم القاب الضلوع قدرمت
یوم قتالهم
ان لا تحصننی الدروع
و برزت بس سدی القمیص
من الحشاشی الدفوع
و بذلت نعنی کی تسیل
اذا یسیل بها النجیع
اجلی تاخر لم یکن
یهواه ذلی والخشوع
ماسرت قط لی القتا
ل وکان من املی الرجوع
شیم الاولی انا منهم
والاصل تتبعه الفروع

اگرچہ دشمنوں نے میرا ملک چھین لیا اور فوج نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

پھر بھی دِل اپنی پسلیوں کے درمیان موجود ہے۔ اور پسلیوں نے دِل کو نہیں چھوڑا ہے۔

ہم نے دشمنوں سے جنگ کے دِن یہ ارادہ کیا کہ زرہیں میری حفاظت نہ کریں۔

اور اس حالت سے باہر نکلے کی قمیض کے سوا میری جان کی حفاظت کرنے والی دوسری کوئی چیز نہیں تھی اور ہم نے اپنے نفس کو اس لیے وقف کر دیا ہے کہ جب اس سے کچھ نکلے تو خون نکلے۔

میری موت نے اس وجہ سے تاخیر کی کہ میری ذلت و رسوائی اُسے نہین چاہتی تھی۔

ہم کبھی قتال میں اس طرح نہیں گئے کہ ہم کو واپس آنے کی امید ہو۔

ہم جن لوگوں کی نسل سے ہیں ان کی یہی خصلت تھی اور فروع اپنے اصل کا اتباع کرتی ہی ہیں۔ ۵۱

گرفتاری کے بعد معتمد کو اشبیلیہ سے طنجہ (افریقہ) لے جایا گیا۔ اشبیلیہ سے جب سمندر میں پہنچا تو یہ اشعار کہے۔

لم انس والموج يدنيني يقصيني
والموت كامن البربان يا تيني
البصرت هو لالوان الدهر البصره
لا بصر الدهر امر اليس بالدون
قدكنت ضنّا بنفس لا اجود بها
فبعتها اضطرار ابيع مغبون كم
ليلة بتّ مطويا على حرق
في عسر من عيون الدير في الحين فتلك
احسن ام امر ظلمت به في ظل عزة
سلطان و تمكين ولم تكن و الذي تعنو
الوجوه له عرضي مهانا ولا مالي
بمحزون وكم خلوت من الهيجا
بمعترك
والحرب ترفل في اثوابها الجون
يارب ان لم تهب حالا اسرّبه فهب
لعبدا جرا غير ممنون

ہم اس حالت کو نہیں بھولے کہا موج
ہم کو کبھی نزدیک اور کبھی دور کرتی تھی۔ اور
معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب ناخدا کے پاس
سے میرے لیے موت آ جائے گی۔ ہم
نے ایسی چیز دیکھی کہ اگر زمانہ اس کو دیکھے
تو وہ ایسی چیز دیکھے جو حقیر نہیں ہے ہم
زندگی کے ایسے حریص تھے کہ اس کو خوشی
سے دینا نہیں چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ
مجبوراً اسے خسارہ کے ساتھ بیچنا پڑا۔ ہم
نے بہتری راتیں تپتی ہوئی آگ پر لیٹ
کر بسر کیں۔ پھر یہ حالت اچھی ہے یا وہ
جس سے ہم ہمیشہ سلطنت و تمکنت کی
عزت کے سایہ میں رہتے۔ اور قسم ہے
اس ذات کی جس کے آگے سب ذلیل
ہیں۔ کہ نہ ہماری عزت و آبرو کی اہانت
ہوتی اور نہ ہمارا مال محزون ہوتا۔ حالانکہ
ہم جنگ کے معرکے میں بہتری دفعہ اس
حالت سے گزرے ہیں کہ جنگ اپنے
سرخ کپڑوں پر ناز کر رہی تھی۔ اے رب
! اگر تو نے ہمیں غیر مسرور حالت عنایت ۵۲
کی ہے تو اپنے بندہ کو غیر منقطع اجر بھی عطا
کر۔

طنجہ سے مرابطین اُسے ''مکناسہ'' لے گئے۔ اور بالآخر اُسے اغمات کے مقام پر قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ جب معتمد کو طنجہ سے مکناسہ پہنچایا جا رہا تھا تو راستے میں اسے بہت سے آدمی بارش کی دُعا کے لیے مسجد کی طرف جاتے ہوئے ملے۔ معتمد نے انہیں دیکھ کر فی البدیہہ یہ اشعار کہے جو اس کے حسنِ بیان اور حسنِ تخیل کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔

''جب لوگ مینہ کی دُعا مانگنے والے تھے
جب مجھے ملے
تو میں نے کہا کہ میرے آنسو مینہ کی جھڑی کا کام دے سکتے ہیں۔
اِن لوگوں نے جواب دیا
یہ تو درست ہے کہ آپ کے آنسو ضرور کافی ہوں گے،
لیکن مشکل یہ ہے کہ اِن میں خون ملا ہوا ہے'' ۵۳

اغمات میں معتمد اس طرح اسیری کے دِن کاٹتا رہا۔ کبھی بیڑیاں کٹ جاتیں۔ کبھی پھر پہنا دی جاتیں۔ ایک روز قید خانے کی کھڑکی سے پرندوں کا ایک غول اُڑتے ہوئے دیکھا تو اُس کا تخیل اس طرح مائل بہ پرواز ہوا۔

جب میں نے ''قطا'' کا ایک جھنڈ آسمان پر اُڑتے ہوئے دیکھا،
تو میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے،
وُہ آزاد تھے،
قید خانے اور بیڑیوں سے واقف نہ تھے،
میرے آنسوؤں کا باعث رشک نہ تھا بلکہ اس بات کی خواہش تھی،
کہ میں بھی انہیں کی طرح آزاد ہوتا،
اگر مجھے اتنی آزادی مل جائے کہ جہاں چاہوں جاؤں،
تو میرے دِل کے غموں کا بوجھ نہ رہے،
میں اپنے بچوں کی موت پر بھی رونا چھوڑ دوں،
اے پرندو!
تم کیسے خوش ہو،

تم اپنوں سے جُدا نہیں ہو،
اہل وعیال سے مفارقت کا غم تم نہیں جانتے،
اَور نہ ہی تم ان راتوں کی تکلیف سے واقف ہو،
جو قید خانے میں دروازے بند ہونے کی آواز سننے کے بعد کاٹی جاتی ہیں،
اِن پرندوں کا خُدا روزی رساں ہے،
لیکن میرے بچے پیاس اور سائے کے بغیر مرے جاتے ہیں۔" ۵۴

اس قید و بند کے عالم میں ایک مرتبہ معتمد نے اپنی زنجیروں سے مخاطب ہو کر نہایت پُر درد اشعار کہے۔ اُن اشعار سے اقبال بہت متاثر ہوئے اَور اپنے تاثرات کا اظہار اس نظم میں کیا جو "قید خانے میں معتمد کی فریاد" کے عنوان سے بال جبریل میں شامل ہے۔ عموماً یہ نظم معتمد کے اشعار کا ترجمہ (یا آزاد ترجمہ) سمجھی جاتی ہے۔ لیکن دونوں نظموں کے تقابلی مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کی نظم یا آزاد ترجمہ نہیں کہی جا سکتی بلکہ محض اقبال کے دلی تاثرات اور معتمد کی عام حبسیائی شاعری کا انعکاس ہے پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے "شرح بال جبریل" میں معتمد کی اس نظم کے صرف دو اشعار نقل کیے ہیں۔ یہاں پوری نظم ایک عربی تصنیف کے حوالے سے درج کی جاتی ہے۔

قیدی اما تعلمنی مسلما — ابیت ان تشفق او ترحمنا
دمی شراب لك و اللحم قد — اکلته ل تمشم ال عظما
یبعرنی نیك ابوهاشم — فینشی و القلب قد هشما
اِرحمَ طفیلا طائشا لسبه — لم یغثی ان یاتیك مسترحما
و ارحم اخیّات له مثله — جد عتهن السم وَ العلقما
منهن مَن یفهم شیئا فقه — ففنا علیه للسکاء العمٰی
و الغیر لا یسعهم شیئاً فما — یفتح اِلا الرضاع فما ۵۵

ترجمہ:

"اے میری زنجیر! تجھے معلوم ہے نا کہ میں مسلمان ہوں،
مجھے تیری شفقت اَور مہربانی درکار نہیں،
میرا خون تیرا مشروب اَور میرا گوشت تیری غذا،
اب صرف ہڈیاں رہ گئی ہیں انہیں چبا کر تجھے کیا ملے گا،

میرا بیٹا ابوھاشم مجھے (زنجیروں میں) جکڑا دیکھ کر واپس لوٹ جاتا ہے،
اور (یہ دیکھ کر) میرا بیٹا دل پس کر رہ جاتا ہے،
ایک ننھے بچے پر تو رحم کھا،
جو معصوم نادان ہے اَور تجھ سے ترحم کی امید میں بے جھجک آ جاتا ہے،
اس کی چھوٹی چھوٹی بہنوں پر بھی رحم کر جو اس کی طرح بھولی بھالی ہیں،
(افسوس!) تو نے انہیں زہر اور حنظل کا مزا چکھایا،
اِن میں سے کچھ ایسی ہیں جو بالکل ناسمجھ ہیں اَور کچھ بھی نہیں سمجھتیں اَور
ان کا منہ صرف دودھ پینے کے لیے کُھلتا ہے"

معتمد کی اس نظم کے ساتھ اقبال کی نظم ملاحظہ ہو:

اِک فغانِ شرر سینے میں باقی رہ گئی
سوز بھی رخصت ہوا جاتی رہی تاثیر بھی
مردِ حُر زندان میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج
میں پشیماں ہوں پشیماں ہے مری تدبیر بھی!
خود بخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دِل
تھی اسی فولاد سے شاید مری شمشیر بھی!
جو مری تیغ دو دم تھی، اب میری زنجیر ہے
شوخ و بے پروا ہے کتنا خالقِ تقدیر بھی! ۵۶

معتمد ایک طویل عرصے تک بیمار رہ کر ۴۸۹ھ میں بعمر پچپن سال قیدِ حیات سے آزاد ہوا اور اس کا جسدِ خاکی اغمات ہی کے قبرستان میں مدفون ہوا۔

وفات سے پہلے معتمد نے خود اپنا مرثیہ لکھا اَور وصیت کی کہ اس کی لوحِ مزار پر کندہ کیا جائے۔ مرثیہ یہ ہے۔

قبر الغريب سفاك الرائح الغادى
حقّا ظفرت با شلاء ابن عباد بالحلم
، بالعلم ، با لنعمى اذا تصلت
بالخصب ان اجد بوبالرى للعادى
بالواعن الضادب لادمى اذا اقتتلوا
بالموت احمد بالفرِ غامة العادى
بالدهر فى نقم بالبحر فى نعم بالبدر
فى ظلم بالصدر فى النادى نعم هو
الحق فا جانى على قدر
من السماء ودا افانى بميعاد ! ولم
اكن قبل ذاك النعش اعلمه ان
الجبال تهادىٰ فوق اوادا كفاك
فارفق نما استورعت من كثى
رُواك كل قطوب البرق دعّادا!
يبكى اخاه الدى غيبت و ابله
تحت الصيفح بدمع دائح غادى
حتى بجورك دامع الطل مفهمراً
من اتين الزحرلم تبخل باسعاد
ولا تزال صلولة الله نازلة علىٰ
دفينك لاتحصى بتعداد

بے کس کی قبر! تجھ کو صبح اور شام کی بدلی
سیراب کرے سچ ہے کہ تو نے ابنِ عباد
کے اعضاء کو پالیا ہے تو نے اس شخص کو پایا
ہے جو حلم، علم اور احسان کا مجموعہ تھا۔ اگر
لوگ قحط میں مبتلا ہوتے تو وہ فراخ سالی
تھا، پیاسے کے لیے سیرابی تھا۔ جب
لوگ جنگ کرتے تو وہ نیزے باز، تلوار
مارنے والا اور تیرانداز تھا۔ موتِ احمر تھا
غضبناک شیر تھا ودیعت میں دہر تھا۔
نعمت میں بحر تھا، تاریکی میں بدر تھا مجلس
میں صدر تھا۔ ہاں! وہ (موت) حق ہے۔
تقدیر کے موافق آسمان سے دفعتہً ہم پر آ
گری اور وقتِ مقرر پر ہم کو پالیا۔ اور ہم اس
تابوت سے قبل یہ نہیں جانتے تھے کہ پہاڑ
لکڑیوں پر اٹھا کر لائے جاتے ہیں تیرے
لیے یہ کافی ہے اب تو اس کرمِ مجسم کے
ساتھ جو تجھ میں ودیعت کیا گیا ہے نرمی کر تجھ
کو وہ (بجلی) صبح وشام کے آنسو سے اپنے
اس بھائی کو روتی ہے۔ جس کی بارش کو تو نے
پتھر کی چٹان کے نیچے چھپا لیا ہے۔ جب
تک شبنم کے آنسو پھولوں کی آنکھوں سے
تجھ پر کثرت سے ٹپکتے رہیں تیرے اشعار
میں کمی نہ ہو اور اللہ کی رحمت بے انتہا تعداد
میں تیرے مدفن پر نازل ہوتی رہے۔ ۵۷

الطرطوسی

ابوبکر محمد بن الولید بن محمد بن خلف بن سلیمان بن ایوب الفہری جو الطرطوشی اور ابنِ ابی رندقہ کے نام سے مشہور تھے علمِ فقہ اور حدیث کے ایک بہت بڑے استاد تھے۔ ۴۵۱ھ، ۱۰۵۹ء کو نواح طرطوسہ میں پیدا ہوئے۔ ۵۳۰ھ، ۱۱۲۶ء میں انتقال کیا۔ پہلے اپنے شہر میں پھر سرقسطہ میں قاضی ابوالولید سلیمان بن خلف الباجی سے فقہ وادب کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد ۱۰۸۳ء میں حج کیا، اور بغداد، بصرہ، دمشق اور بیت المقدس میں تعلیم کے سلسلے میں سفر کیا واپس آتے ہوئے کچھ عرصہ قاہرہ میں مقیم رہے۔ اس کے بعد اسکندریہ میں حدیث وفقہ کے استاد کی حیثیت سے مقیم ہو گئے۔ مشرق میں ان کے اساتذہ الحسن الشاسی اور ابوعلی احمد بن علی التستری ہیں۔ ان کے شاگردوں میں ابوبکر بن العربی، ابوعلی الصدفی اور المہدی بن تومرت شامل ہیں۔ اور چونکہ قاضی عیاض نے بھی طرطوشی سے اجازۃ حاصل کیا اس لیے وہ بھی اس کے شاگرد ہیں۔ اس کی کتابوں کی تعداد بارہ ہے۔ جن میں سے یہ ملتی ہیں۔

(۱) تحریم الاستمنا (۲) الحوادث والبدع
(۳) الکشف والبیان عن تفسیر القرآن مصنفہ ابواسحاق احمد کی کتاب کا خلاصہ
(۴) سراج الملوک، سیاست اور امورِ سلطنت کے متعلق رسالہ ہے۔ ۵۸

ابوولید طرطوسی نے غزالی کے متعلق لکھا ہے کہ غزالی کے فلسفے کے بہت سے مسائل بوعلی سینا کے خیالات پر مبنی ہیں۔ اس کی کتاب سراج الملوک غلط طور پر ابنِ رشد کی طرف منسوب ہے۔ ۵۹

علامہ اقبال نے خلافت اسلامیہ کے عنوان سے ایک انتہائی معلوماتی تحقیقی اور بصیرت افروز مضمون ۱۹۰۸ء میں لکھا ہے۔ جس میں مسلمانوں کے طریقہ انتخاب مختلف فرقوں میں اس بارے میں نظریات وقوانین پر بحث کی ہے۔ اِس میں علامہ طرطوسی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ غیر مسلموں کو شریکِ حکومت کیا جا سکتا ہے یا نہیں تو علماء سے باقاعدہ فتویٰ طلب کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین فقہا شرح مبین اِس مسئلہ میں کہ ذمّی لوگوں کی حوصلہ افزائی شرعاً جائز ہے یا نہیں اور کیا دیتے ہیں وہ رائے اس بارے میں کہ ملکی انتظامات میں ذمیوں کو حکام وعمال کے منشی یا محرر بنانے یا لگان کے محصلین مقرر کرنے سے جو امداد ومعاونت ان سے

حاصل کی جاتی ہے۔ وہ شرعاً جائز ہے یا نہیں دلائل قاطع سے مسئلہ مذکورہ بالا کی توضیح فرمائی جائے اور براہین ساطع سے اس کے متعلق ایمان حقہ کی تبیین کی جائے۔"

جزاء کم اللہ احسن الجزاء

اس قسم کے استفتاء حکومت خود بھی کرتی ہے۔ جب مفتیوں کے فتوؤں میں اختلاف رائے ہو تو عمل کثرتِ رائے کے فیصلہ پر کیا جاتا ہے۔

جبری انتخاب قطعاً ناجائز ہے۔ لیکن مصری فقیہ ابنِ جمع کی رائے یہ ہے۔ کہ سیاسی ہلچل کے زمانے میں جائز ہو سکتا ہے۔ شریعت ایسے عمل کو جو فوری اور ہنگامی ضرورت سے پیدا ہو تسلیم نہیں کرتی۔ اِس قسم کے انتخاب جو اسلامی حکومتوں میں عمل میں آئے وہ بے شک وشبہ تاریخی واقعات کی نظیروں پر مبنی تھے۔ نہ کہ آئینِ اسلام پر اندلسی فقیہ طرطوسی بھی غالباً اِسی خیال کا ہے۔ کیونکہ اس کا قول ہے کہ ظلم وستم کے چالیس سال فتنہ وفساد کے ایک لمحہ سے بہتر ہیں۔"[60]

عربوں میں حاکم کے ظلم وستم کو ایک اچھے منتظم کی حیثیت سے اکثر ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ مشہور ہے۔

"ایک اعرابی حجاز سے عبدالمالک کے پاس آیا۔ عبدالمالک نے اعرابی سے حجاج بن یوسف کا حال پوچھا، اس نے گویا حجاج بن یوسف کی تعریف کرتے ہوئے اس کے حُسنِ انتظام کو ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ کہ میں اس کو تنہا ظلم کرتے ہوئے چھوڑ آیا ہوں۔ گویا عرب میں صرف حاکم ہی ظلم وستم کرتا ہو تو یہ اس کے حسنِ انتظام کی دلیل ہے"[61]

☆☆☆

محمد ابن تومرت

بن تومرت ۱۰۷۸ء میں سوس میں پیدا ہوا۔ وہ مذہبی شدت پسندی اور علم الکلام کا عجیب وغریب مجموعہ تھا۔ خود کو حضرت علیؓ کی اولاد سے منسوب کرتا تھا اور مہدی موعود کا مدعی تھا۔

ابن تومرت نے اپنی سیر وسیاحت کا آغاز اندلس سے کیا اور وہیں ابن حزم کی تصانیف سے اِس کے خیالات متاثر ہونا شروع ہوئے۔ اس کے بعد اِس نے مشرق کا سفر کیا لیکن اِس سفر کی تاریخیں کچھ یقینی نہیں۔ المراکشی کے بیان کے مطابق سکندریہ میں ابوبکر طرطوشی کے درس میں شریک رہا جو اپنے اشعری عقائد کے باوجود غزالی کا مخالف تھا۔ اِن درسوں کے اُس پر ضرور اثرات ہوئے ہوں گے۔ اِسی دوران حج بھی کیا۔ بغداد اور غالباً دمشق میں بھی تعلیم حاصل کی۔ وہیں سے اِس نے غزالی کے خیالات کا اثر لیا۔[62]

تحصیل علم اور سیر وسیاحت کے دوران ہی اِس کے خیالات میں انقلاب آیا۔ جس جہاز سے وہ واپس گیا اُس کے ملاحوں اور مسافروں کو اُس نے وعظ ونصیحت شروع کی اور انہوں نے تلاوتِ قرآن اور پابندی نماز کو اپنا شعار بنا لیا۔ اُس نے اپنا یہ سلسلہ طرابلس اور المہدیہ میں بھی جاری رکھا۔ المہدیہ میں سلطان یحییٰ بن تمیم بادشاہ وقت نے جب اسے اپنے عقیدے کے حق میں دلائل دیتے ہوئے سُنا تو اُس سے بہت عزت وتعظیم سے پیش آیا۔ لیکن آخر میں اپنے متشددانہ رویہ کی بنا پر اسے وہاں سے نکلنا پڑا۔

اس کی ملاقات نزرومہ کے شمال میں تاجرہ کے ایک غریب طالب علم عبدالمومن سے ہوئی۔ جس کی قسمت میں اس کی تحریک کو جاری رکھنے کا کام لکھا تھا۔ ابتدا میں وہاں کے حکمران خاندان کے عقائد کے خلاف تبلیغ شروع کی بعد میں ہر اُس شخص کو کافر کہا جو اُس کے عقائد سے اختلاف کرتا تھا۔

بلکہ وہ نہ صرف کافروں اور مشرکوں کے خلاف جہاد کی ترغیب دیتا تھا بلکہ دوسرے مسلمانوں کے خلاف بھی جو اس کے عقائد کے مخالف تھے۔ آخر میں مہدی کی خصوصیات بیان کر کے اُس نے اپنے آپ کو مہدی بھی تسلیم کروالیا۔ ھرغہ اور معمودہ کے قبائل اس کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ لوگ عربی زبان سے اِس قدر ناآشنا تھے کہ معمودہ کے اجڈ قبیلے کو سورۃ فاتحہ پڑھانے کی غرض سے اُس نے اُن کے لوگوں کے نام اُس سورت کے ایک لفظ یا ایک جملے پر رکھ دیئے۔ چنانچہ پہلے

شخص کا نام 'الحمداللہ' دوسرے کا نام ''رب'' اور تیسرے کا نام ''العالمین'' رکھا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ اپنے نام اس ترتیب سے بتائیں جس ترتیب سے انہیں رکھا ہے۔ اس طرح وہ انہیں یہ سورت یاد کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ ۶۳

ابن تومرت نے ہی مغرب میں امام غزالی کے علم الکلام کو رائج کیا۔ اس کے دستِ راست عبدالمومن نے افریقہ اور اندلس میں الموحدین کے نام سے حکومت قائم کی۔

علامہ اقبال کو ابن تومرت میں دلچسپی مسئلہ اجتہاد کے سلسلے میں ہوئی۔ چنانچہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں مقالہ الاجتہاد فی الاسلام میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ اقبال جدید ترکی میں عربی کی جگہ ترکی زبان کو نافذ کرنے پر بحث کرتے ہوئے ترکی شاعر ضیاء کے اشعار کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

''وہ سرزمین جہاں ترکی میں اذان دی جاتی ہے۔ جہاں نمازی اپنے مذہب کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔ جہاں قرآن پاک کی تلاوت ترکی زبان میں کی جاتی ہے۔ جہاں پر چھوٹا بڑا احکام اللہ سے واقف ہے۔ اے فرزندِ ترکی! وہ ہے تیرا آبائی وطن۔'' ۶۴

یہ مثال دیتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس قسم کی مثال پہلے بھی موجود ہے۔

''اندلس کے مہدی محمد ابن تومرت نے جس کی قومیت بربر تھی۔ جب اقتدار حاصل کیا اور موحدین کی زبردست حکومت قائم کی تو حکم دیا کہ بربر چونکہ ایک ناخواندہ قوم ہیں۔ لہٰذا ان کی خاطر قرآن مجید کا ترجمہ اور تلاوت بھی بربری زبان میں ہی کی جائے۔ اذان بھی بربری زبان میں ہی ہو۔ حتی کہ علماء وفقہا بھی اس کی تحصیل کریں۔ ۶۵

اِسی خطبے میں ایک جگہ محمد بن عبدالوہاب جس نے مذہبی اصلاحی تحریک سعودی عرب میں شروع کی تھی اس کا اور ابن تومرت دونوں میں مطابقت کرتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں۔

''بدعات کے مصلح اعظم محمد بن عبدالوہاب کا سال ولادت ۱۷۰۰ء ہے۔ انہوں نے مدینہ منورہ میں تعلیم پائی۔ ایران کا سفر کیا اور آخرالامر اُس آگ کو جو اُن کی بے چین روح میں دبی ہوئی تھی سارے عالمِ اسلام میں پھیلا دیا۔ اُن کی طبیعت اور خیالات کا رنگ بھی وہی تھا جو امام غزالی کے شاگرد محمد ابن تومرت یعنی بدعات کے اُس بربر مصلح کا جن کا ظہور اسلامی اندلس کے عہد زوال میں ہوا اور جن کی بدولت اس میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔'' ۶۶

علامہ اقبالؒ نے ترکی شاعر کے اجتہاد کو تو بڑا قابل اعتراض قرار دیا ہے۔ لیکن محمد ابن

تومرت کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔ لیکن علامہ اقبال کے نزدیک ''وہابیت کا داخلی طور پر مزاج بھی قدامت پسند تھا۔ اس نے مذاہب اربعہ کی قطعیت سے انکار تو نہیں کیا اور اس لیے آزادیِ اجتہاد کے حق میں بھی بڑے شدومد سے زور دیا۔'' ۶۷

یہی صورتحال ابن تومرت کی ہے۔ اُس کی ذاتی زندگی میں بھی مذہبی تشدد پسندی تھی اور جب اندلس پر موحدین کی حکومت قائم ہوئی تو بہت سے یہودی اور عیسائی ملک سے بھاگ گئے۔ ۶۸۔

جاوید نامہ میں فلک زہرہ میں یہ شعر

خاکِ بطحا خالد دیگر بزائے
نسخۂ توحید را دیگر سرائے

جو قلمی نسخہ میں پہلے اس طرح تھا

خاکِ بربر ، ابن تومرت بزائے
نسخہ توحید را دیگر سرائے ۶۹

☆☆☆

ابوالفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض

ابوالفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض (المعروف بہ قاضی عیاض) عالم المغرب اور امام اہل حدیث، مالکی فقیہ، محدث، مورخ، ادیب اور شاعر تھے۔ جو ۴۷۶ھ (۱۰۸۳ء) کو سبتہ میں پیدا ہوئے اور وفات ۵۴۴ھ میں ہوئی۔

اپنے وطن میں قاضی ابوعبداللہ بن عیسیٰ اور ابواسحاق بن فاسی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد قرطبہ چلے گئے۔ وہاں ابومحمد عبداللہ بن عتاب ابوولید ابن رشد، ابن الحاج، ابوالحسن بن سراج اور ابن السید بطلوسی کے درسوں میں شریک ہوتے رہے۔ اس کے بعد تعلیم حاصل کرنے کے لیے مشرق چلے گئے ۱۱۳۶ء میں غرناطہ کے قاضی بنائے گئے۔ الموحدون کے حامی تھے۔ حدیث میں وہ امام وقت تھے۔ اس کے علاوہ فن تفسیر، فقہ ادب، نحو، انساب اور دیگر علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ عربی کے بلند پایہ شاعر اور خطیب بھی تھے۔ عشق رسول میں سرشار تھے۔ سنت کی سختی سے پیروی کرتے آپ کا ہر عمل ہر حرکت اور سکون سنت کے ڈھانچے میں ڈھلا ہوتا۔ ۶۸

انہوں نے بیس کتابیں لکھیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

(۱) الشفا بتعریف حقوق المصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم
(۲) مشارک الانوار
(۳) ترتیب المدارک وتقریب المسالک
(۴) عقیدہ
(۵) کمال العلم فی شرح صحیح المسلم
(۶) الاعلام لحدود قواعد الاسلام
(۷) کتاب اجوبۃ القرطبین
(۸) خطبات
(۹) سر السرۃ فی ادب القضاۃ
(۱۰) کتاب العیون السنہ فی اخبار

ان کی کتاب الشفاء بڑی معرکۃ الارا تصنیف ہے۔ اس کا اردو ترجمہ دو اصحاب نے کیا ہے جن میں سے ایک کا نام مولوی حافظ احمد بھی ہے۔ جس نے ۱۹۱۴ء میں ترجمہ کیا تھا۔ اور

دوسرے سید محمد متین ہاشمی ہے۔

علامہ اقبال کی نظم و نثر میں بہت سے مسلمان فلسفیوں، مفکروں اور عالموں کے ارشادات عالیہ کے اقتباسات یا اُن کے افکار کی طرف ہلکے ہلکے اشارے ملتے ہیں خاص طور پر فلسفہ اور کلام میں۔

علامہ اقبال نے یورپ میں جب اپنا مقالہ فلسفہ ایران کے موضوع پر لکھا تو اس میں ایک جگہ قاضی عیاض کا حوالہ بھی آیا ہے۔ جس میں اشاعرہ کے متعلق عام مسلمانوں اور سخت گیر عقیدہ رکھنے والے مسلمانوں کا ہمنوا قاضی عیاض کو بتایا ہے علامہ اقبال کہتے ہیں۔

''اشاعرہ کے بارے میں اس قسم کا طرز عمل خصوصاً جب مفاہیم کو فلسفیانہ زبان میں بیان کرتے ہیں تو اُن کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔ ابن جوزی، قاضی عیاض اور ان کے دیگر مشہور مشدد دینی رہنما (امام غزالی) کی برسر عام تخیص کرتے ہیں اور انہیں گمراہ قرار دیتے ہیں۔ قاضی عیاض تو یہاں تک مخالف ہوئے کہ اُس نے اندلس میں اُن کے فلسفہ وکلام کی تمام کتب تلف کرنے کا حکم دے دیا۔'' ۶۹

علامہ اقبال نے قاضی عیاض کی کتاب کتاب العیون السنہ فی اخبار ستہ کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ نامکمل کتاب تصوف کی تاریخ کے اشارات میں سمن والی حدیث درج کر کے اس کے آگے قاضی عیاض لکھا ہے۔ ۷۰

☆☆☆

ابنِ بدروں

عبدالمالک بن عبداللہ جو ابن بدروں کے نام سے مشہور تھا بارھویں صدی عیسوی میں اشبیلیہ کا نامور ادیب، عالم اور انشا پرداز تھا۔ شلب میں پیدا ہوا۔ اس کی زندگی کے حالات زیادہ نہیں ملتے ۶۰۸ھ میں فوت ہوا۔[۷۱]

علامہ اقبال نے مرثیہ صقلیہ میں مختلف اسلامی شہروں کے زوال کے متعلق جن مرثیہ نگاروں کا نام لیا ہے اُن میں ابن بدروں بھی ہے پورا بند یہ ہے!

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر
آسمان نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا چُن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا [۷۲]

یہاں اقبال کو مغالطہ ہوا ہے۔ اصل شاعر ابن عبدون ہے جس کا اصل نام ابو محمد عبدالمجید بن عبداللہ ابن عبدون الفہری ہے جو ۵۲۹ھ میں فوت ہوا۔ اموی حکومت کے زوال کے بعد اندلس میں جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہوگئی تھیں ان میں ایک بطلیوس کی ریاست بھی تھی۔ اس پر بنو افطس کی حکمرانی تھی۔ اس خاندان کا بانی ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ المظفر تھا جو ابن الافطس کے نام سے مشہور تھا۔[۷۳] یہ ایک نامور ادیب، جید عالم، مفکر اور مورخ تھا۔ اس نے سو جلدوں پر مشتمل ایک تاریخ مرتب کی تھی جو التاریخ المظفری کہلاتی تھی۔ اس کے دربار سے وابستہ ابن عبدون بھی تھا۔ مرابطین نے جب اِس خاندان کی حکومت چھین کر انہیں قتل کر دیا تو ابن عبدون کو اس کا بہت صدمہ ہوا۔ اس نے اپنا بہت مشہور قصیدہ لکھا جس میں اُس خاندان کی تعریف تھی اس لیے اپنے اس قصیدے کو "بسامتہ الدھر" (زمانے کی بہت بڑی مسکراہٹ) کا نام دیا۔

یہ قصیدہ لفظی اور معنوی لحاظ سے بہت مشکل تھا۔ اور عام لوگوں کی سمجھ میں اس کی تشبیہیں اور استعارے نہیں آتے تھے۔ اس لیے ابن بدروں نے اس کی شرح لکھی تو شرح اور قصیدہ دونوں کو "شہرت عام اور بقائے دوام" حاصل ہوگئی۔[۷۴] ابن بدروں نے اِس قصیدے کی تاریخی تلمیحات کی شرح کی ہے۔ اس تاریخی شرح اور قصیدے کو ۱۸۴۶ء میں رائن ہارٹ ڈوزی

نے لندن سے شائع کیا۔[۷۵] (۷۶)

علامہ اقبال جب لندن گئے تو وہاں انہیں ابن عبدون کا قصیدہ اور ابن بدروں کی شرح کے مطالعے کا موقع ملا ہوگا۔ اس قصیدے میں اگرچہ بنی افطس کے زوال کا حال ہے۔ لیکن علامہ اقبالؒ کے ذہن میں شاعر کا نام ابن بدروں اور سلطنت غرناطہ رہ گیا ہوگا۔ اس لیے مرثیہ صقلیہ میں انہوں نے غرناطہ کی بربادی پر ابن بدروں کا نام لیا ہے۔

☆☆☆

ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ الغرناطی (شاطبی)

چودھویں صدی عیسوی میں غرناطہ کے مشہور عالم دین، حافظ اور فقیہ تھے۔ عقیدہ مالکی مسلک تھا۔ زیادہ عرصہ غرناطہ میں گزرا۔ اِس وقت سلطان محمد الغنی باللہ کا دور تھا۔ جو غرناطہ کی تاریخ کا سنہری زمانہ ہے۔ ابن الفخار ابیری اور ابو القاسم شریف سے درس لیا۔ ابن خلدون کے ہم عصر تھے۔ ۸ شعبان ۷۹۰ھ کو غرناطہ میں ہی وفات پائی۔

شاطبی شاعر بھی تھے۔ جب مذہبی مسائل میں اجتہاد کی بنا پر مختلف آزمائشوں سے گزرنا پڑا تو اسی مناسبت سے یہ اشعار کہے۔

''اے قوم! تو نے مجھے امتحان میں ڈالا اور امتحان بڑے بڑوں کو ہلا دیتے ہیں۔ تو نے اِسے ایسے گرداب میں مبتلا کیا جس میں وہ بُری طرح جکڑا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اِس کا نام ونشان تک مٹ جائیگا۔ تو نے مجھے اس لیے مصائب کا نشانہ بنایا کہ میں مفاسد کو دور کرنا چاہتا تھا۔ اور مصالح کو عام کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال خدا ہر حال میں میرے لیے کافی تھا۔ اُس نے میرے فکر کی بھی حفاظت کی اور میرے دین کی بھی۔ ۷۸

شاطبی نے بدعات کے خلاف جہاد کیا اور فتاوہ کے سلسلے مین اپنے تجربے سے بھی کام لیا۔ اُن کا کہنا تھا ہر تبدیلی اور ہر چیز کو بدعت نہیں کہہ سکتے۔ اُن کی تالیفات یہ ہیں۔ الموافقات، الاعتصام، شرح علی الخلاصہ فی النحو ا۔ الانفاق فی علم الاشتاق، اصول نحو۔ کتاب المجالس، الافادات والانشادات۔

علامہ اقبال ''الاجتہاد فی الاسلام'' پر بحث کرتے ہوئے استفہامیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''اسلام کی ہیئت ترکیبی میں وہ کون سا عنصر ہے جو اس کے اندر حرکت اور تغیر قائم رکھتا ہے؟ اِس کا جواب ہے اجتہاد'' ۷۹۔ لیکن علامہ اقبال کو اس عنصر کے جامد ہونے پر حیرت اور تعجب ہے وہ کہتے ہیں۔

''پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ روش اِس نظام قانون نے اختیار کی جس کی بنیادیں قرآن مجید پر استوار ہوئیں جو زندگی کو متحرک اور متغیر قرار دیتا ہے تو اور بھی تعجب ہوتا ہے۔'' ۸۰ اس سلسلے میں بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال ترکی شاعر ضیا گوپ ارسلان کا حوالہ دیتے ہیں کہ اس نے مساوات مرد وزن یعنی طلاق، خلع، اور وراثت میں جو مطالبہ کیا ہے از روئے فقہ اسلامی پورا

بھی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ (۸۱) اور کیا ترکی میں عورتوں کی بیداری سے واقعی ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ اسلام کے بنیادی ماخذ کی از سر نو تعمیر کی جائے۔

اِس کے بعد علامہ اقبال پنجاب کی عورتوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ پنجاب میں بعض واقعات ایسے پیش آ چکے ہیں کہ انہوں نے ارتداد کا راستہ اختیار کیا اور پھر افسوس کرتے ہیں کہ اِسلام جیسے تبلیغی مذہب میں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ مشہور اندلسی فقیہ امام شاطبی نے بھی ''الموافقات'' میں لکھا ہے کہ شریعت اسلامیہ کو پانچ چیزوں کی حفاظت منظور ہے۔ دین، نفس، عقل، مال اور نسل کی۔ ۸۲

علامہ اقبال پھر استفہامیہ انداز میں پوچھتے ہیں۔ ''کیا ہندوستان میں ایسا ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اِس وقت ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ نیز آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان چونکہ قدامت پسند ہیں اس لیے یہاں کی عدالتیں فقہ اسلامی کی مستند کتابوں سے سرِ مو انحراف نہیں کرتیں۔ اور جسکا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ لوگ تو بدل رہے ہیں لیکن قانون جہاں تھا وہیں کھڑا ہے۔'' ۸۳

شاطبی کے نزدیک تمام شرائع اور شریعت اسلامیہ کے تمام اصول و ماخذ کا مقصد انہی مصالح کی حفاظت ہے۔ ان کی حفاظت کا ابدی اصول ہے اور اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ شاطبی نے مزید لکھا ہے کہ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی حفاظت قوم کو مطلوب ہے۔ ۸۴

☆☆☆

ابنِ رشد

قاضی ابوالولید محمد بن احمد بن محمد ابن رشد اندلس کا سب سے بڑا عرب فلسفی ۵۲۰ھ ۱۱۲۶ء کو قرطبہ میں پیدا ہوا۔ اندلس میں ابن رشد کا خاندان علم و فضل کے لحاظ سے جلیل القدر حیثیت کا مالک تھا۔ ابنِ رشد کا ہم نام دادا جو قرطبہ کا قاضی بھی تھا[85]۔ جس کے فتوؤں کا ذخیرہ پیرس کے شاہی کتب خانے میں موجود ہے ان میں ابنِ رشد کے خیالات کے ماخذ بھی نظر آتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی بعد میں ابوبکر بن العربی جو امام غزالی کے شاگرد تھے۔ ان سے علم فقہ کی تعلیم حاصل کی قرطبہ ہی میں قانون اور طب سیکھی۔ وہ ایک طبیب فقیہ اور فلسفی تھا۔ قاضی کی حیثیت سے کئی شہروں میں خدمات انجام دیں۔ اس نے طب، فلسفہ اور علم الکلام پر بہت سے کتابیں لکھیں۔ ۷۲ برس کی عمر میں اندلس سے لیکر مراکش تک تمام علاقوں کا قاضی القضاۃ مقرر ہوا۔ اسکوریال کے کتب خانے میں اس کی کتابوں کی فہرست موجود ہے۔ فلسفہ، علم الکلام اور مذہب پر اس کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔

(۱) تہافتہ النہافتہ (امام غزالی کی کتاب تہافتہ الفلاسفہ کی تردید ہے)
(۲) جوہر الکون (۳) اتصال العقل بالانسان
(۴) مسائل بر حصص مختلفہ قانون ارسطو (۵) رسالہ بر قیاس شوطی
(۶) مکتوبات بر محمولات اوّلیہ (۷) مختصر منطق
(۸) کتاب المقدمات فی الفلسفہ (۹) شرح جمہوریت افلاطون
(۱۰) جوامع کتب ارسطو فی الطبیعات والٰہیات (ارسطو نے طبعیات اور الٰہیات میں جو جو کتب لکھیں ان سب کا مجموعہ ہے۔)
(۱۱) تلخیص کتاب الاخلاق ارسطو
(۱۲) شرح کتاب النفس ارسطو۔ (ارسطو نے روح پر جو کتاب لکھی ہے اس کی شرح ہے۔)
(۱۳) فصل المقال فی مابین الشریعۃ والحکمۃ من الاتصال (شریعت اور فلسفہ میں جو تعلق ہے اس کو بیان کیا گیا ہے۔)
(۱۴) مناہج کشف الدولہ (۱۵) شرح عقیدہ امام مہدی

اس کے علاوہ اس نے فقہ، علم ہیئت، صرف نحو اور علم طب پر بھی بہت سی کتابیں لکھیں۔

ابنِ رشد امیر یوسف کے دربار سے وابستہ تھا۔ یہ سلطنت مذہبی بنیاد پر قائم ہوئی تھی اور عیسائیوں کے مقابلے کے لیے مذہبی جوش و خروش کو برقرار رکھنا ضروری تھا۔ اس لئے سارے ملک پر علماء و فقہا کا اثر تھا۔ لیکن ابنِ رشد نے فلسفہ پر توجہ کی اور ارسطو کو اپنا راہنما بنایا۔ اسکی تصانیف کی تہذیب و ترتیب کی اور اُن کی شرحیں لکھیں۔ اور بہت سے ایسے مسائل جو مسلمانوں کے نظریات کے خلاف تھے اُن کی حمایت کی مثلاً۔ افلاک قدیم اور ازلی ہیں۔ خدا نے ان کو پیدا نہیں کیا بلکہ خدا صرف انکی حرکت کا خالق ہے۔ اس کے علاوہ ابن رشد نے امام غزالی کے خلاف لکھا اور امام غزالی اس سلطنت کے بانی ابن تومرت کے استاد تھے۔ اِن سب عوامل نے ابن رشد کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا۔ امیر منصور نے ابنِ رشد کو ایک مجرم کی حیثیت سے قرطبہ کی جامع مسجد میں بلایا اور علماء نے اسے ملحد اور بے دین قرار دیا جس کے بعد اسے ایک یہودی بستی لوسینا میں بھیج دیا گیا اس سلسلہ میں جو شاہی فرمان صادر ہوا اس کے ایک حصے کا ترجمہ یہ ہے۔

"زمانہ قدیم میں کچھ لوگ ایسے تھے جو وہم کے پیرو تھے۔ تاہم عوام ان کے کمالِ عقل کے گرویدہ ہو گئے ان لوگوں نے اپنے خیال کے موافق کتابیں تصنیف کیں جو شریعت سے اس قدر دور تھیں جس قدر مشرق سے مغرب دور ہے۔ ہمارے زمانہ میں بعض لوگوں نے ان ہی ملاحدہ کی پیروی کی اور انہی کے مذاق پر کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں بظاہر قرآن مجید کی آیتوں سے آراستہ ہیں لیکن تہہ میں الحاد اور زندقہ ہے۔ جب ہم کو ان حالات کی خبر ہوئی تو ہم نے انکو دربار سے نکال دیا اور حکم دیا کہ اُن کی تصانیف جہاں ہاتھ آئیں جلا دیں۔"[86]

ابنِ رشد کی گرفتاری اور ذلت پر عوام میں خوشیاں منائی گئیں اور شعرا نے اشعار کہے جن میں سے چند یہ ہیں۔

لم تلزم الرشید یابن رش
لِما علا فی الزمان جدك
وکنت فی الدین ذا ریاه
ما کان هکذا جدك
الان قد ابعن ابنِ رشد
ان تو الیة تو الف
نقذ القضاء باخذ کل مموه

متفلسف فی دینہ متزندق
بالمنطق اشتغلو افقیل حقیقۃ
ان البلاء موکل بالمنطق

"اے ابنِ رشد! جب تیری کوششیں اس صدی میں اس قدر بلند پروازی حاصل کرنے لگیں تو رشد و ہدایت کی راہ پر قائم نہیں رہا۔ تو نے مذہب سے وفا نہ کی تیرے دادا کا طریق عمل یہ نہ تھا۔

اب ابن رشد کو یقین ہو گیا کہ اس کی تصانیف کیسی مضر شے ہیں۔ اے وہ شخص جس نے خود اپنے آپ کو بے عزت کیا ذرا سوچ تو سہی کہ اب کوئی ایک شخص بھی ایسا ہے جو تیرا دوست بننا پسند کرتا ہے۔

تقدیر نے ان تمام مکذبین مذہب کو جو فلسفہ کو مذہب سے ملاتے رہتے ہیں الحاد کی تعلیم دیتے ہیں نیچے گرا دیا وہ منطق میں مشغول ہوئے اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ منطق ہی تمام مصیبتوں کی جڑ ہے۔ ۸۷

تغلسفوا وادعوا مللوما
صاحبھا فی المعاد یشقیٰ
واحتقر والشرء وازدروہ
سفاھۃ منھم وحمقا ۸۸

ابنِ رشد کو تھوڑے عرصے کے لیے دوبارہ اپنے علم و فضل اور فلسفہ کی بدولت عزت ملی لیکن یہ کچھ ہی مہینے تھے۔ ۵۹۵ھ، ۱۱۹۸ء کو اس جہان فانی سے عالمِ جاودانی کو رخصت ہوا۔

ابنِ رشد کو مسلمانوں میں زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی لیکن یہودیوں اور عیسائیوں میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور اسے نہایت ہی قدر و رفعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی شہرت کا انحصار زیادہ تر ناقدانہ تجزیے اور شرح نویسی کے فطری ملکے پر ہے۔ جو اسے حاصل تھا۔ یورپ میں اس کے حامی اور مخالف دونوں تھے۔ چودھویں صدی عیسوی میں یورپ کا زیادہ تر حصہ ابنِ رشد کا پیرو بن گیا۔ فرانس کے بادشاہ نے ۱۴۷۳ء میں جب تعلیمی اصطلاحات شروع کیں تو پروفیسروں کو حکم دیا کہ ارسطو کی تصنیفات پر ابنِ رشد کی شرحیں نصاب میں داخل کی جائیں۔ یورپ میں ابنِ رشد کے فلسفہ کا سب سے بڑا مرکز اٹلی کے شہر پیڈوا کی یونیورسٹی تھا۔

کولمبس نے ہیٹی سے اکتوبر ۱۴۹۸ء کو ایک خط لکھا۔ جو پیراڈیل نے نقل کیا ہے۔ "ابنِ رشد ان مصنفین میں سے ہے جس کی تصنیفات پڑھ کر اسی نئی دنیا (امریکہ) کے وجود کا خیال پیدا ہوا" ۸۹

ابنِ رشد کی یہ عبارت دیکھئے:

"تمام عالم مدور ہے اور مدور شے مکمل ہوا کرتی ہے۔ پس تمام عالم مکمل ہے۔ ہر مکمل شے کے لیے حرکت ضروری ہے۔ لیکن بعض اجزاء جب اس تکمیل کو دیکھتے ہیں۔ جو ان میں نہیں ہے تو ان تکمیلات کی حاجت محسوس کر کے اپنے آپ کو حرکت میں ڈالتے ہیں۔ تاکہ وہ تکمیلات جو ان میں نہیں ہیں حاصل ہو جائیں۔ پس ہمارے لیے سکون میں ہی امان ہے۔ مگر عالم کا خاتمہ بھی اس کے اجزاء کی حرکت کے ذریعے ہوگا۔ یہ بھی ابنِ رشد کا قول ہے۔" ۹۰

یہودیوں میں تو ابنِ رشد کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ انہوں نے اسی کے فلسفہ سے اخذ و استفادہ کیا اور اسے یورپ میں پھیلانے کا سہرا بھی زیادہ تر ان کے سر ہے۔ علامہ مقری تاریخ نفح الطیب میں ابنِ رشد کو فلسفہ کا امام بتاتے ہیں۔ ۹۱

ابنِ رشد دبی زبان میں یونان کی علم و حکمت کے لحاظ سے تعریف کرتا ہے۔ لیکن اندلس کو ان پر فوقیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک عمدہ آب و ہوا کے لحاظ سے قرطبہ دنیا کا سب سے اعلیٰ شہر ہے۔ ۹۲۔ ابنِ رشد کے ابن عربی سے بھی تعلقات تھے۔ ابنِ رشد نے تصوف کے اسرار سیکھنے کی خواہش ظاہر کی لیکن ابن عربی نے اپنے علوم بتانے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ ابنِ رشد اس وقت قرطبہ کا قاضی تھا۔ ۹۳

اقبال ابنِ رشد کو بہت بڑا فلسفی مانتے ہیں۔ لیکن اس کے افکار و خیالات سے متفق نہیں۔ اس کے برعکس امام غزالی سے اقبال زیادہ متاثر ہیں۔ اور اس کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ امام غزالی اور ابنِ رشد ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ اور بعض اساسی مسائل میں متضاد نظریات کے علم بردار ہیں۔ ابنِ رشد نے یونانی حکماء کی پیروی کی ہے جس کی بنا پر اقبال نے جا بجا اس پر نکتہ چینی کی ہے مثلاً حکماء ادراک بالحواس کے قائل ہیں۔ لیکن اقبال اس کے مخالف کیونکہ ادراک بالحواس کی بنا پر ہم صرف ایک رائے قائم کر سکتے ہیں۔ کوئی مستقل اصول وضع نہیں کر سکتے۔ اس بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں: "قرآن پاک کی روح اساساً یونانیت کے منافی ہے۔ اس انکشاف نے ان کے اندر جو ذہنی بغاوت پیدا کر دی تھی اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ

آج تک نہیں کیا گیا۔ بہرحال یہ کچھ اس بغاوت اور کچھ امام غزالی کے ذاتی خیالات کا تقاضا تھا کہ امام موصوف نے مذہب کی بنا فلسفیانہ تشکک پر رکھی۔ حالانکہ یہ مذہب کی کوئی محکم اساس ہے نہ تعلیمات قرآنی کے مطابق۔ آگے چل کر غزالی کے حریف اعظم ابنِ رشد نے جو گویا باغیوں کے خلاف حکمتِ یونان کی حمایت میں سینہ سپر تھا ارسطو کی پیروی میں بقائے عقل فعال کا عقیدہ وضع کیا جس کا ایک زمانے میں فرانس اور اٹلی کے ذہنی حلقوں پر بڑا اثر تھا۔ لیکن جو میری رائے میں اس تصور کے سراسر خلاف ہے جو قرآن پاک نے نفس انسانی کی قدر و قیمت اور مقصود و منتہا کے بارے میں قائم کیا۔ یوں ابنِ رشد اسلام کے ایک نہایت اہم اور پُر معنی تصور کے فہم سے قاصر رہا۔ اور نادانستہ ایک ایسے فرسودہ اور سست رگ فلسفہ حیات کے نشو و نما کا باعث بنا جس سے انسان کو نہ تو اپنی ذات میں کوئی بصیرت حاصل ہوتی ہے نہ خالق کائنات اور کائنات میں۔''۹۴

ابنِ رشد کے بارے میں اقبال کہتے ہیں۔

''ابن رشد ارسطو کا شاگرد ہے۔ وہ ارسطو سے خوب واقف تھا۔ لیکن اس کی شخصیت عظمت سے خالی ہے۔ غزالی کی شخصیت اس کے مقابلے میں بڑی عظیم ہے۔ دراصل ابنِ رشد کی عظمت کا راز ہے اس کی طبی اور فقہی حیثیت، فلسفہ میں ارسطو نے اسے ابھرنے نہیں دیا۔ گو یورپ اس سے متاثر ہوا پاڈوا ابنِ رشد کی تعلیم کا خاص مرکز تھا۔''۹۵

فلسفہ کے موضوع پر علامہ اقبال کی پہلی کتاب ابنِ رشد کے متعلق یوں اظہار خیال کرتی ہے۔

''اگرچہ اندلسی فلسفی ابنِ رشد اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں ارسطو سے زیادہ قریب ہے۔ تاہم ارسطو کے فلسفہ پر اس کو بھی کامل دسترس نہیں ہے۔''۹۶

ابنِ رشد اور علامہ اقبال کا ایک اور مسئلہ حیات بعد الموت کے متعلق نقطہ نظر میں اختلاف و اتفاق بھی ہے۔ ابنِ رشد کو حشر اجساد سے انکار ہے۔ اس کے نزدیک ہمارا جو جسم عالمِ عاقبت میں ہوگا وہ جسم نہیں ہوگا جو اس دنیا میں ہے کیونکہ جو شے فنا ہوگئی پھر جوں کی توں پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ زیادہ سے زیادہ کسی اور مماثل صورت میں دوبارہ ظہور کر سکتی ہے۔ ہماری آئندہ زندگی حیاتِ ارضی کی نسبت کہیں زیادہ برتر قسم کی ہوگی۔ لہٰذا اس حیات کے مقابلے میں وہاں کے اجسام بھی زیادہ مکمل اور کامل ہوں گے۔

اقبالؒ اس سلسلے میں کہتے ہیں، جن اشخاص کی خودیاں مضبوط و توانا ہوں گی وہی بقائے

دوام کے حق دار ہوں گے۔ اور کمزور خودیاں جسم کی موت کے ساتھ فنا ہو جائیں گی۔

بانگِ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مر کے جی اُٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد ۹۷

اس موضوع پر خلیفہ عبدالحکیم اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

بقائے روح کی نسبت علامہ اقبال کا خیال تھا کہ یہ بقائے غیر مشروط نہیں جسمانی موت کے بعد روح کا باقی رہنا یا نہ رہنا اس کا کسی مخصوص حالت میں رہنا انسان کی خودی پر موقوف ہے۔ اگر کسی شخص نے صحیح علم و عمل سے اپنی خودی کو استوار نہیں کیا تو اس کا امکان ہے کہ وہ فنا ہو جائے اور اگر اچھی زندگی سے اس نے اپنی روح کو قوی بنا لیا ہے تو وہ باقی رہے گی۔۹۸

اقبال کا معاد اور بحث بعد الموت کے بارے میں یہ خیال ہے۔

''دراصل بحث بعد الموت کوئی خارجی حادثہ نہیں یہ خودی کے اندر ایک حیاتی عمل کی تکمیل ہے۔ اور جسے انفرادی یا اجتماعی جس لحاظ سے دیکھئے دونوں صورتوں میں محاسبہ ذات کی وہ ساعت ہے جس میں خودی اپنے گذشتہ اعمال کا جائزہ لیتی اور مستقبل میں اپنے ممکنات کا اندازہ کرتی ہے۔''۹۹

حیات بعد ممات کے عقیدے سے وابستہ جنت اور دوزخ کا تصور ہے۔ اقبال اس کو بھی عام اسلامی تصور سے ایک نئے رنگ میں دیکھتے ہیں۔

''بہشت کا مطلب ہے فنا اور ہلاکت کی قوتوں پر غلبے اور کامرانی کی مسرت جہنم بھی ہادیہ نہیں ہے۔ جسے کسی منتقم خدا نے اس لئے تیار کیا ہے کہ گناہ گار ہمیشہ اس میں گرفتارِ عذاب رہیں۔ وہ درحقیقت تادیب کا ایک عمل ہے تاکہ جو خودی پتھر کی طرح سخت ہوگئی ہے پھر سے رحمت خداوندی کی نسیم جانفزا کا اثر قبول کر سکے۔ لہٰذا جنت میں لطف و عیش یا آرام و تعطل کی کوئی حالت نہیں زندگی ایک ہے اور مسلسل اور اس لیے انسان بھی اس ذاتِ لامتناہی کی نو بہ نو تجلیات کے لیے جس کی ہر لحظہ ایک نئی شان ہے ہمیشہ آگے ہی آگے بڑھتا رہے گا۔'' ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''دوزخ اور جنت بھی زندگی کے Phenomena ہیں اور ان کے Character تعین اسی مرحلے پر منحصر ہے۔ جو زندہ شے نے حاصل کیا۔ اسی زندہ شے کے لیے دوزخ اور جنت

ہے یہاں تک کہ پودوں اور حیوانوں کے لیے بھی مگر اس دوزخ اور جنت کے Character کی تعین اسی مرحلے پر منحصر ہے۔ جو زندہ شے نے حاصل کیا۔ اس زندہ شے کے لیے دوزخ اور جنت ہے یہاں تک کہ پودوں اور حیوانوں کے لیے بھی مگر اس دوزخ اور جنت کے Character کی تعین Animal Life اور Plant Life کے اسٹیج پر منحصر ہے۔"۱۰۱

علامہ اقبال بھی حشر اجساد سے متعلق کوئی واضح رائے نہیں رکھتے اور اس سلسلے میں ان میں اور ابنِ رشد میں مماثلت ہے۔ علامہ اقبال خطبات ہی میں کہتے ہیں "بہر حال فلاسفہ اسلام اور علمائے الٰہیات کی درمیان جو مسئلہ مختلف فیہہ ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی بعثت ثانیہ پر کیا اس کا جسم بھی پھر سے زندہ ہو جائے گا۔ اس میں زیادہ تر کا خیال یہ ہے اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی رائے بھی جن کی ذات پر گویا الٰہیاتِ اسلامیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ یہی تھی کہ حیات بعد الموت پر ایسا کوئی مادی پیکر ناگزیر ہے جو خودی کے نئے ماحول میں اس کے مناسب حال ہو۔۔۔ کیونکہ اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ انسان کا اجساد کسی نہ کسی جسد عنوی سے وابستہ ہے خود اس جسد عنصری کی حقیقت کچھ بھی ہو اور سر دست ہم اسے سمجھ بھی نہ سکیں جب بھی بعثت ثانیہ کے باب میں ہمیں کوئی بصیرت حاصل نہیں ہوتی قرآن مجید نے بھی اس سلسلے میں جن مماثلتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان سے مقصود صرف یہی ظاہر کرتا ہے کہ بعثت ثانیہ ایک حقیقت ہے یہ نہیں کہ اس کی ماہیئت کیا ہے۔"۱۰۲

ابنِ رشد کو اگرچہ حشر اجساد سے انکار ہے لیکن پھر بھی یہی کہتا ہے۔ آئندہ زندگی کا ہونا کتاب اللہ میں ہر شخص پر واضح کر دیا گیا ہے لہٰذا اصولاً حیاتِ اخروی سے انکار کرنا کفر ہوگا۔ لیکن اس زندگی کی نوعیت کیا ہوگی اس معاملہ میں معقولیت سے اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ یعنی کہ ہم اپنے سابقہ جسم میں ہی دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ یا جسم دوسرا ہوگا۔ یا محض روح کی صورت ہی میں زندہ ہوں گے۔۱۰۳

لیکن قرآن میں جسم و روح کی تمیز یا فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا اور آئندہ زندگی میں جزا و سزا پورے جسم کے لیے ہے۔ اور اچھی یا بری زندگی بھی ایک سالم انسان کے لیے۔ ابنِ رشد پر لکھتے ہوئے جورج ہورانی کہتا ہے۔

"محمد اقبال جیسے اہم عالم جنھوں نے قرآن سے جدید علوم کے معارف اخذ کرنے کی کوشش کی ان پر بھی وہی اعتراض ہوگا۔ جیسا ابنِ رشد پر وارد ہوتا ہے۔ چنانچہ سر ہمیلٹن گب نے اپنی کتاب Modern Trends in ISLAM میں فی الواقع ہی نکتہ چینی کی ہے۔"۱۰۴

علامہ اقبال نے ابنِ رشد کے حیات بعد الموت کے متعلق نقطہ نظر پر تنقید کی ہے۔

"لیکن حیات بعد الموت کی حمایت میں صرف مابعد الطبیعی دلائل سے کام نہیں چل سکتا۔ مابعد الطبیعی دلائل سے دِل کی تشفی نہیں ہوتی۔ نہ ہی کہ ان سے ہمارے دِل مین اطمینان اور اعتماد کی کیفیت پیدا ہو۔ اسلامی فلسفہ کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ تو ابنِ رشد نے بھی اس مسئلے کے حل میں مابعد الطبعیات ہی کے راستے سے قدم بڑھایا گو میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس کی یہ کوشش بالکل رائیگاں گئی۔ ابنِ رشد نے اوّل تو حواس اور عقل میں ایک امتیاز قائم کیا اور اس کی بنا شاید قرآن مجید کے الفاظ "نفس" اور "روح" پر رکھی لیکن یہ دونوں اصطلاحیں جن سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے انسان کے اندر دو متضاد اصول کام کر رہے ہیں۔ مفکرینِ اسلام کے لیے اکثر غلط فہمی کا باعث ہوتی رہی ہیں۔ بہر کیف اگر ابنِ رشد کی اس ثنویت کی بنیاد قرآن مجید پر ہے تو اس نے بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ اس لیے قرآن پاک نے لفظ نفس کو جیسا علمائے اسلام کا خیال تھا کسی مخصوص معنی میں استعمال نہیں کیا"۔۱۰۵

آگے مزید لکھتے ہیں۔

"ابن رشد کہتا ہے عقل جسم کی کسی حالت کا نام تو ہے نہیں اس کے معنی جسم سے بالاتر ہے۔ وہ مفرد ہے عالم گیر اور دوامی لہٰذا اس کا تعلق کسی اور ہی رشتہ وجود سے ہے لیکن یہ وہ بات ہے جسے اگر مان بھی لیا جائے تو اس کا مطلب بجز اس کے کیا ہوگا کہ وارداتِ اتحاد میں چونکہ انفرادیت سے کالعدم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا انسانوں کی کثرت میں بطور ایک وحدت اس کا ظہور محض فریب ہے۔"۱۰۶

علامہ اقبال ابنِ رشد کے بارے میں بعد میں اپنی رائے تبدیل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "علمائے اسلام میں ابنِ رشد ہی اس قابل ہے کہ اس کا دوبارہ مطالعہ کیا جائے۔"۱۰۷

☆☆☆

موسیٰ ابنِ میمون

ابوعمران موسیٰ ابنِ میمون ایک بہت بڑا درباری، طبیب، فلسفی اور معلم دین ۱۱۳۵ء میں قرطبہ میں پیدا ہوا۔ مواحدین کے مظالم کے سبب اس کے خاندان کو قاہرہ منتقل ہونا پڑا۔ پہلے یہودی تھا بعد میں مسلمان ہو گیا۔ لیکن یہ امر مختلف فیہ اور تحقیق طلب ہے۔

اُس نے زندگی کا زیادہ حصّہ قاہرہ میں سلطان صلاح الدین ایوبی اور اس کے فرزندوں کے دربار میں گزارا۔ اس کی بہترین طبی تصنیف ''الحکم'' ہے۔ جس میں اُس نے جالینوس کی آراء پر تنقید کی ہے۔ اس کی ایک اور کتاب ''الفصول فی الطب'' بڑی مقبول ہوئی تھی۔ درباری عہدہ دار ہونے کی بنا پر سلطان کے لئے صفائی اور حفظ صحت کے متعلق رسائل لکھے جو بعد کی کئی صدیوں کی اسلامی طبی تصانیف کے نہایت عمدہ نمونے تھے۔ اگرچہ قاہرہ کا دربار نسبتاً آزاد خیالی کی طرف مائل تھا لیکن پھر بھی علمائے دین کے اثر و اقتدار کی یہ کیفیت تھی کہ ابنِ میمون کو اپنے رسائل کے آخر میں ایک طویل علمی معذرت قلمبند کرنا پڑی۔ کیونکہ اُس نے سلطان کی افسردگی طبع کے علاج کے لیے شراب اور موسیقی کے استعمال کا مشورہ دیا تھا۔ ۱۰۸

''دلالۃ الحائرین'' اس کی ایک اور مشہور تصنیف ہے۔ جس میں اُس نے یہودی مذہب اور اسلامی ارسطویت میں توافق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب پیرس سے عربی متن میں ۱۸۵۶۔۶۶ء میں تین جلدوں میں شائع ہوئی۔ اور انگریزی میں لندن سے ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کی تمام کتابیں عربی میں ہیں۔ ایک اور کتاب ''مقالہ فی توحید'' ہے جس میں توحید باری تعالیٰ پر بحث ہے۔ اس کی زیادہ تصانیف طب پر ہیں۔ ایک کتاب سمیات اور اُن کے تریاقوں پر بھی ہے۔

موسیٰ ابن میمون نے ابنِ رشد نے فلسفہ کو لاطینی میں منتقل کرنے میں سب سے زیادہ حصّہ لیا۔ ابن میمون کی تعلیم فارابی اور ابن سینا کی تعلیم کا خلاصہ ہے۔ جسے یہودی شکل دے دی گئی۔

''خدا عقل ہے۔ وجود عاقل ہے اور معروض عقل ہے۔ جو لازمی علت اوّل اور مستقل مبداء ہے۔ اس کی صفات کو اِس طرح استعمال نہیں کیا جا سکتا کہ اُن سے تعدد کا مترشح ہونے لگے۔ اس کی صرف وہ صفات تسلیم کی جا سکتی ہیں۔ جن سے قطعیت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ صفات

قابلِ تسلیم نہیں ہیں جس سے خدا اور مخلوق کے تعلقات مترشح ہوتے ہوں۔'' ۱۰۹

ایک جگہ لکھتا ہے۔ ''ہم خدا کی نسبت یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں ہے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایسا ہے۔'' ۱۱۰

اقبال کو اِس حکیم سے اس لئے دلچسپی پیدا ہو گئی کہ اُس نے مسئلہ زمان پر بحث کی تھی اور کچھ اقوال بھی پیش کئے تھے۔ چنانچہ اقبال ایک خط میں پوچھتے ہیں۔

''شمسِ بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کئے ہیں ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خُدا ہے۔ بخاری شریف میں ایک حدیث بھی اس مضمون کی ہے۔ "لَاتَسُبُّو الدَّھر" کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے اگر ایسا کیا ہے تو یہ بحث کہاں ملے گی؟ قرونِ وسطیٰ کے ایک یہودی حکیم موسیٰ بن میمون نے لکھا ہے کہ خدا کے لیے کوئی مستقبل نہیں ہے۔ بلکہ وہ زمان کو لحظہ بہ لحظہ پیدا کرتا رہتا ہے۔ میمون قرطبہ میں پیدا ہوا اور قاہرہ میں مرا۔ غالباً بارھویں صدی کے آخر میں اُس نے مسلمانوں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی اور تمام عمر مسلمانوں کی ملازمت کرتا رہا۔ متکلمین کے خیالات پر اُس نے جرح قدح بھی خوب کی ہے۔ میرا گمان ہے کہ میمون کا مذکورہ بالا مذہب بھی ضرور کسی نہ کسی مسلمان حکیم کی خوشہ چینی ہے۔ اگر آپ کے علم میں یہ بات ہو تو مہربانی کر کے مطلع فرمائیے۔ ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔ جس کا عنوان یہ ہے۔

''زمان کی حقیقت فلسفۂ اسلام کی تاریخ میں'' ۱۱۱

علامہ اقبال کا خیال درست تھا۔ موسیٰ ابن میمون اپنی کتاب ''موربتوکم'' میں لکھتا ہے۔ میں ابنِ باجہ کا شاگرد ہوں۔ ۱۱۲ ایک اور جگہ نظریہ جواہر کے بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں۔

عالم اسلام میں نظریہ جواہر کا نشوونما فلسفہ اسلامی تاریخ کا ایک بڑا دلچسپ باب ہے جسے گویا ارسطو کے اِس نظریے کے خلاف کہ کائنات ایک ساکن وجود ہے۔ مسلمانوں کی ذہنی بغاوت کا پہلا اہم مظہر تصور کرنا چاہیے۔ مذہب بصرہ کے نظریات اول اول ابو ہاشم نے مرتب کیے اور مذہب بغداد کے ابوبکر باقلانی نے، جو بہ اعتبار اپنی جسارتِ فکر اور صحتِ خیال کے علمائے الٰہیات میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ آگے چل کر یعنی ۱۳ویں صدی کے آغاز میں ایک یہودی عالم موسیٰ ابن موسیٰ نے جس کی تعلیم اندلس کی اسلامی درسگاہوں میں ہوئی تھی۔ اپنی کتاب ''دلیل الحائر'' ۱۱۳ میں اِس نظریے کو ایک باقاعدہ اور جامع شکل دی۔ ۱۸۶۶ء میں منک نے اس کا

ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا اور پھر حال ہی میں امریکی پروفیسر مکڈانلڈ نے اس کے مشمولات کی توضیح آئی سس میں بڑی خوبی سے کی ہے۔ چنانچہ ''مسلم ورلڈ'' کی اشاعت جنوری ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر ذویمر "Zwarmor" نے اس کو پھر سے شائع بھی کر دیا ہے۔ لیکن افسوس ہے پروفیسر مکڈانلڈ نے اِن نفسیاتی عوامل کا اندازہ کرنے کی کوشش نہیں کی جو اسلامی علم الکلام میں نظریہ جواہر کے نشو ونما کا باعث ہوئے۔ انہیں اِس امر کا اعتراف تو ہے کہ یونانی فلسفہ میں اس مخصوص طرز فکر کی کوئی جھلک نہیں ملتی۔ مگر پھر اِس خیال سے کہ ایسا نہ ہو ہمیں اسلام کے جودتِ طبع کا اقرار کرنا پڑے۔ انہوں نے کلام کے اِس نظریے اور ایک بدھ فرقے کے خیالات میں چند سطحی مشابہتیں تلاش کرتے ہوئے فیصلہ صادر فرما دیا کہ مسلمانوں کے یہاں اِس فکر کی نشو ونما بدھ مت کے زیر اثر ہوئی۔[۱۱۴]

اِن احساسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے ابنِ میمون کی تصانیف کا مطالعہ کیا تھا اور اپنے فلسفے کی تشکیل میں اس کے افکار سے مدد لی۔

☆☆☆

ابُو المُعالی

ابوالمعالی سے اقبال کی دلچسپی کا سبب یہ تھا کہ اِس کا نظریہ نور موجودہ زمانے کے ایک زبردست سائنس دان آئن سٹائن کے نظریے سے مماثل ہے۔ اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''روایت باری کے متعلق جو استفسار میں نے آپ سے کیا تھا اِس کا مقصود فلسفیانہ تحقیقات تھی۔ خیال تھا کہ اِس بحث میں کوئی ایسی بات نکل آئے جس سے آئن سٹائن کے انقلاب انگیز نظریہ نور پر کچھ روشنی پڑے۔ اِس خیال کو ابنِ رشد کے ایک رسالے سے تقویت ہوئی جس میں انہوں نے ابوالمعالی کے رسالے سے ایک فقرہ اقتباس کیا ہے۔ ابوالمعالی کا خیال آئن سٹائن سے ملتا جلتا ہے۔ مقدم الذکر کے ہاں یہ بات محض ایک قیاس ہے۔ اور موخر الذکر نے اِس کو علمِ ریاضی کی رو سے ثابت کر دیا ہے۔''[۱۱۵]

اِس حوالے سے جہاں ابوالمعالی کی فکری عظمت کا ثبوت ملتا ہے وہاں یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال نے اندلس کے بہت سے مفکرین، ریاضی دانوں اور فلسفیوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اقبالؒ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''آج کل کے مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ایک بڑی حد تک خود ان کے تمدن سے برآمد ہوا ہے۔ وہ اسے بالکل غیر اسلامی تصور کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی مُسلم حکیم کو یہ معلوم ہو کہ آئن سٹائن کے نظریہ سے کس قدر ملتے جُلتے خیالات پر اسلام کے سائنٹفک حلقوں میں سنجیدگی سے بحث و مباحثے ہوتے تھے۔ (ابوالمعالی جسکا قول ابنِ رشد نے نقل کیا ہے) تو آئن سٹائن کا موجودہ نظریہ اتنا اجنبی معلوم نہ ہو۔ اِس کے علاوہ جدید استقرائی منطق سے اسے جو بیگانگی ہے وہ بہت کچھ کم ہو جائیگی۔''[۱۱۶]

آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کا ذکر آیا تو علامہ اقبال نے ابوالمعالی کا حوالہ دیا اور کہا کہ اس کی تحقیقات آئن سٹائن کی تحقیق سے مشابہ ہیں؛ اور پرانے زمانے میں مسلمان ریاضی دان کائنات کی شکل وصورت کے بارے میں غور وفکر کرتے رہتے تھے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

''آئن سٹائن کا خیال ہے کہ کائنات کی ساخت کم وبیش مدور ہے ہمارے مسلمان ریاضی دان کی تحقیق یہ تھی کہ کائنات کی مخروطی شکل ہے۔''[۱۱۷]

☆☆☆

ابنِ عربی

شیخ محی الدین محمد بن محمد العربی ۱۱۶۵ء (۵۷۰ھ) میں مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات تاریکی میں ہیں۔ ۱۱۷۳ء سے ۱۲۰۲ء تک اشبیلیہ میں تعلیم و تربیت کے مراحل طے کئے۔ حدیث اور فقہ کی تکمیل کے بعد تصوف کا گہرا مطالعہ کیا۔ ۱۲۰۲ء میں مشرق کی سیاحت کو روانہ ہوئے۔ کچھ مدت تک مکہ معظمہ میں قیام کے بعد عراق و شام کا سفر اختیار کیا۔ بالآخر دمشق میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ۱۲۴۰ء (۶۳۷ھ) میں وہیں واصل بحق ہوئے۔ ۱۱۸

مولانا جامی جنہوں نے ان کی کتاب "نقش الصوص" کی شرح لکھی ہے۔ شیخ کی کتب کی تعداد پانچ سو بتاتے ہیں۔ لیکن ابنِ عربی نے خود دو سو اکاون کتب پر مشتمل فہرست لکھی ہے۔ شیخ نے یہ جو عظیم ذخیرہ چھوڑا ہے زیادہ تر تصوف کے موضوع پر ہے۔ اس وسیع و بسیط موضوع کے علاوہ تفسیر، حدیث، سیرت النبی، ادب، علوم طبعی، ہیئت، علوم خفیہ پر بھی تصانیف ہیں جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔

(۱) الاربعون صحیفۃ من الاحادیث القدسیہ
(۲) الامر الحکم المربوط فی ما یلزم اہل الطریق من المشروط
(۳) انشاء الدوائر — (۴) تاج الرسائل و منہاج الوسائل
(۵) روح القدس — (۶) عقلۃ المستوفرہ
(۷) عقیدہ مختصرہ — (۸) عنقائے مغرب
(۹) القول النفیس — (۱۰) کتاب الجلالہ
(۱۱) کتاب ما اتی بہ الوارد — (۱۲) کتاب النقباً
(۱۳) کتاب الیاد ھو کتاب الیہود — (۱۴) مجموعہ رسائل ابن عربی
(۱۵) مراتب الوجود — (۱۶) مواقع النجوم
(۱۷) الفتوحات المکیہ فی معرفۃ الاسرار الملائکہ والمنکر
(سب سے ضخیم اور چار بڑی جلدوں پر مشتمل ہے۔)
(۱۸) نقش الخصوص۔ — (۱۹) تفسیر صغیر
(۲۰) تفسیر کبیر — (۲۱) فصوص الحکم (سب سے آخری کتاب)

ان میں "فتوحات المکیہ" اور "فصوص الحکم" بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ فتوحات پانچ سو ساٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اور صوفیانہ تعلیمات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ فصوص صرف ستائیس ابواب میں تقسیم ہے۔ شیخ کی ایک اور کتاب "الاسراع الیٰ مقام الاھرا" ہے جس میں موصوف نے معراجِ رسولؐ کے واقعہ کو افسانوی رنگ میں بیان کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور اطالوی شاعر دانتے کی "ڈیوائن کامیڈی" کا تخیل اسی تصنیف سے ماخوذ ہے۔ اقبال کے جاوید نامے کی طرز بھی یہی ہے۔

شیخ کو اسلامی تصوف کا شیخ الاکبر بھی کہتے ہیں۔ تصوف کے بارے میں ان کا ایک اچھوتا اندازِ فکر ہے۔ انہوں نے یونانی فلسفیوں سے اپنے نظام فکر کے عناصرِ ترکیبی میں مدد لی ہے۔ شیخ کے افکار و نظریات سے پوری ملتِ اسلامیہ میں اختلاف و افتراق پیدا ہوا ہے۔ اہل تصوف کے نزدیک وہ اپنے زمانے کے قطبِ عالم اور ولیِ کامل تھے۔ جبکہ اہل نظر کے نزدیک زندیق اور بدترین قسم کے ملحد تھے۔ یہ باتیں ان کے زمانے سے ہی شروع ہو گئی تھیں۔ ابنِ تیمیہ، ابنِ قیم، ذہبی، اور شیخ احمد سرہندی نے ابنِ عربی پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور بعض علماء و فقہا کے نزدیک

ومن شکّ فی کفر طائفۃ ابن عربی ھو کافر

اس کے علاوہ

کفر اشد من کفر الیہود و النصاریٰ ۱۱۹

ابن اسدی کا قول ہے

کان ظاھری المذھب فی العبادات باطنی النظر فی الاعتقادات ۱۲۰

شیخ محی الدین ابنِ عربی کے تصوف کا بنیادی اصول وحدت الوجود ہے۔ جس پر ان کے سارے متصوفانہ فلسفے کا دارومدار ہے وہ لکھتے ہیں۔

"بزرگ و برتر ہے وہ ذات جس نے سب اشیاء کو پیدا کیا اور جو خود ان کا جوہر اصلی (اعیانہا) ہے (فتوحات۔۲ : ۴ : ۶)

ان کے اشعار میں بھی یہی تصور ہے۔

یا خالق الاشیاء فی نفسہ انت لما تخلیقہ جامع
تخلق ما لا ینتھی کونہ فیک فانت الفتق الواسع

اے کہ تو نے تمام اشیاء کو اپنی ذات میں خلق کیا، تو جمع کرتا ہے ہر ۱۲۲
اُس چیز کو جسے تو پیدا کرتا ہے، جس کا وجود تری ذات میں (ملا کر)
کبھی فنا نہیں ہوتا اور اسی طرح تو ہی تنگ ہے اور تو ہی وسیع بھی ہے

وحدۃ الوجود کے اثبات میں کہتے ہیں۔

''صفات ذات کی عین میں
کائنات صفات کی تجلی ہے
چونکہ صفات عین ذات ہے
اسی لیے کائنات بھی عینِ ذات ہے'' ۱۲۴

وحدت الوجود کی الٰہیات سے محبت وسیع مشربی کی اخلاقی اقدار سے منسلک ہے۔ اس نظریے کا حامی تمام بنی نوع انسان سے عدم تعصب برتتا ہے۔ ابنِ عربی نے بھی اس اخلاقی تصور کو اس طرح بیان کیا ہے۔

لقد کنت قبل الیوم انکو صاحبنی
اذا لم یکن دینی الی دینہ و انی
وقد صاد قلبی قابلاً کل صورۃ
ضمرعی لغزلان و دیر لیرھبان
دبیت لیزان و کعبۃ فاصدا
والواح نورلۃ و مصحف قرآن
لا ین بدین الحب انی توجھت
راکایبہ فاطب دینی و ایمانی

''آج سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ جس ساتھی کا دین مجھ سے نہ ملتا۔ اس کا انکار کرتا اور اسے اجنبی سمجھتا۔ لیکن اب میرا دل ہر صورت کو قبول کرتا ہے۔ وہ چراگاہ بن گیا ہے غزالوں کی۔ اور دہر راہبوں کے لیے۔ آگ پوجنے والوں کا آتش کدہ، اور حج کا مقصد کرنے والوں کا کعبہ، توریت کی الواح اور قرآن کا صحیفہ، اب مذہب عشق کا پرستار ہوں۔ عشق کا قافلہ جدھر بھی لے جائے میرا دین بھی عشق ہے اور میرا ایمان بھی عشق۔۔۔۔۔۔'' ۱۲۵

ابنِ عربی پہلے مسلمان مفکر ہیں جنہوں نے الکلمۃ اور انسانِ کامل کے بارے میں ایک

مکمل نظریہ پیش کیا۔ ''فصوص الحکم'' اور ''التدبیرات الالٰہیہ'' کا مرکزی موضوع یہی ہے۔ وہ کہتے ہیں ''ہم جنہیں انسانِ کامل شمار کرتے ہیں ان میں تمام انبیاء اولیاء اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شامل ہیں۔ انسانِ کامل وہ آئینہ ہے جس میں تمام انوار الٰہیہ منعکس ہوتے ہیں اور وہ واحد تخلیق ہے جس میں تمام صفاتِ الٰہیہ ظاہر ہوتی ہیں۔ انسانِ کامل خلاصہ کائنات (عالم اصغر) ہے اس زمین پر خدا کا نائب ہے اور وہ واحد ہستی ہے جسے خدا کی صورت میں بنایا گیا ہے۔'' ۱۲۶

شیخ محی الدین ابنِ عربی صوفیاء کے اس طبقے سے تعلق نہیں رکھتے جو مجذوب کہلاتا ہے۔ اور شریعتی احکام کی پروا نہیں کرتا۔ چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

''علم شریعت کو اپنے آپ پر لازم جان، کیونکہ شریعت ہی تمہاری کشتی ہے کہ جب اس میں رخنہ پڑ جائے گا تو یہ ڈوب جائے گی اور ان سب کو لے ڈوبے گی جو اس میں سوار ہیں۔ جان لو! کہ تم سے اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم رکھنے کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔'' ۱۲۷

علامہ اقبال کا تعلق ابنِ عربی سے ابتدائی زمانے سے ہی تھا۔ اس کی وجہ علامہ اقبال کے والد کا صوفیانہ مسلک سے وابستہ ہونا تھا۔ اس لیے ان کے گھر میں تصوف کی کتابوں اور نکات پر بحث ہوتی رہتی تھی۔ خود اقبال کہتے ہیں۔ ''میرے والد کو 'فتوحات' اور 'فصوص' سے کمال توغل رہا ہے اور چار سال کی عمر ہی میں میرے کانوں میں ان کا نام اور ان کی تعلیم پڑنی شروع ہوئی۔ برسوں تک دونوں کتابوں کا درس ہمارے گھر میں رہا۔ گو بچپن کے دنوں میں مجھے ان مسائل کی سمجھ نہ تھی تاہم محفلِ درس میں ہر روز شریک ہوتا بعد میں جب میں نے عربی سیکھی تو کچھ کچھ خود بھی پڑھنے لگا اور جوں جوں علم اور تجربہ بڑھتا گیا، میرا شوق اور واقفیت زیادہ ہوتی گئی۔ ۱۲۸

قیام یورپ کے زمانے میں جب انہوں نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو اُن کی رائے یہ تھی۔

''اسلامی تصوف کے متعلم کو جسے اصولِ وحدت کی ایک جامع و محیط تشریح سے واقف ہونے کی خواہش ہو، اُسے اندلسی ابنِ عربی کی ضخیم مجلدات دیکھنی چاہییں۔ ۱۲۹

لیکن اس کے بعد جلد ہی ان کا ابنِ عربی کے بارے میں نقطہ نظر بدل گیا۔ اور فصوص الحکم جس کو بڑے بڑے شارحین بھی اس کے بعض اجزاء کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہے۔ علامہ اقبال بھی اس کو پہلے پہل نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے علامہ عرشی امرتسری سے اپنے عجز فہم کا اعتراف بھی کیا تھا۔ پھر بھی فصوص کے بارے میں ان کی رائے بڑی سخت تھی۔ ایک خط میں اس

کے متعلق لکھتے ہیں۔

''جہاں تک مجھے علم ہے 'فصوص' میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں اس پر میں انشاءاللہ مفصل لکھوں گا۔'' ۱۳۰

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

''میرا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت شیخ کی تعلیمات، تعلیم قرآن کے مطابق نہیں اور نہ کسی تاویل و تشریح سے اس کے مطابق ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ میں نے شیخ کا مفہوم غلط سمجھا۔ کئی سالوں تک میرا یہی خیال رہا ہے کہ میں غلطی پر ہوں گو اب میں سمجھتا ہوں کہ میں ایک قطعی نتیجہ پر پہنچ گیا ہوں۔ لیکن اس وقت بھی مجھے اپنے خیال کے لیے کوئی ضد نہیں۔'' ۱۳۱

مثنوی اسرار و رموز کے دیباچے میں بھی انہوں نے شیخ اکبر کے نظریات میں سے نظریہ وحدت الوجود پر تنقید کی ہے اور اسے ملت کے زوال کا ایک سبب قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''جس نقطہ خیال سے شری شنکر اچاریہ نے گیتا کی تفسیر کی تھی اسی نقطہ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ انتھک مفسر تھے۔ اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔

''کرمانی اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر تھے۔ اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی عیسوی کے تمام عجمی شعرا اس رنگ میں رنگین ہو گئے۔ مختصر یہ کہ ہندی حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخالف بنایا۔ مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلہ کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انہوں نے دل کو اپنی آماج گاہ بنایا اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا انجام کار یہ ہوا کہ اس مسئلہ نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔'' ۱۳۲

اقبال تصوف کے مخالف نہ تھے۔ بلکہ عقیدہ وحدت الوجود کی غیر اسلامی تعبیروں اور رہبانیت کے خلاف تھے۔ جس کی بنا پر پوری ملت اسلامیہ زوال کا شکار ہوئی۔ اور اس کا سبب وہ اس تصوف کو گردانتے ہیں۔ جس کی اساس بدھ مت، شنکر، اور عیسائیوں کی رہبانیت اور خانقاہیت پر تھی۔ اقبال کہتے ہیں۔

''یہی وہ عجمی تصوف اور اس کے زیر اثر وحدت الوجود کی وہ غلط تعبیر جس سے ایک بے

روک آزادروی اور وسیع المشربی کی تحریک شروع ہوئی اور جس سے احکام شریعت کی حیثیت محض ظواہر کی رہ جاتی ہے۔ لہٰذا فرد ان سے بے اعتنائی برتتا اور جماعت، ادیان کے چکر میں اپنا تشخص کھو بیٹھتی ہے۔ اسلام میں ہی کوئی بات رہ جاتی ہے نہ امت اسلامیہ کے جداگانہ وجود میں' ۱۳۳

گویا اقبال کے نزدیک نظریہ وحدت الوجود جسے وہ عجمی تصوف بھی کہتے ہیں۔ واحد سبب تھا مسلمانوں کی پستی و ادبار کا۔

آہستہ آہستہ اقبال کے سامنے اور بھی اسباب آنے لگے جو ملتِ اسلامیہ کے زوال میں مد ہوئے۔ صدیوں کے جمود و تعطل کے بعد قوائے عمل کو تحریک ہوئی تو یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ یہ صرف تقلید اور فقہی جمود ہی نہیں بلکہ منجملہ اس کے اور بھی کئی خرابیاں ہیں۔ خانقاہی علم و حکمت کا زوال سیاسی اور معاشی ابتری مغربی تہذیب اور مغربی شہنشاہیت کا غلبہ اور استبداد کا بڑھتا ہوا ریلا۔ ۱۳۴

قیام یورپ میں مابعد الطبیعات پر لکھتے ہوئے اقبال کے افکار و نظریات اور عقائد میں تبدیلی شروع ہوئی اور اس کی اساس اقبال کا یہ سمجھنا کہ ملتِ اسلامیہ کے زوال اور ذوق عمل محرومی کا سبب وحدت الوجود کا نظریہ جو دورِ زوال میں تمام عالم اسلام میں چھا گیا تھا۔ جس کی بنا پر مسلمانوں میں تقدیر کا غلط تصور ابھرا کہ انسان کے جملہ اعمال و افعال خیر و شر پہلے ہی متعین کیے جا چکے ہیں۔ اس لیے اس دور میں اقبال تصوف کے سخت خلاف ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں۔

''میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ کیونکہ یورپین فلسفہ بحیثیت مجموعی ''وحدت الوجود'' کی طرف رخ کرتا ہے۔ مگر قرآن میں تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔'' ۱۳۵

ابن عربی چونکہ وحدت الوجود کے زبردست حامی اور شارح تھے اور اقبال اس کے مخالف، اس لیے اقبال نے اس کے بارے میں کئی بار اظہار خیال کیا ہے۔

''خواجہ صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ یورپ کا علمی مذہب تو وحدت الوجود ہے۔ جس کے وہ حامی ہیں۔ میں تو اس مذہب سے جو میرے نزدیک ایک قسم کی زندیقیت ہے، تائب ہو کر خدا کے فضل و کرم سے مسلمان ہو چکا ہوں۔'' ۱۳۶

نیز۔۔۔"وحدت الوجود نے تو اپنے نظام تصوف کی تدوین میں قریباً تمام مشرک اقوام کے افکار سے خوشہ چینی کی ہے۔"۱۳۷

اس کے علاوہ مزید کہتے ہیں۔

"شیخ ابنِ عربی کے ذکر سے ایک بات یاد آ گئی جس کو اس لیے بیان کرتا ہوں کہ آپ کو غلط فہمی نہ رہے۔ میں شیخ کی عظمت اور فضیلت دونوں کا قائل ہوں، اور ان کو اسلام کے بہت بڑے حکماء میں سے سمجھتا ہوں۔ مجھ کو ان کے اسلام میں بھی شک نہیں ہے کیونکہ جو عقائد ان کے ہیں (مثلاً قدم ارواح اور وحدت الوجود) ان کو انہوں نے فلسفہ کی بنا پر نہیں جانا بلکہ نیک نیتی سے قرآن حکیم کی تاویل پر مبنی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جو تاویل انہوں نے پیش کی ہے صحیح یا غلط؟ میرے نزدیک ان کی پیش کردہ تاویل بالتفسیر صحیح نہیں ہے۔ اس لئے گو میں ان کو ایک مخلص مسلمان سمجھتا ہوں مگر ان کے عقائد کا پیرو نہیں ہوں۔"۱۳۸

تصوف کے دوسرے اکابر کی طرح ابنِ عربی بھی وحدت الوجود کے بارے میں قرآن وحدیث سے ہی اسناد لیتے ہیں۔

هوالاول والاخر و الظاهر الباطن

کل شئی هالك الا وجهه او ذلك بان الله هو الحق وان تدعون من دونه الباطل

نحن اقرب اليه من حبل الوريد

اسلام کا پہلا اہم ترین رکن **لااله الا الله** ہے۔ حدیث میں ہے **بنی الاسلام علی خمس شهادة ان الا اله الا الله و ان محمد عبده ورسوله الی آخره**

اور اللہ کے سوا کوئی معبود، مقصود اور موجود نہیں ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں

تو اے ناداں دل آگاہ دریاب   بخود مثل نیاگاں راہ دریاب
چساں مومن کند پوشیدہ را فاش   زلاموجود الا اللہ دریاب

عرب کے مشہور شاعر لبید کے اس مصرے **الا کل شئی ماخلد الله باطل** کی رسول اکرم ﷺ نے تصدیق فرمائی۔ سب سے سچی بات جو شاعر نے کہی ہے وہ لبید کی یہ بات ہے۔ اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔۱۳۸۔الف

علامہ اقبال خود بھی وحدت الوجود کے بڑے حامی رہے ہیں۔ ان کے کلام میں بہت سے اشعار

ہیں جن کا یہی موضوعِ سخن ہے۔ اور اقبال کو فطرت کے مناظر و شواہد میں ہر جگہ محبوب حقیقی کے حسن و جمال کا عکس نظر آتا ہے۔

جس کی نمود دیکھی چشم ستارہ بین نے
خورشید میں، قمر میں، تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدہ میں پایا
شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
جس کی چمک سے پیدا، جس کی مہک ہویدا
شبنم کے موتیوں میں پھولوں کے پیرہن میں
صحرا کو بسایا جس نے سکوت بن کر
ہنگامہ جس کے دم سے کاشانہ چمن میں

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقین ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

یہ سلسلہ زماں و مکاں کا کمند ہے   طوقِ گلوئے حسنِ تماشا پسند ہے
منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں   اے شمع میں اسیر فریب نگاہ ہوں
صیاد آپ، حلقہ دام ستم بھی آپ!   بام حرم، بھی طائر بام حرم بھی آپ!
میں حسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں   کھلتا نہیں کہ ناز ہوں یا نیاز ہوں
ہاں آشنائے لب ہو نہ راز کہن کہیں   پھر چھڑ نہ جائے قصہ دار و رسن کہیں
مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من وتو   پلا کے مجھ کو مئے لا الہ الا ھو
جہاں دل جہانِ رنگ وبو نیست   درو و پست و بلند و کاخ و کونیست!
زمین و آسمان و چار سو نیست   دریں عالم بجز اللہ ہو نیست!
خاص انسان سے کچھ حسن کا احساس نہیں   صورتِ دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں مکین
دل ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے کسک ہے اس کی   نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی
کہیں سامانِ حسرت کہیں سازِ غم ہے   کہیں گوہر ہے، کہیں اشک کہیں شبنم ہے
حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے   انسان میں وہ سخن ہے۔ غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دِل ہے گویا   واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

اندازِ گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ — نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں — جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں، تارے میں

بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں افتادگی تیری کنارے میں
جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانہ دل کے مکینوں میں

تلاش او کنی جز خود نہ بینی
تلاشِ خود کنی جز او نیابی

ابن عربی کے متعلق علامہ اقبال کے یہ ابتدائی تاثرات تھے۔ بعد میں جب انہیں ابنِ عربی کے گہرے اور وسیع مطالعے کا موقع ملا تو ان کو اپنی غلط فہمی کا احساس ہو گیا اور وہ ابنِ عربی کا ذکر احترامی کلمات کے ساتھ کرنے لگے۔ چنانچہ ابتداء میں اقبال انہیں صرف محی الدین ابنِ عربی کہتے تھے۔ مگر بعد میں حضرت محی الدین ابنِ عربی اور آخر میں انہیں ہسپانیہ کا برگزیدہ اور عظیم الشان صوفی لکھنے لگے۔

خطبات لکھتے وقت مسئلہ زمان و مکان کے بارے میں انہوں نے شیخ اکبر کی تصانیف سے استفادہ کرنے کے ساتھ ان سے اسناد لینے کی کوشش کی مثلاً ایک خط جو مہر علی شاہ کو لکھا ہے پوچھتے ہیں۔

(۱) اول یہ کہ حضرت شیخ اکبر نے تعلیم حقیقت زماں کے متعلق کیا کہا ہے۔ اور آئمہ متکلمین سے کہاں کہاں تک مختلف ہے۔

(۲) یہ تعلیم شیخ اکبر کی کون کونسی کتب میں پائی جاتی ہے اور کہاں کہاں اس سوال کا مقصود یہ ہے کہ سوال اول کے جواب کی روشنی میں خود بھی ان مقامات کا مطالعہ کر سکوں"[۱۳۹]

پھر ایک اور خط میں سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔

"یہ عریضہ حضرت محی الدین ابنِ عربی کے مسئلہ زمان و مکان کی تلخیص کی یاددہانی کے لیے لکھتا ہوں۔"[۱۴۰] اور جب تلخیص مل گئی تو ان کے ذہن میں ایک اور سوال پیدا ہوا جس کے متعلق پوچھتے ہیں۔

"اگر دہر کل ممتد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہے تو پھر مکاں کیا چیز ہے؟ جس طرح زماں دہر کا ایک طرح سے عکس ہے، اس طرح مکاں بھی دہر کا عکس ہونا چاہیے۔ یا یوں ہے کہ زمان و مکاں دونوں کی حقیقت اصلیہ دہر ہی ہے۔ کیا یہ خیال بھی محی الدین ابن عربی کے نقطۂ خیال سے صحیح ہے؟ اس کا جواب شاید فتوحات میں ملے۔ مہربانی کر کے تھوڑی سی تکلیف اور گوارا فرمایئے اور دیکھئے کیا انہوں نے مکان پر بھی کچھ بحث کی ہے اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے۔"[۱۴۱]

دراصل اقبال کے سامنے رسول اکرم کی یہ حدیث تھی:

"لاتسبو الدھر" اور وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ابن عربی نے اس کے متعلق کیا کہا ہے۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ ابن عربی نے کہا ہے کہ دہر اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ لیکن انہیں مفصل بحث نہ مل سکی۔

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں ابنِ عربی سے سند لیتے ہوئے مسئلہ وحدت الوجود کی صاف طور پر حمایت کی ہے کہتے ہیں۔

"کانٹ نے تو اس مسئلے میں کہ مابعد الطبیعات کا وجود کیا ممکن ہے جو فیصلہ صادر کیا ہے وہ اس نظریہ کے ماتحت ایک شے ہے۔ بذاتہٖ ایک شے ہے بظاہر لیکن فرض کیجئے معاملہ یوں نہ ہو جیسا کانٹ کا خیال تھا، بلکہ اس کے برعکس، چنانچہ اسلامی اندلس کے مشہور فلسفی محی الدین ابن عربی کا یہ قول کیا خوب ہے، کہ وجود مدرک تو خدا ہے۔ کائنات معنی ایسے ہی ایک دوسرے مسلمان صوفی مفکر اور شاعر عراقی نے کہا ہے کہ زمان و مکان کے متعدد نظامات ہیں حتیٰ کہ ایک وہ زمان و مکان بھی ہے۔ جو صرف ذات الٰہیہ سے مخصوص ہے۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ جسے ہم کائنات کے یا عالم خارجی ٹھہراتے ہیں وہ عقل ہی کی اک تاویل ہو"۔[۱۴۲]

یورپ کے ایک عظیم شاعر دانتے نے ابن عربی سے استفادہ کرتے ہوئے ڈیوائن کامیڈی لکھی، جو میگوئیل آسن Migul Asin کے نزدیک فتوحات کا چربہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"اسلامک کلچر کی طرف جو رجحان دانتے کی نسبت میں ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ آسمانوں پر سیر کے اسلامی ماڈلوں سے بہت متاثر ہوا ہے۔ اسلامی ہسپانیہ سے اسلامی کلچر کی روایات اور حکایات اطالیہ تک پہنچیں اور فلورنس کے رہنے والے دانتے پر اس کا اثر ہوا۔ ڈیوائن کامیڈی میں اسلامی کلچر کا اثر بہت نمایاں ہے اور خاص طور پر ہسپانیہ کے باشندے کی تصنیف ابنِ

عربی کی فتوحات ہی کا چربہ معلوم ہوتی ہے۔ ابنِ عربی نے فتوحات میں دوزخ و بہشت کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ ڈیوائن کامیڈی اس کی بالکل نقل ہے۔ آسمانی ڈرامے کے تمام نقش و نگار ابنِ عربی سے لیے گئے ہیں۔ اس میں نیک اور پارسا لوگوں کی زندگی اور باری تعالیٰ کا پرنور نظارہ جس سے نیک اور پارسا انسان روحانی مسرت کے نشے میں مخمور ہیں۔ یہ سب باتیں ابنِ عربی ہی لی گئی ہیں۔[۱۴۳] اسی تقریب سے میں پروفیسر بیون (Bevan) کا نام بھی لے سکتا ہوں۔ جنہوں نے ہم کو سرگذشت معراج کی تاریخی بحث و نظر کا ایک قیمتی ساز و برگ بہم پہنچایا ہے۔ بایں ہمہ ثقافتی لحاظ سے گفتگو کرتے ہوئے جو چیز ان سب مباحث سے زیادہ وقیع ہے وہ زبردست اثر انگیزی ہے۔ جو یہ قصہ ہمیشہ ایک اوسط درجے کے مسلمان کے قلب کے لیے اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور نیز وہ مخصوص انداز ہے جس سے اسلامی تخیل و تصور اور فکر و نظر نے اس پر ایک پوری عمارت تعمیر کی ہے۔ معراج کی حقیقت یقیناً محض ایک مذہبی عقیدے سے بڑھ کر ہوگی۔ اس لیے کہ اس نے دانتے ایسے عظیم دل و دماغ کو متاثر کیا ہے۔ اور محی الدین ابنِ عربی کے توسط سے اس کو وہ معیار پہنچایا جس پر ہم اطالوی شاعر کے اس "طربیہ خداوندی" (Divine Comedy) کے رفیع و جلیل ابواب کا نقش صورت پذیر ہوا ہے۔ جو یورپ کے قرونِ وسطیٰ کی ثقافت کا پیراہن محسوس ہے۔"[۱۴۴]

اقبال نے اپنی زندگی کے آخری دور میں مسئلہ ختم نبوت کی بحث میں حصہ لیا۔ اسی ضمن میں پنڈت نہرو سے بھی خط و کتابت ہوئی۔ اقبال نے اپنے خط میں ان قادیانی مبلغین کی سختی سے تردید کی جو اپنی تائید میں شیخ اکبر کا حوالہ دیتے ہیں۔ اقبال نے واضح الفاظ میں لکھا۔۔۔۔۔

"فتوحات" کی متعلقہ عبارت کو پڑھنے کے بعد میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہسپانیہ کا یہ صوفی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر اسی طرح ایمان رکھتا ہے جس طرح اکہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان رکھ سکتا ہے۔ اگر شیخ کو اپنے کشف میں نظر آ جاتا کہ ایک روز مشرق میں چند ہندوستانی جنہیں تصوف کا شوق ہے، شیخ کے صوفیانہ نفسیات کی آڑ میں پیغمبر اسلام کی ختم نبوت سے انکار کر دیں گے تو وہ یقیناً علمائے ہند سے پہلے مسلمانانِ عالم کو ایسے غدارانِ اسلام سے متنبہ کر دیتے۔"[۱۴۵]

اقبال اور ابنِ عربی دونوں کی الٰہیات میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ ابنِ عربی کی الٰہیات میں اللہ تعالیٰ کا تصور ایک ذاتِ مطلق و اکمل کا ہے اور اقبال کے الٰہیات میں ذات باری کائنات کے ساتھ ساتھ ارتقاء کی منازل طے کر رہی ہے۔ جاوید نامہ کے عبدہ اور ابنِ عربی کے حقیقت الحقائق میں گہری مماثلت ہے۔ ابنِ عربی اس بارے میں خود کہتے ہیں۔

"وہ جمیع السماء صفات الٰہیہ کا مظہر ہے۔ وہ واسطہ حق و خلق ہے۔ وہ جامع اجمال و تفصیل احدیت ہے۔ انہی وجوہ سے وہ مستحق تاجِ خلافت ہوا۔ آدم سے ہماری مراد وہ نفسِ واحدہ ہے جس سے یہ نوع انسانی پیدا ہوئی ہے۔ جس کو بعض لوگ وحدت کی حقیقت محمدی کہتے ہیں۔ انا من نور اللہ و کلھم من نوری۔ جس کے مظاہر عین الاعیان اور روح الارواح ہیں۔ اس پر آیت دلالت کرتی ہے۔ "یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذین خلقکم من نفس واحدہ" لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا۔"[۱۴۶] اور حکمت فردیہ محکم محمدیہ میں کہتے ہیں۔

"نیز ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فردیت ہے۔ کیونکہ آپ اس نوع انسانی کے کامل تر فرد ہیں۔ لہٰذا حقیقتہ نبوت آپؐ ہی سے شروع ہوئی۔ اور آپ ہی پر ختم ہوئی آپ نبی تھے اور آدم آب و گل میں تھے۔ اپنی نشات و خلقتِ عنصری کے لحاظ سے خاتم النبین ہیں۔ اور اول افراد کا تین کا عدد ہے اس کے سوا جتنے افراد ہیں وہ اس فرد اول سے معادر ہیں۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب پر پہلی دلیل ہیں۔ حضرت کو اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم یعنی کلمات اوصول عطا کئے تھے۔ وہ جوامع الکلم کیا ہیں۔ حقائق و متمیات اسمائے آدم ہیں۔ جس طرح قیاس میں تثلیث ہے یعنی اصغر، اوسط، اکبر، یا صغریٰ، کبریٰ، نتیجہ، اسی طرح آپ میں بھی تثلیث ہے۔

(۱) احدیت
(۲) وحدت
(۳) عین الاعیان یا معلوم کلی اجمال[۱۴۷]

جاوید نامہ میں اقبال نے حقیقتِ محمدیہ کے تصور کو عبدہ کے نام سے اس طرح پیش کیا ہے۔

زندہ رود — صد جہاں پیدا دریں نیلی فضا است
ہر جہاں را اولیا و انبیاء است ؟

غالب — نیک بنگر اندریں بود و بنود — پے بہ پے آید جہاں ہا در وجود
ہر کجا ہنگامہ عالم بود — رحمتہ العالمینے ہم بود!
غالب — خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است — رحمت اللعالمینی انتہا است
حلاج — ہر کجا بینی جہاں رنگ و بو — آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفٰے او را بہا است — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفٰے است

زندہ رود از تو برسم گرچہ پرسیدن خطا است سرِ آں جوہر کہ نامش مصطفےٰ است
آدمے یا جوہرے اندر وجود
آنکہ آید گاہے گاہے در وجود؟

حلاج

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است خویش را عبدہ فرمودہ است!
عبدہ از فہم تو بالا تر است زانکہ او ہم آدم وہم جوہر است
جوہر او نے عرب نے اعجم است آدم است وہم ز آدم اقدم است!
عبدہ صورت گرِ تقدیر ہا اندر و ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبدہ ہم جان فزا ہم جانستان عبدہ ہم شیشہ ہم سنگ گراں!
عبد دیگر عبدہ چیزے دگر ما سراپا انتظار او منتظر!
عبدہ دہراست و دہراز عبدہ است ماہمہ رنگیم او بے رنگ و بواست!
عبدہ با ابتداء بے انتہا است عبدہ را صبح و شام کجا ما است!
کسی ز سرِ عبدہ آگاہ نیست عبدہ جز سر الا اللہ نیست!
لاالہ تیغ و دم او عبدہ فاش تر خواہی بگو ہو عبدہ
عبدہ چند و چگونِ کائنات عبدہ رازِ درونِ کائنات
مدعا پیدا نگردد زین دو بیت تا نہ بینی از مقام ما رمیت ۱۴۸

اقبال نے ابنِ عربی کے بعض افکار کو شعر کے سانچے میں بھی ڈھالا ہے۔ مثلاً اقبال کی مندرجہ ذیل نظم ابنِ عربی سے ماخوذ ہے۔ جس کا اعتراف اقبال نے نظم کے حاشیے میں کیا ہے۔

ابلیس

اے خدائے کن فکاں، مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ! وہ زندانی نزدیک و دور و دیر و زود
حرفِ 'استکبار' ترے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

یزداں

کب کھلا تجھ پر یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد؟

ابلیس

بعد! اے تیری تجلّی سے کمالات وجود!
یزداں (فرشتوں کی طرف دیکھ کر)
پستی فطرت نے سکھائی ہے یہ حجت اسے
کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلہ سوزاں کو خود کہتا ہے دود ۱۴۹

تصور ابلیس کے موضوع پر، اقبال اور ابنِ عربی میں مماثلت ملتی ہے۔ ابنِ عربی ان مسلمان صوفیاء میں سے ایک ہیں جو ابلیس کو توحید پرست اور موحد کہتے ہیں۔ اقبال نے بھی اس باب میں ایرانی ثنویت، مغربی ادب اور مسلمان صوفیاء کے افکار سے استفادہ کیا ہے۔

ابلیس ایک نظم میں کہتا ہے۔

من، بلیٰ در پردۂ لا گفتہ ام گفتہ من خوشتر از نا گفتہ ام!
تا نصیب از دردِ آدم داشتم قہرِ یار از بہرِ او نگزاشتم
شعلہ ہا از کشت زارِ من دمید او زمجبوری بہ مختاری رسید ۱۴۹-۱

یہی خیال ابنِ عربی کا ہے۔ جو شیطان کو بے گناہ اور بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔ ابنِ عربی ابلیس کو اپنا استاد کہتے ہیں اور اقبال ذہنی طور پر ایک ابدی اور قادرِ مطلق شیطان پر ایمان لانا زیادہ آسان سمجھتے ہیں۔ بہ نسبت ایک خدا پر ایمان لانے کے بلکہ اقبال تو اسے عارف کامل کہتے ہیں۔

کم بگو زاں خواجہ اہل فراق تشنہ کام و از ازل خونین ایاق
ماجہول او عارفِ بود و نبود کفر او ایں راز را بر من کشود ۱۴۹(۲)

ابنِ عربی کی طرح اقبال نے ابلیس کی عظمت کو مانا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہے میری جرأت سے مشت خاک میں ذوقِ نمو میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر کون طوفان کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا میرے طوفان یم بہ یم، دریا بہ دریا، جُو بہ جُو!
گر کبھی خلوت میں ہو تو پوچھو اللہ سے قصہ آدم کو رنگین کر گیا کس کا لہو؟

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح تو فقط اللہ ہو ، اللہ ہو، اللہ ہو

ابنِ عربی اور اقبال دونوں کے نزدیک ابلیس عظیم صفات کا مالک ہے۔ ارمغان حجاز میں پانچواں مشیر ابلیس کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

اے تیرے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار

تجھ سے بڑھ کر فطرتِ آدم کا وہ محرم نہیں سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار

اقبال کے انسان کامل کا ماخذ بھی ابنِ عربی، عبدالکریم الجیلی اور دانتے ہے.... زندگی کے آخری ایام میں علامہ اقبال کو ابنِ عربی سے خاص عقیدت و شیفتگی پیدا ہو گئی تھی اور اکثر ان کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ علامہ اقبال کے بقول ''انسان کی ساری زندگی دعا ہے۔ دعا جو اللہ تعالیٰ کو قادرِ مطلق، رب اور خالق اور سمیع و علیم مان کر صمیم قلب سے نکلتی ہے۔ دعا جو عبادت ہے، ذکر ہے، صلوۃ ہے، دعا جس سے زندگی کا سارا نقشہ بدل جاتا اور سیرت کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔ دعا جو طلب بھی ہے اور تڑپ، امید اور آرزو بھی۔ جو محض تسکین قلب کا ذریعہ نہیں ہے۔ نہ فریب نفس بلکہ ایک حقیقت..... اس نکتے کو دو اشخاص خوب سمجھے۔ ابنِ خلدون اور ابنِ عربی۔'' ۱۵۰

ایک اور مجلس میں ستاروں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ابنِ عربی کے متعلق کہتے ہیں۔

''عجیب بات ہے فطرت انسانی نے ستاروں سے بڑا اثر قبول کیا ہے۔ ایک تو ستاروں کی کثرت اور کثرت بھی ایسی جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اس پر ان کی تابانی اور درخشانی، جسے دیکھ کر انسان کا دل خواہ مخواہ ان کی طرف کھنچتا ہے۔ پھر ان کی دوری ہے۔ ان کے ذہن میں نہ آنے والی مسافت اور جسامت، راتوں کی تاریکی میں ان کے ان گنت جھرمٹ، انسان جب ان کا مشاہدہ کرتا ہے، تو جمال و جلال کی عجیب و غریب کیفیتوں میں کھو جاتا ہے۔ ستاروں نے مسافروں ملاحوں اور صحرانشینوں کی راہنمائی کی ہے۔ ستاروں سے راتوں کے اوقات، پہر اور گھڑیاں متعین ہوئیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی قسمت ستاروں کے ہاتھ میں ہے۔ اس طرح نجوم، سحر، کہانت اور کس کس چیز کی ابتدا ہوئی۔ انسان کے دل میں غیر معمولی باتوں کے لیے ہمیشہ بڑی کشش رہی ہے۔ قدیم مذاہب اور فلسفہ بھی اس کمزوری سے مبرا نہیں۔ ستاروں کی حرکات نقص سے خالی ہیں روحیں ستاروں میں قیام کرتی ہیں۔ یہ اور کتنی باتیں ہیں جن سے فلسفی اور ارباب مذہب کی تحریریں بھری پڑی ہیں۔ لیکن ان سب میں پُر اثر اور معنی خیز بات یہ ہے کہ ستاروں نے بعض افراد کو اپنی طرف کھینچا۔ انہیں اپنے یہاں آنے کی دعوت دی یا یوں کہیے بعض انسانوں کا خیال اس طرف گیا

کہ وہ آسمان کا سفر کریں۔ ستاروں میں پہنچیں، اور ان میں گھوم پھر کر واپس آ جائیں۔ ابنِ عربی کو ہی دیکھئے۔ ان کی شخصیت کتنی عظیم ہے وہ ستاروں میں اپنی سیاحتوں کا حال بیان کرتے نہیں تھکتے۔ ایک کے بعد دوسرے ستارے کا رخ کرتے ہیں۔ ستاروں میں جاتے ہیں اور وہاں انہیں جو مشاہدات ہوتے ہیں ان کے بیان میں کیا کچھ نہیں کہتے۔ ابنِ عربی عجیب انسان تھے لیکن اس سے بھی عجیب تر انسان کا یہ جذبہ ہے کہ روح انسانی زمین سے رستگاری حاصل کرے، عالم بالا کی سیر کرتی پھرے، زمین سے آزاد ہو جائے انسان کو زمین سے آزاد ہونا چاہئے۔'' ۱۵۱

اسی کے بارے میں ابن عربی فتوحات مکیہ میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''ایک زمانہ وہ آئے گا جب لوگ لوہے اور لکڑی کے ٹکڑوں کے توسط سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پرواز کیا کریں گے۔ لیکن میں تو اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں جب پرواز کے لیے کسی مادی ذریعے کی ضرورت نہ رہے گی اور فاصلے انسانی خواہش کا احترام کرتے ہوئے خود اس کی طرف طے ہو جائیں گے اور یہ حقیقی ترقی ہو گی۔ ۱۵۲

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کے روحانی راہنما اور استاد مولانا جلال الدین رومی تھے اُن کے استاد مولانا صدرالدین قونوی تھے جو ابنِ عربی کے لے پالک شاگرد تھے۔ مولانا رومی کی مثنوی میں نظریہ فصل و جذب پر ابنِ عربی کا ہی اثر ہے۔

ابن عربی کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے یہ الفاظ دیکھئے۔

''اگر علامہ اقبال کی تصانیف پر مجموعی طور پر نظر ڈالی جائے اور یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ حضرت علامہ نے مسلمانوں کی روایت فکری کے ممتاز علمبرداروں میں کن ناموروں کے خیالات سے خاص الخاص اقتنا کیا ہے۔ تو وہ یہی دو بزرگ نکلیں گے۔ ایک رومیؒ اور دوسرے ابن عربیؒ۔ (۱۵۲۔الف)

۔۔۔۔ متقشف دینی نقطہ نظر سے کچھ کہے یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ ابن عربی عالم اسلام کی عظیم ترین (گو کہ بے حد متنازعہ فیہ) تخلیقی اور علمی شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ جنہیں محض یہ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا کہ ان کے یہاں الحاد زندقہ ہے یا تاویل و رمز ہے۔ (۱۵۲۔ب):

☆☆☆

علامہ ابنِ خلدون

ابوزید ولی الدین عبدالرحمٰن ابن خلدون [۱۵۳] ۷۳۲ھ (۱۳۳۲ء) میں تونس میں پیدا ہوئے۔ ۷۶۴ھ میں اندلس چلے گئے۔ اس وقت وہاں محمد خامس غرناطہ کا حکمران تھا اور لسان الدین ابن الخطیب اس کا وزیر تھا۔ دونوں نے اس کا انتہائی پرتپاک خیر مقدم کیا۔ لیکن بعد میں ابن خطیب اس کے اثر ونفوذ سے حسد کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر ابن خلدون واپس افریقہ آ گئے۔ کئی اسلامی ممالک کی سیاحت بھی کی۔ تیمور لنگ نے دمشق پر تاخت کی تو ابن خلدون وہاں موجود تھے۔ کچھ عرصہ تک امیر تیمور کے دربار میں بھی رہے۔ یہ زمانہ بڑا فتنہ پرور تھا۔ شمال مغربی افریقہ کے اسلامی ممالک باہمی آویزش اور جنگ و جدل میں مبتلا تھے۔ اس پُر آشوب دور میں ابن خلدون کو تقریباً دو برس قید خانے میں بسر کرنا پڑے۔ وہ کافی عرصہ تک بدوؤں کے ساتھ صحرا میں مقیم رہے۔ جہاں انہیں صحرائی قبائل کی زندگی کے گہرے مطالعے کا موقع مل گیا۔

ان کی لاجواب تصنیف کتاب "العبر و دیوان المبتدا والخبر فی ایام العرب و العجم و البربر" تین حصوں پر مشتمل ہے۔ المقدمہ، تاریخ اور احوال بربر۔ المقدمہ جو ابن خلدون کی شہرت کا ضامن اور شہرت دوام کا مالک ہے۔ اس میں اپنا فلسفہ تاریخ کو نہایت شرح وبسط سے پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ عرب مورخوں نے بلکہ اور مغربی مفکروں میں سے بھی کسی نے آج تک تاریخ کو اس جامعیت کے ساتھ فلسفیانہ انداز میں پیش کیا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے فلسفہ اجتماعیہ کو علمی قالب میں ڈھالا۔ اس نامور مورخ نے ۸۰۸ھ (۱۴۰۶ء) میں وفات پائی۔

ابن خلدون دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے تاریخ کو فلسفے اور حکمت کا درجہ دیا اور گزشتہ مورخین کی پیروی ترک کر کے اجتماع کے آغاز وارتقاء کے قوانین دریافت کیے ابن خلدون کہتے ہیں۔

"اس زمانے کی موجودہ تاریخیں اکثر تحقیق سے خالی ہیں اور تنقیح کا کہیں پتہ نہیں لگتا۔ روائتیں اغلاط وموہومات سے بھری پڑی ہیں۔ اور تقلید عام طور پھیلی ہوئی ہے۔ اور نااہل علوم وفنون کے مدعی بنے ہوئے ہیں۔ اور جہالت کی تاریکی عالم پر بے طرح چھائی ہوئی ہے۔" [۱۵۴]

-----میں نے اس کتاب کی تہذیب وترتیب میں تا بامکاں کوشش بلیغ کی اور اس

کو علماء اور خواص کی آگاہی کا ذریعہ بنایا۔ اس میں عمارت وتمدن اور اجتماع انسانی کے عوارض ذاتیہ وطبیعہ کے تفصیلی حالات لکھے جس سے کائنات کے عمل واسباب کا باحُسن وجود پتہ چل سکے اور یہ بھی کہ مختلف سلطنتوں کا کیوں کر آغاز ہوا تا کہ لوگ تقلید چھوڑیں اور اقوام سلف اور ازمنہ ماضیہ وگذشتہ کا حال معلوم کر سکیں۔" [۱۵۵]

اِن اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ ابنِ خلدون نے تاریخ نگاری کو سائنس کا درجہ دیا اور اقتصاد واجتماع انسانی کے دقیق مطالعے کے بعد ایک فلسفی کی طرح اِس سے منطقی نتائج اخذ کیے۔

علامہ اقبال کو تاریخ وتہذیب سے جتنی دلچسپی تھی اس کے متعلق بابِ اول میں وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔ وہ مسلم دنیا کے عظیم تاریخ دان ابنِ خلدون کے بہت معترف ہیں اور وہ اسے ایک باکمال محقق جانتے ہیں۔ وہ بار بار ابن خلدون کے نظریات کا حوالہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی وہ پہلا تاریخ دان تھا جس نے تاریخی عمل کو بحیثیت ایک تخلیقی حرکت کے ظاہر کرنے کی سعادت حاصل کی۔ [۱۵۶]

انسانی معاشرہ ازل سے ہی جغرافیائی ماحول کی تبدیلی نیز سیاسی، معاشی اور عمرانی تقاضوں کی بنا پر بدلتا رہا ہے۔ تغیر وتبدل کا یہ عمل ہمیشہ سے جاری ہے۔ نہ کبھی رکا ہے اور نہ رکنے کا امکان ہے۔ اس طرح اقوام عالم بھی حیات وموت اور عروج وزوال کا شکار ہوتی رہتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک بھی حرکت زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔ اقبال کا نظریہ تاریخ بالکل وہی ہے جو ابنِ خلدون کا ہے۔ اقبال کا تصور یہ ہے کہ تاریخ ایک مسلسل اجتماعی حرکت ہے جس میں واقعات کی تکرار نہیں بلکہ تخلیق ہوتی ہے۔ زندگی اور کائنات کے اس حرکی تصور کا اقبال کے کلام میں جا بجا اظہار ہوا ہے۔ مثلاً

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظ ہے تازہ شانِ وجود [۱۵۷]

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار
ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار [۱۵۸]

زندگی را سرِ تکرار نیست
فطرتِ او خوگرِ تکرار نیست [۱۵۹]

حکمائے یونان حرکت کی بجائے سکون کی طرف مائل تھے۔ مسلمان مفکرین میں سے

بیشتر یونانی حکماء کے مقلد تھے۔ لیکن ابنِ خلدون نے اس کے برعکس حرکت کا نظریہ پیش کیا ہے۔ جو قرآنی روح کے عین مطابق ہے۔ اقبال نے ابنِ خلدون کے اِس نظریے کی اہمیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کی رو سے زمانہ ایک دائرے میں گھومتا اور نہ ہی تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ جیسا کہ یونانی فلسفی کہتے ہیں بلکہ زمانہ ایک خطِ مستقیم میں حرکت کرتا ہے۔ جس سے واقعات کی تکرار ممکن نہیں ہوسکتی۔ ابنِ خلدون کے نظریہ تاریخ کی وضاحت اقبال نے ایک جگہ یوں کی ہے۔

''اسلامی تہذیب وتمدن نے اپنے اظہار کے لیے جو راستہ اختیار کیا اس پر نظر رکھیے تو یہ کسی مسلمان ہی کا کام ہوسکتا تھا کہ تاریخ کا تصور ایک مسلسل اور مجموعی حرکت کے کرتا۔ یعنی زمانا ایک ایسے نشوونما کی حیثیت سے جس کا ظہور ناگزیر ہے۔ گویا ہمیں ابنِ خلدون کے نظریہ تاریخ سے دلچسپی ہے تو اس کی وجہ بھی ابنِ خلدون کا وہ تصور ہے جو اُس نے تغیر کے باب میں قیام کیا۔ یہ تصور بڑا اہم ہے کیونکہ اِس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخ چونکہ ایک مسلسل حرکت ہے زمانے کے اندر لہٰذا یہاں ماننا لازم آتا ہے کہ اِس کی نوعیت فی الواقع تخلیقی ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ وہ حرکت نہیں جس کا راستہ پہلے سے متعین ہو۔''[160]

ابنِ خلدون کے اِس حرکی تصور کی بنا پر اقبال نے اسے برگسان کا پیش رو قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے ابنِ خلدون اقبال کا بھی پیش رو ہے۔

اقبال کی سوچ اور اندازِ فکر کی لہروں کا سرچشمہ قرآن ہے۔ اور جس طرح ان کا تصور تاریخ قرآن سے متاثر ہے اس طرح ابنِ خلدون بھی متاثر ہے اگرچہ وہ کہیں اس کا ذکر نہیں کرتے کہ اس کے فلسفۂ تاریخ کا مبداء قرآن ہے۔ حالانکہ بہ نگاہِ حقیقت دیکھا جائے تو ابنِ خلدون کا ''مقدمہ'' سرتاسر اِس روح سے معمور ہے جو قرآن مجید کی بدولت اس میں پیدا ہوئی۔ وہ اقوام وامم کے عادات وخصائل پر حکم لگاتا ہے تو اس میں بھی زیادہ تر قرآن پاک ہی سے استفادہ کرتا ہے۔''[161]

آگے لکھتے ہیں کہ ابنِ خلدون نے عربوں کی سیرت وکردار کے بارے میں جو لکھا ہے تو اُس نے قرآنی آیات سے ہی رہنمائی حاصل کی ہے۔

ابنِ خلدون کے نزدیک زمانہ ایک تسلسل کل اور حرکت پیہم ہے۔ اور ابنِ خلدون کے اِسی تصور کی وجہ سے اقبال نہ صرف اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بلکہ فلنٹ نے جو ابنِ خلدون کی تعریف کی ہے اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

''اسی لیے فلنٹ بجا طور پر اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ وہ کہتا ہے افلاطون

ہو یا ارسطو یا آگسٹائن اِن میں سے کوئی بھی اِس قابل نہیں کہ اس کی ہمسری کا دعویٰ کرسکے۔ رہے دوسرے تو سو اِن کا ذکر ہی کیا ہے۔ ان کا تو اس کے ساتھ نام بھی نہیں لیا جاسکتا''۔[162]

بہرحال قرآنی تعلیمات کے زیر اثر اکثر مسلم حکماء وفضلا نے یونانی سکونیت کی نفی کی ہے۔ جس کی بنا پر اسلامی فکر نے جو راستہ اختیار کیا اُس کی انتہا جس پہلو اور جس رنگ میں بھی دیکھیے کائنات کی حرکی تصور پر ہوئی اور پھر جسے ابنِ مسکویہ کے اِس نظریے سے کہ زندگی عبارت ہے ایک ارتقائی حرکت سے مزید تقویت پہنچی۔ علیٰ ھذا ابنِ خلدون کے نظریہ تاریخ سے''[163]

لیکن دنیائے اسلام بجائے حرکت کے جمود کا شکار ہوگئی اور اس نے ابنِ خلدون جیسے روشن خیال مفکرین کو یکسر نظر انداز کردیا جس کی بنا پر ملتِ اسلامیہ اپنی زندگی کے سنہرے ایام میں علمی وفنی کارناموں سے تمدن عالم کو روشناس کرادینے کے بعد خود اس کارگاہِ حیات میں گوشہ نشین ہوگئی۔

ابنِ خلدون کے زمانے میں خلافت کا مرکزی نظام کمزور ہوچکا تھا۔ اور مسلم فاتحین و سلاطین نے دور افتادہ علاقوں میں آزاد وخودمختار حکومتیں قائم کرلی تھیں۔ ابنِ خلدون نے بقول اقبال واقعات کی منطق سے لاجواب ہوکر عالم گیر خلافت کی جگہ آزاد مسلم حکومتوں کے وجود کو تسلیم کرلیا تھا۔ اقبال کہتے ہیں۔

''فقہا نے اِس مسئلہ پر بھی طویل بحث کی ہے کہ آیا ایک ہی وقت میں دو خلیفوں کا ہونا شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ ابنِ جمع کا قول ہے کہ خلیفہ ایک سے زائد نہیں ہوسکتا۔ ابنِ خلدون کی رائے ہے کہ ایک ہی وقت میں دو یا اس سے زیادہ خلیفوں کا ہونا کسی سبب خلاف شرع نہیں مگر شرط یہ ہے کہ خلیفے مختلف ممالک میں ہوں نہ ایک ہی ملک میں۔ ابنِ خلدون کی یہ رائے بے شک قدیم عربی مفہوم خلافت کے خلاف ہے۔ تاہم جس حد تک جمہوریت اسلام غیر شخصی وغیر قانون یعنی شریعت وحی کے تابع ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابنِ خلدون کی رائے بالکل درست ہے۔ اور مقصود ہوسکتی ہے۔ مزید برآں یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ فی الواقع بہت لمبے عرصے تک اسلام میں دو خلافتیں ایک ہی زمانے میں قائم رہیں۔''[164]

جنگ عظیم اول (۱۹۱۸ء-۱۹۱۴ء) کے بعد جب ترکوں نے خلافت کا نظام ختم کرکے اپنے ملک میں جمہوری حکومت کی داغ بیل ڈالی تو عالمِ اسلام میں احتجاج کی صدائیں بلند ہوئیں چونکہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو خلافتِ عثمانیہ سے دلی عقیدت تھی لہٰذا ترکوں کے اس

اقدام کے خلاف سب سے شدید ردعمل یہاں ہوا۔ مسلمانانِ ہند نے خلافت سے تحفظ و استحکام کے لیے جنگِ عظیم کے دوران ایک مستقل تحریک چلائی۔ جسے تحریکِ خلافت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اب خود ترکوں کے ہاتھوں خلافت کا یہ انجام دیکھ کر یہاں کے مسلمانوں کو جو صدمہ پہنچا ہوگا اس کا با آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مسلم رہنماؤں میں صرف اقبال کی شخصیت ایسی تھی جس نے اپنی تاریخی بصیرت سے اس مسئلے کا جائزہ لیا اور انہوں نے ابنِ خلدون کے حوالے سے ترکوں کے نقطۂ نظر کی تائید کی وہ اپنے خطبات میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

''بہر حال ترکی نقطۂ نظر کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہمیں ابنِ خلدون، یعنی عالمِ اسلام کے سب سے پہلے فلسفی مورخ سے رجوع کرنا چاہیے۔ ابنِ خلدون نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''مقدمہ'' میں خلافتِ اسلامیہ کے تین نظریے قائم کئے ہیں۔

(ا) یہ کہ خلافت ایک امر شرعی ہے لہٰذا اس کا قیام واجب ہے۔

(ب) یہ کہ اس کا تعلق ضرورت اور مصلحت سے ہے اور

(ج) یہ کہ اس کی سرے سے ہی ضرورت نہیں

آخری نظریہ خوارج کا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے جدید ترکی رجحان دوسرے نظریے کی طرف ہے۔ یعنی وہ اس معاملے میں معتزلہ کے ہم خیال ہیں جن کی رائے یہ تھی کہ عالم گیر خلافت کا تعلقہ صرف ضرورت اور مصلحت وقت سے ہے۔ ترک کہتے ہیں ہمیں چاہیے اپنے سیاسی تفکر میں ماضی کے سیاسی تجربات سے سبق حاصل کریں۔ جس کا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ عالمگیر خلافت کا تصور عملاً کبھی کامیاب نہیں ہوسکا۔ جب تک اسلامی سلطنت قائم تھی اس پر عمل ممکن تھا لیکن انتزاعِ سلطنت کے بعد جب یہ کہیں آزاد اور خود مختار ریاستیں قائم ہوگئیں تو یہ تصور قابل عمل نہ رہا۔[165] ''اقبال ''اس بارے میں ''خلافت اسلامیہ'' میں مزید کہتے ہیں۔

''میرا خیال ہے کہ ابنِ خلدون کی رائے بالکل درست ہے اور موید و مقصود ہوسکتی ہے۔ مزید برآں یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ فی الواقع بہت لمبے عرصے تک اسلام میں دو خلافتیں ایک ہی زمانہ میں قائم رہیں۔''[166]

علامہ اقبال اپنے خطبات میں اسلامی ثقافت کی روح میں اسپنگلر کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے نزدیک تعلیمات نبوی مجوسی ہیں اور مسلمانوں میں بھی انتظار مہدی ہے۔ علامہ اقبال اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسپنگلر اسلام کی روح کو غلط سمجھا ہے۔

اس لیے اس انتظار کی اِس مجوسی روش کے خلاف جس سے تاریخ کا ایک غلط نظریہ قائم ہو جاتا ہے۔ ایک نفسیاتی روگ بھی ہے۔ دراصل ابنِ خلدون نے تاریخ کا جو نظریہ قائم کیا وہ اس کی حقیقی روح کو خوب سمجھ گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اِسی نوع کے ایک اسلامی عقیدے کی تنقید سے جس نے مسلمانوں میں گویا مجوسی خیالات کے زیر اثر سر اٹھایا تھا۔ ہمیشہ کے لیے ثابت کر دیا کہ اور نہیں تو کم از کم ان نتائج ہی کے اعتبار سے جو بلحاظ نفسیات اس سے مرتب ہوتے ہیں۔ اسلام میں اِس کی کوئی جگہ نہیں۔''[167]

اقبال نے اس مجوسی تصور کو ایک اور رنگ میں لیا ہے وہ کہتے ہیں۔

دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلہ عالم افکار [168]
ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی [169]

اِس بارے میں ابنِ خلدون کی رائے ہے۔ ''اس سلسلے میں جو روایات پیش کی جاتی ہیں اِن کے یہ معنی تو قابل تسلیم ہیں کہ اسلامی دعوت یا یوں کہیے کہ دین اور ملک کے لیے طاقت اور شوکت کا وجود ناگزیر ہے۔ (اور یہ ظاہر ہے اِس کا دارومدار کسی فرد یا افراد کے جوہر قیادت پر ہی ہے) یہ نہیں کہ اس کے لیے ہمیں کسی خاص فرد کے ظہور کا (مجوسیانہ رنگ میں) منتظر رہنا چاہیے۔

اسی سے متعلق ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

''مہدی و مسیح کے متعلق جو احادیث ہیں ان پر علامہ خلدون نے اپنے مقدمہ میں مفصل بحث کی ہے۔ ان کی رائے میں یہ تمام احادیث کمزور ہیں۔ جہاں تک اصول فن تنقید احادیث کا تعلق ہے میں بھی ان کا ہمنوا ہوں۔ مگر اس بات کا قائل ہوں کہ مسلمانوں میں کسی بڑی شخصیت کا ظہور ہوگا۔ احادیث کی بنا پر نہیں بلکہ اور بنا پر میرا عقیدہ یہی ہے۔''[170] ایک موضوع جس پر علامہ اقبال نے ابن خلدون کو سراہا ہے وہ ''نفوس تحت الشعور'' (Subbminal Self) ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے نفسی مظاہر کو تحقیق و تنقید کی نگاہوں سے دیکھا۔ صحیح بخاری اور دوسری کتب حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشاہدے کی پوری تفصیل درج ہے۔ جس کا تعلق ابنِ صیاد ایسے وارفتہ نفس یہودی نوجوان سے تھا اور جس کی وجدانی

کیفیتوں نے حضور رسالت مآب کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی آزمائش کی۔ طرح طرح کے سوالات پوچھے اور مختلف حالتوں میں اس کا معائنہ کیا۔ ایک مرتبہ آپؐ ایک درخت کے پیچھے کھڑے ہو گئے تا کہ وہ الفاظ سن سکیں جو ابنِ صیاد آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا لیکن اِس کی ماں نے حضورﷺ کی موجودگی سے اُسے متنبہ کر دیا جس پر اس کی وہ حالت کافور ہو گئی اور حضور نے فرمایا کہ اگر اِس کی ماں اسے متنبہ نہ کرتی تو ساری حقیقت کھل جاتی۔"۱۷۲

اقبال کے خیال میں محدثین ابن صیاد کے بارے میں حضور اکرمؐ کے طرزِ عمل کی صحیح اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہے اور صرف "ابنِ خلدون تھا جس نے عالمِ اسلام میں سب سے پہلے سمجھا کہ اس طرزِ عمل کے معنی فی الحقیقت کیا ہیں اور پھر اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے بڑی حد تک وہ مفروضہ قائم کر لیا جس کو آج کل "نفوس تحت الشعور" سے منسوب کیا جاتا ہے۔"۱۷۳

"اسلامی ثقافت کی روح" میں علامہ اقبال عقیدہ ختم نبوت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے جس سے اِس قسم کے دعوؤں کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ اور جس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی باطنی واردات اور احوال کی دنیا میں بھی علم کے نئے نئے راستے کھل جائیں۔"۱۷۴

اس سے آگے چل کر ابنِ خلدون کا حوالہ دیتے ہیں۔

"اسلامی تصوف بھی دراصل صوفیانہ مشاہدات ہی کے نظم وارتباط کی ایک کوشش ہے گو یہ صرف ابنِ خلدون تھا جس نے اس سلسلے میں خالص علمی نہج پر قدم اُٹھایا"۔۱۷۵۔

-----کا گزر بھی جس صوفیانہ واردات سے ہوا علامہ کے خیال میں ابھی تک کوئی ایسا علمی ذریعہ نہیں جس سے اصل صورتِ حال سے واقف ہوا جائے اور ابنِ خلدون نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ "ہمارے شعور کے بعض مراتب ایسے بھی ہیں جن سے ہم قطعی بے خبر ہیں۔ ابنِ خلدون نے مدت ہوئی محسوس کر لیا تھا کہ ان مراتب کی تحقیق کے لیے کسی ایسے منہاج علم کی ضرورت ہے۔ جو فی الواقع موثر ہو جدید نفسیات کو بھی اگرچہ اس قسم کے کسی منہاج کی ضرورت کا اعتراف ہے لیکن اس کا قدم ابھی اِس اکتشاف سے آگے نہیں بڑھا کہ صوفیانہ مراتب شعور کی خصوصیات کیا ہیں۔"۱۷۶

اقبال اس سلسلے میں کہتے ہیں۔

"لہٰذا ہم لوگ جو اِس قسم کے مشاہدات اور تجربات سے محروم ہیں ہمیں کسی ایسے منہاج تحقیق کی ضرورت ہے جس سے اِن غیر معمولی تجربات اور مشاہدات کی حقیقی ماہیت اور کنہ دریافت ہو سکے۔ مشہور عرب مورخ ابنِ خلدون جو تاریخ جدید کے علمی مطالعہ کا موسس ہے پہلا شخص تھا جس نے نفسیات کے اس پہلو میں نہایت گہرے غور و فکر سے کام لیتے ہوئے وہ تصور قائم کیا جسے آج کل نفس تحت الشعور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔"۱۷۷

خلاصہ کلام یہ کہ علامہ اقبال نے کئی اہم مسائل میں ابنِ خلدون کی بصیرت افروز تحریروں سے استفادہ کیا ہے اور ابنِ خلدون کو "مسلم تہذیب و تمدن کا سب سے زیادہ روشن اور تابناک مظہر" کے لقب سے یاد کیا ہے۔

☆☆☆

المقری

مشہور مورخ اور عالم جس نے مسلمانانِ اندلس کی آٹھ سو سالوں کی سیاسی و ادبی تاریخ کئی جلدوں میں مرتب کی۔ اس کا پورا نام احمد بن محمد بن احمد بن یحییٰ عبدالرحمٰن بن ابوالعیش بن محمد بن ابوالعباس بن محمد بن احمد بن ابوبکر بن یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن ابوبکر بن علیؓ تھا۔

یہ دسویں صدی ہجری کے آخر میں تلمسان میں پیدا ہوا۔ فاس اور مراکش میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اندلس سے دلچسپی ہونے کی بنا پر اُس نے اِس خطرناک دور میں اندلس کا سفر بھیس بدل کر کیا جب عیسائی اندلسی مسلمانوں پر ظلم و ستم کر رہے تھے۔ اس وقت اندلس میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اس کے علاوہ وہ مسلمان بھی تھے جو بظاہر عیسائیت اختیار کر چکے تھے۔ وہ ۱۰۲۸ھ میں قاہرہ گیا اور ۱۰۴۱ھ میں وہیں فوت ہو گیا۔

اس نے اندلس پر ایک بہت عمدہ کتاب ''نفح الطیب'' کے نام سے لکھی ہے جو اندلسی مسلمانوں کی علمی اور عملی کاوشوں کا مرقع ہے۔ تاریخی حالات کے علاوہ اس میں تقریباً ۱۳۴۰ ادباء اور شعراء کا مکمل تذکرہ موجود ہے جسے اس نے نہایت احتیاط اور جستجو سے مرتب کیا۔ گویا یہ تصنیف اندلس کے عروج و زوال کی ایک مکمل داستان ہے۔ ۱۷۸

علامہ اقبال نے جو نظم ''عبدالرحمٰن اول کا کھجور کا بویا ہوا پہلا درخت'' کے عنوان سے لکھی ہے وہ المقری کی کتاب کے مطالعے کے بعد لکھی تھی۔ چنانچہ بالِ جبریل میں اِس کا حوالہ بھی دیا ہے۔

المقری نے غرناطہ کے آخری بادشاہ ابوعبداللہ کی اولاد کو خود بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

''اس سلطان کی اولاد آج تک فاس میں موجود ہے۔ چنانچہ اب یعنی ۱۰۳۷ھ تک ان کی اولاد و ذریات کو فاس میں دیکھتا ہوں ان کو فقراء اور مساکین کے اوقاف سے مدد دی جاتی ہے اور شہر کے بھکاریوں میں اُن کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ۱۷۹

علامہ اقبال کو ایک دفعہ فقیر سید وحید الدین نے المقری کی تاریخ سے ایک یہودی پیغامبر کا ایک واقعہ سنایا جو خلیفہ المستنصر کے دربار میں حاضر ہوا۔ فقیر وحید الدین بہ روایت المقری ''جب وہ ایک پرشکوہ محل کے انتہائی دلکش اور جاذب نظر حصوں سے گزرتا ہوا اپنے آقا

کا پیغام لے کر میں خلیفہ المستنصر کے وزیر باتدبیر کی خدمت میں پہنچا تو گرد و پیش کے ماحول سے اس قدر مرعوب ہو چکا تھا کہ مسلمان وزیر نے یہودی قاصد سے اس کا سبب پوچھ ہی لیا۔ یہودی قاصد جو محل کے صدر دروازے پر ایک مہیب صورت دربان کے پاس سے گذر کر آیا تھا گویا ہوا کہ اس شاندار محل میں جو خوبصورت باغات اور حسین نظارے موجود ہیں ان کی بنا پر میں اِسے بہشت سے تعبیر کرتا اگر دروازے پر ہیبت صورت دربان کی بجائے رضوان ہوتا۔'' وزیر نے یہودی ملاقاتی کا یہ تبصرہ خلیفہ المستنصر تک پہنچایا تو خلیفہ نے برجستہ جواب دیا کہ ''اگر دروازے پر رضوان ہوتا تو اُسے بہشت میں کب داخل ہونے دیتا۔'' میں نے ایک دِن ڈاکٹر صاحب کو المقری کی تاریخ میں پڑھا ہوا یہ واقعہ سنایا تو بہت محظوظ ہوئے۔ اور جب تک اس واقعہ کو سناتا رہا لطف لیتے رہے۔ اپنی بات ختم کر چکا تو انہوں نے فرمایا!

''المقری نے اسپین کی شاہکار تاریخ مرتب کرنے میں جو زبردست محنت اور کاوش کی ہے مسلمانوں کو اُسے کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔'' ۱۸۰

☆☆☆

حواشی

(۱) نذیر نیازی ''اقبال کے حضور'' اقبال اکادمی لاہور ۱۹۸۱ء۔ص۔۱۷۳

(۲) ابواللیث صدیقی ''ملفوظاتِ اقبال'' اقبال اکادمی لاہور۔ ۱۹۷۷ء۔ص۔۴۷

طارق بن زیاد

(۱)

(۲) ریاست علی ندوی، تاریخ اندلس معارف اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۰ء۔ص۔۷۱

(۳) اقبال ''پیامِ مشرق'' در مطبع کریمی واقع لاہور سن ندارد۔ص۔۱۱۱

(۴) اکبر شاہ نجیب آبادی۔ تاریخ اسلام حصہ سوم نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۵۷ء۔ص۔۲۴

(۵) ذوالفقار جنگ، خلافتِ اندلس۔ مقبول اکیڈمی لاہور۔ سن ندارد۔ص۔۷

(۶) ریاست علی ندوی۔ص۔۷۲

(۷) اقبال ''کلیات اقبال'' شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۸۴ء۔ص۔۳۵۷

(۸) شیخ عطااللہ، اقبال نامہ جلد دوم۔ شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۵۱ء ص۔۳۲۱۔۳۲۲

(۹) مبین الدین احمد ندوی، تاریخ اسلام حصہ سوم معارف اعظم گڑھ۔ ۱۹۴۸ء۔ص۔۱۵۹

عبدالرحمٰن الداخل

(۱۰) رائن ہارٹ ڈوزی۔ ''عبرت نامہ اندلس'' ترجمہ مولوی عنایت اللہ دہلوی مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۶۳ء۔ صل ۳۱۶

(۱۱) ایضاً۔ص۔۳۲۴

(۱۲) محمد یوسف ڈاکٹر سہ ماہی اقبال کراچی اکتوبر۔ ۱۹۶۸ء ص۔۲۰

(۱۳) ایضاً۔ص۔۱۹ (۱۴) ایضاً۔ص۔۱۶

(۱۵) امین اللہ وشیر، ثقافت لاہور، ستمبر ۱۹۶۷ء۔ص۔۶

(۱۶) اقبال بانگ درا۔ص

(۱۷) ایضاً۔ بال جبریل۔ص۔

(۱۸) اقبال۔ بال جبریل۔ص۹۶

(۱۹) احسان الحق سلیمانی مسلمان یورپ میں۔ قومی کتب خانہ لاہور ۱۹۵۴ء۔ص۔۵۶

(۲۰) ایضاً۔ص۔۔۵۶

(۲۱) میری میڈ، تاریخ اندلس۔ مترجم سید محمد احمد علی گڑھ۔ ۱۸۹۸ء ص۔۸

(۲۲) ایضاً۔ص۔۸

(۲۳۔۲۴) اقبال بالِ جبریل۔ص۔۱۳۹۔۱۳۸

ابنِ حزم

(۲۵) شبلی نعمانی۔ مقالات شبلی۔ جلد ششم۔ معارف اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۵ء ص۔۳۵

(26) T. B. Irving. Islamic Revewal in Ibaria and Latin America. (Islamic Research Institute Islamabad December 1991. Page. 104

(۲۷) ابوالقاسم صاعد بن اندلسی ''طباعت الامم'' ترجمہ قاضی احمد میاں اختر (جونا گڑھی) دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۲۸ء ص۔۱۲۸۔۱۲۷

(۲۸) عبداللہ اثری دانشوران اندلس، مکتبہ دین و دنیا لاہور سن ندارد۔ص۔۳۹۱

(۲۹) ایضاً۔ص۔۳۹۳

(۳۰) ابنِ حزم الملل والنحل ترجمہ عباداللہ عمادی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ ۱۹۴۵ء۔ ص۔۵۹۱

(۳۱) ایضاً۔ص۔۵۹۵

(۳۲) محمد اقبال فلسفہ عجم مترجم میر حسن الدین نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۲ء ص۔۸۶

(۳۳) ایضاً۔ص۔۷۷ (۳۴) ایضاً۔ص۔۷۹

(۳۵) ایضاً۔ص۔۲۳۵

(۳۶) محمد اقبال جدید الٰہیاتِ اسلامیہ۔ ترجمہ نذیر نیازی بزم اقبال لاہور۔ ۱۹۵۸ء ص۔

(۳۷) ایضاً۔ص۔۵۵۔۵۴ (۳۸) ایضاً۔ص۔۹۱۔۹۰

(۳۹) ایضاً۔ص۔۹۱۔۹۲ (۴۰) ایضاً۔ص۔۲۳۴

(۴۱) ایضاً۔ص۔۱۰۵۔۱۰۴

(۴۲) اقبال، مقالاتِ اقبال، مرتبہ عبدالواحد معینی، آئینہ ادب۔ لاہور، ۱۹۸۲ء۔ ص۔ ۲۸۹۔۲۹۰

(۴۳) ابنِ حزم، ص۔۱۰ (۴۴) عبدالودود معینی، مقالاتِ اقبال ص۔۳۹۳

(۴۵) عبدالودود معینی، ص۔۳۹۴۔۳۹۳ (۴۶) ابنِ حزم۔ ص۔۱۰

(۴۷) اقبال

معتمد بن عباد

(۴۸) لسان الدین ابن الخطیب الاحاطہ فی الاخبار غرناطہ سید احمد ندوی۔ نفیس اکیڈمی کراچی سن ندارد۔ ص۔۱۹۸

(۴۹) رائن ہارٹ ڈوزی عبرت نامہ اندلس۔ ص۔۱۰۸۰

(۵۰) ابن الخطیب حصہ دوم۔ ص۔۱۱۴ (۵۱) ایضاً۔ ص۔۱۱۱۔۱۱۰

(۵۲) ایضاً۔ ص۔۱۱۹۔۱۱۸ (۵۳) رائن ہارٹ۔ ص۔۱۱۴۷

(۵۴) ایضاً۔ ص۔۱۱۴۹

(۵۵) علی ادھم المعتمد بن عباد طبع اول، مصر، ص۔۳۰۴۔۳۰۳

(۵۶) اقبال بالِ جبریل۔ ص۔۱۳۷

(۵۷) ابن الخطیب اخبار غرناطہ، حصہ دوم۔ ص۔۱۳۱۔۱۳۰

الطرطوسی

(۵۸) المنجد فی الادب والعلوم الشرق والغرب الطبقہ الکاتولیکیہ بیروت۔ ۱۹۲۷ء۔ ص۔۳۲۰

(۵۹) عبداللہ اثری ص۔

(۶۰) اقبال مقالات اقبال مرتبہ عبدالواحد معینی۔ ص۱۴۰

(۶۱) علی عباس جلال پوری اقبال کا علم الکلام، مکتبہ فنون لاہور۔ ۱۹۷۲ء۔ ص۔۱۵۴

محمد ابن تومرت

(۶۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد اوّل۔ ص۔۴۴۴

(۶۳) ایضاً۔ ص۔۴۴۵

(۶۴) اقبال تشکیل جدید ص۔۲۴ (۶۵) ایضاً۔ ص۔۲۴۹۔۲۴۸

(۶۶) ایضاً۔ ص۔۲۳۵۔۲۳۴ (۶۷) ایضاً۔ ص۔۲۳۵

قاضی عیاض

اقبال، اکتوبر ۱۹۹۲، جنوری ۹۴۔ ص ۹۷۔ مضمون نگار محمد ریاض۔ اقبال اور عقاید توحید و رسالت۔

(۶۸) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ص۔

(69) Iqbal, the Development of Metaphysics in Perisa Bazme. Iqbal. lahore. 1964. Page 61

(۷۰) اقبال، تاریخ تصوف ترتیب وحواشی صابر کلوروی مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور۔ ۱۹۷۸ء

(۷۱) رحیم بخش شاہین ڈاکٹر نظم صقلیہ (ابنِ بدون جزیرہ سسلی) کے ایک بند کی تشریح اقبالیات لاہور، جنوری مارچ ۱۹۹۳ء

(۷۲) اقبال بانگِ درا۔ ص۔۱۴۳

(۷۳) ظہور احمد اظہر ڈاکٹر مرتبہ صقلیہ پر ایک نظر۔ بزم اقبال لاہور، ۱۹۹۲ء۔ ص ۸۸

(۷۴) ایضاً۔ ص۔۹۰

(۷۵) ڈاکٹر ظہور احمد اظہر صاحب نے لکھا، کہ اس قصیدے کی شرح ایک فرانسیسی مستشرق نے حواشی کے ساتھ شائع کی ان کو سہو ہوا ہے۔ مستشرق ولندیزی ہے۔ البتہ شرح فرانسیسی میں ہے جو ۱۸۴۶ء میں لندن سے شائع ہوئی۔

(۷۶) رائن ہارٹ ڈوزی۔ ص۔۳۱

شاطبی

(۷۷) ڈاکٹر محمد خالد مسعود نے شاطبی کے بارے میں لکھا ہے کہ شاطبہ شاطبی کی پیدائش سے پہلے ہی عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اس لیے ان کا نام شاطبی نہیں ہو سکتا۔ صدیوں پہلے وہ مسلمان جو بخارا اور گیلان سے ہندوستان آئے وہ آج بھی گیلانی اور بخاری کہلاتے ہیں۔ اسلئے شاطبہ سے ان کو نسبت ہو سکتی ہے۔

(۷۸) محمد خالد مسعود ڈاکٹر، فکر و نظر اندلس نمبر تحقیقات اسلامی اسلام آباد۔ ۱۹۹۱ء۔ ص ۵۴۵

(۷۹) اقبال، تشکیل جدید۔ص۔۲۲۸ (۸۰) ایضاً۔ص۔۲۲۹
(۸۱) ایضاً۔ص۔۲۶۰ (۸۲) ایضاً۔ص۔۲۶۱
(۸۳) ایضاً۔ص۔۲۶۱ (۸۴) محمد خالد مسعود، فکر و نظر، ص۔۵۴۱

ابنِ رشد

(۸۵) محمد لطفی جمعہ تاریخ ''فلاسفہ اسلام'' مترجم میر ولی الدین، دار الطبع، جامع عثمانیہ، حیدر آباد۔دکن۔۱۹۴۱ء۔ص۔۱۶۰
(۸۶) شبلی نعمانی ''ابن رشد'' مقالات شبلی حصہ اول جلد پنجم صارف اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء۔ص۔۳۸
(۸۷) عبداللہ اثری۔ص۔۱۳۱۔۱۳۰ (۸۸) شبلی نعمانی۔ص۔۳۹
(۹۰) عبداللہ اثری۔ص۔۲۵۰ (۹۱) شبلی نعمانی۔ص۔۴۰
(۹۲) ریناں ساں ابنِ رشد و فلسفہ ابنِ رشد مترجم۔مولوی معشوق حسین تخلیقات لاہور، ۱۹۹۳ء۔ص۔۱۲
(۹۳) ایضاً۔ص۔۲۵۰ (۹۴) اقبال تشکیل جدید۔ص۔۵۰۶
(۹۵) نذیر نیازی اقبال کے حضور۔ص۔۳۰۵
(۹۶) اقبال فلسفہ عجم۔ص۔۴۷ (۹۷) اقبال کلیاتِ اقبال۔ص۔۶۶۲
(۹۸) علی عباس جلال پوری اقبال کا علم الکلام۔ص۔۱۸۳
(۹۹) ایضاً۔ص۔۱۸۶ (۱۰۰) اقبال تشکیل جدید۔ص۔۱۸۶
(۱۰۱) علی عباس جلال پوری۔ص۔۱۹۰
(۱۰۲) اقبال تشکیل جدید۔ص۔۱۸۵۔۱۸۴
(۱۰۳) جیمز کیرٹزیک، ''ربیلی وائنڈر، ''دنیائے اسلام'' مترجم سید ہاشمی فرید آبادی۔مقبول اکیڈمی لاہور۔۱۹۶۴ء۔ص۔۲۰۳
(۱۰۴) ایضاً۔ص۔۲۰۲ (۱۰۵) اقبال تشکیل جدید۔ص۔۱۶۹
(۱۰۶) ایضاً۔ص۔۱۶۹
(۱۰۷) اقبال مقالاتِ اقبال مرتب عبدالواحد معینی۔ص۔۳۷۵

موسیٰ ابنِ میمون

(۱۰۸) آرنلڈ میراثِ اسلام مترجم علم الدین سالک مجلس ترکی ادب لاہور، ۱۹۶۰ء ص۔۲۷۳
(۱۰۹) اولیری، فلسفہ اسلام، ترجمہ احسان احمد بی اے نفیس اکیڈمی کراچی۔ص۔۳۳۳
(۱۱۰) عبداللہ اثری۔ص۔۳۷۳
(۱۱۱) عطاء اللہ شیخ مرتبہ اقبال نامہ۔حصہ اوّل، شیخ محمد اشرف لاہور۔۱۹۵۱ء۔ص۔۱۵۶
(۱۱۲) ایضاً۔ص۔۳۷
(۱۱۳) یہاں علامہ اقبال سے سہو ہوا ہے۔کتاب کا اصلی نام۔''دلالۃ الحائرین'' ہے۔

ابوالمعالی

(۱۱۴) اقبال تشکیل جدید۔ص۔۱۰۴۔۱۰۳
(۱۱۵) عطا الشیخ، اقبال نامہ، حصہ اول۔ص۔۱۳ (۱۱۶) ایضاً۔ص۔۲۱۴
(۱۱۷) وحید الدین فقیر روزگار فقیر۔جلد دوم آتش فشاں پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء ص۔۳۶۱

ابنِ عربی

(۱۱۸) ابوسعید نور الدین، اسلامی تصوف اور اقبال۔اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۵۹ء۔ص۔۱۱۶
(۱۱۹) علی عباس جلال پوری، کتاب مذکور۔ص۔۷۹
(۱۲۰) اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد اول۔ص۔۶۰۹
(۱۲۱) ایضاً۔ص۔۶۰۹ (۱۲۲) ایضاً۔ص۔۶۰۹
(۱۲۴) علی عباس جلال پوری، کتاب مذکور۔ص۔۸۲۔۸۱
(۱۲۵) ایضاً۔ص۔۸۸
(۱۲۶) ابن عربی ''فصوص الحکم'' مترجم عبدالقدیر صدیقی، نذیر سنز پبلشرز لاہور۔سن ندارد۔ص۔۶۱۲
(۱۲۷) احسان الحق سلیمان ''مسلمان یورپ میں''ص۔۱۹۲
(۱۲۸) بشیر احمد ڈار، انوار اقبال۔ص۔۱۷۸ (۱۲۹) اقبال فلسفہ عجم۔ص۔۱۴
(۱۳۰) علامہ عرشی، ''آپس کی باتیں'' ادبی دنیا مئی ۱۹۶۵ء۔ص۔۱۲۶
(۱۳۱) بشیر احمد ڈار (انوار اقبال)۔ص۔۱۷۹

(۱۳۲) یوسف سلیم شرح اسرار خودی، دیباچہ اسرار خودی۔ص۔۸۱،۸۲،۸۳

(۱۳۳) نذیر نیازی سید اقبال کے حضور میں۔ص۔۲۶۳

(۱۳۴) ایضاً۔ص۔۳۲۱

(۱۳۵) تنویر کوثر قومی زبان کراچی، اپریل ۱۹۷۷ء۔ص۔۴۳

(۱۳۶) اقبال مقالات اقبال۔ص۔۲۱۳ (۱۳۷) ایضاً۔ص۔۲۱۵

(۱۳۸) تنویر کوثر قومی زبان کراچی، ص۔۴۳

(۱۳۸۔الف) نقد اقبال، میکش اکبر آبادی ص ۷۰

(۱۳۹) عطاءاللہ شیخ اقبال نامہ حصہ اوّل۔ص۔۴۵

(۱۴۰) ایضاً۔ص۔۱۷۸ (۱۴۱) ایضاً۔ص۔۱۸۰

(۱۴۲) اقبال تشکیل جدید۔ص۔۲۸۲۔۲۸۱

(۱۴۳) ایس ایم فاروق۔طواسین اقبال۔ص ۲۰۷

(۱۴۴) اقبال مقالات اقبال۔ص۔۳۳۳

(۱۴۵) عبدالمجید سالک، ذکر اقبال۔ص۔۱۵۱

(۱۴۶) ابنِ عربی۔کتاب مذکور۔ص۔۱۸ (۱۴۷) ایضاً۔ص۔۴۲۵

(۱۴۸) اقبال کلیات فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔۱۹۷۵ء۔ص۔۱۳۷۔۱۷۷

(۱۴۹) اقبال، ضرب کلیم، نظم 'تقدیر' ص۔۴۳۔۴۲

(۱۴۹)(۱) اقبال کلیات اقبال۔ص۔۴۹۔ (۲) ایضاً۔ص۔۲۱۷

(۳) اقبال، کلیاتِ اقبال۔ص۔۴۳۶،۱۴۹۔ (۴) ایضاً۔ص۔۶۵۲۔۶۵۱

(۱۵۰) نذیر نیازی اقبال کے حضور۔ص۔۳۶۲

(۱۵۱) ایضاً۔ص۔۳۰۳۔۳۰۲

(۱۵۲) مسعود منور۔ماہ نو۔جون ۱۹۷۶ء۔ص۔۱۷

(۱۵۲۔الف): ڈاکٹر سید عبداللہ، شیخ اکبر اور اقبال ص ۵۔مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور

(۱۵۲۔ب) ڈاکٹر سید عبداللہ، شیخ اکبر اور اقبال ص ۱۰۔مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور

ابنِ خلدون

(۱۵۳) پورا نام الوزیر الرائیس محاجب الصدر الفقیہہ الجلیل علامہ الامت امام الائمہ حامی الاسلام والمسلمین قاضی القضاۃ ولی الدین ابوزید عبدالرحمٰن بن شیخ الامام ابی عبداللہ محمد ابن خلدون نڈوزی نے خلدون نام کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ اندلس میں عرب خاندان والے اپنے میں سے کسی نام کو لے کر واؤ۔نون بڑھا دیتے تھے۔جو تکبر کی غرض سے ہوتا تھا۔خالد حفص بدر سے (خلدون، بدروں، خفصون) خالد اکبر، حفصِ اعظم اور بدر اعظم مراد ہے۔تفصیل کے لیے دیکھئے کتاب افکار ابنِ خلدون از حنیف ندوی ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور۔۱۹۷۴

(۱۵۴) ابنِ خلدون مقدمہ مترجم مولوی عبدالرحمٰن کار پردازان وطن لاہور، ۱۹۳۲ء۔ص۔۴

(۱۵۵) ایضاً۔ص۔۷

(۱۵۶) اشفاق حسین مقامِ اقبال ادارہ اشاعت حیدر آباد دکن۔طبع اول۔۱۹۴۵ء۔ص۔۳۶

(۱۵۷) اقبال بال جبریل کپور آرٹ، پرنٹنگ پریس۔سن ندارد۔ص۔۱۷۱

(۱۵۸) اقبال بانگِ درا۔ص۔۱۶۳

(۱۵۹) اقبال

(۱۶۰) اقبال تشکیل جدید۔ص۔۲۱۶

(۱۶۱) ایضاً۔ص۔۲۱۳

(۱۶۲) ایضاً۔ص۔۲۱۶

(۱۶۳) ایضاً۔ص۔۲۱۲

(۱۶۴) عبدالواحد مقالات۔ص۔۱۲۸۔۱۲۷

(۱۶۵) اقبال تشکیل جدید۔۲۴۴۔۲۴۳

(۱۶۶) عبدالواحد مقالات اقبال۔ص۔۱۲۸

(۱۶۷) اقبال تشکیل جدید۔ص ۳۲۲۔۳۲۱

(۱۶۸) اقبال ضرب کلیم۔ص۔۴۴

(۱۶۹) اقبال ارمغان حجاز۔ص۔۷۹

(۱۷۰) اقبال تشکیل جدید۔ص۔۳۴۶
(۱۷۱) بشیر احمد ڈار انوار اقبال۔ص۔۱۴۴
(۱۷۲) اقبال تشکیل جدید۔ص۔۲۵۔۲۴
(۱۷۳) ایضاً۔ص۔۲۶
(۱۷۴) ایضاً۔ص۔۱۹۵
(۱۷۵) ایضاً۔ص۔۱۹۴
(۱۷۶) ایضاً۔ص۔۱۴۵
(۱۷۷) ایضاً۔ص۔۲۹۵

المقری

(۱۷۸) احسان الحق سلمانی مسلمان یورپ میں۔ص۔۱۷۱
(۱۷۹) لین پول ص۔۳۳۴
(۱۸۰) وحید الدین فقیر روزگار فقیر جلد اول۔ص۔۹۶۔۹۷

پانچواں باب

اندلس اور کلام اقبال

دنیا کی تاریخ میں جس طرح اندلس کا تاریخی اور تہذیبی عروج و زوال ایک علیحدہ رتبے کا حامل ہے۔ اسی طرح اقبال کے ہاں اندلس کا ایک خاص مقام ہے۔ اور ان کی اندلسی شاعری تو خود علامہ اقبالؒ کی اپنی شاعری کے لیے باعث فخر ہے۔ جو اندلس سے خصوصی لگاؤ کی بنا پر عالم وجود میں آئی۔ اقبال نے یوں تو اپنے کلام میں کئی ممالک کا ذکر کیا ہے، لیکن غالب ذکر اندلس سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں بانگِ درا میں مختلف مقامات پر اشعار بالِ جبریل کی نظمیں دعا، مسجد قرطبہ، قید خانے میں معتمد کی فریاد، عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت، سرزمینِ اندلس میں، ہسپانیہ، طارق کی دعا، اندلس کے میدان جنگ میں۔" اس کے علاوہ ضربِ کلیم، اسرار و رموز، اور باقیات اقبال میں بھی اندلس کے بارے میں اشعار ہیں۔ یوں تو اقبال کی ساری شاعری گوناگوں فکری فنی اور لفظی خصوصیات کی حامل ہے۔ لیکن اقبال کی اندلسی شاعری خاص طور پر فن کی بلندیوں پر ہے۔ اس میں محسنات شعر کا استعمال انتہائی فنکارانہ طریق اور ہنرمندی سے کیا گیا ہے۔

یہاں اندلس کے بارے میں اقبال کے کلام کو اجمالی تنقید و تبصرے اور زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

گوش بر آواز تھا مغرب کبھی جس کے لیے
وہ صدا پھر اس زمانے کو سنا سکتا ہوں میں
ناز تھا جس پر کبھی غرناطہ و بغداد کو
پھر وہی محفل زمانے کو دکھا سکتا ہوں میں

علم کا محبوب رونق بخش کاشانہ تو ہو — انجمن اپنی مثال بزم جانانہ تو ہو
پھر سماں بندھ جائے گا غرناطہ و بغداد کا — پھر ذرا بھولا ہوا تازہ وہ افسانہ تو ہو
یادگار فاتحانِ ہند و اندلس ہو تمہیں — شانِ شاہانہ نہ ہو میری امیرانہ تو ہو

انجمن حمایت اسلام کا سترھواں سالانہ جلسہ ۲۱، ۲۲، ۲۳ فروری ۱۹۰۲ء کو اسلامیہ کالج لاہور کے صحن میں ہوا۔ اقبال نے ۲۲ فروری کو اپنی نظم بعنوان، خیر مقدم، اور نظم "دین اور دنیا" پڑھیں۔ ۲۳ فروری کو نظم اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے پڑھی۔[۲] اس نظم کے کل نو بند ہیں۔ ہر بند کا آخری شعر فارسی میں ہے۔ اور نواں بند تو مکمل فارسی میں ہے۔ آٹھ بند

گیارہ گیارہ اشعار پر مشتمل ہیں۔ اور ایک آٹھواں بند دس اشعار پر کل اشعار اٹھانوے ہیں۔

اس نظم کے چوتھے اور آٹھویں بند میں مذکورہ بالا اندلس سے متعلقہ اشعار ہیں۔ ان اشعار میں خواجہ الطاف حسین حالی کی مسدس کا رنگ جھلکتا ہے۔ حالی تو اسلام کے ماضی کی تہذیبی و تمدنی شوکت کا پرتو دکھاتے ہیں۔ لیکن اقبال تو عکس دکھانے کے علاوہ امید و رجائیت کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اندلس کی ان تہذیبی و ثقافتی اقدار کو جن سے کبھی یورپ بھی مستفید ہوا تھا ان کو آج کے مسلمان بھی دہرا سکتے ہیں۔ اس میں احیائے اسلامیت کا اظہار ہے۔ اور مسلمانوں کے علمی و ادبی سرمائے کو دنیا کے سامنے لانے کا عزم بھی ہے۔

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد — داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر
آسمان نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی — ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی
غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا [۳]

یہ بند اقبال کی نظم صقلیہ سے ہے جو انہوں نے ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپسی پر بحری جہاز سے صقلیہ کو دیکھ کر کہی۔ اس جزیرے پر مسلمانوں نے ۸۲۶ء سے لیکر ۱۰۹۱ء تک حکومت کی اس کے بعد یہ خوبصورت جزیرہ جب نارمنوں کے قبضے میں چلا گیا تو ایک صقلی شاعر اس پر غم کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

لقدرت ارضی ان تعود لقومها — فساء ت ظنونی ثم اصبعت یا لما

بخدا میں نے یہ سوچا تھا کہ میری سرزمین اپنی قوم کے پاس واپس آجائے گی مگر یہ خیال غلط نکلا اب تو میں مایوس ہو چکا ہوں۔

و کیف و قد سمیت ہوانا و میرت — مساجد ها ایدی النصاری کناسا

کیسی تسلی! کیونکہ اس سرزمین کے ساتھ تو ذلت آمیز سلوک کیا گیا ہے اور اس کی مساجد کو کلیساؤں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

اذا شاء ت الرهبان بالضرب انطقت — مع الصبح والا ساء فیها انهواق

پادری اور راہب جب بھی چاہتے ہیں صبح شام ان مساجد میں اذان کی جگہ ناقوس بجانے لگتے ہیں۔[۴]

اقبال کی نظم خوبصورت شاعری کی ساتھ تاریخی اشارات سے مملو ہے۔ یہ ایک نادر و

منفرد تخلیق ہے۔لفظ و معنی کے لحاظ سے ایک شاہکار نظم ہے۔!"[5]

شیراز کے بلبل سے مراد شیخ سعدی ہیں۔جنہوں نے بغداد کے منگولوں کے ہاتھوں تباہی پر مرثیہ کہا۔اور انگریزوں نے جب دلی کو برباد کر دیا[6] تو داغ نے مرثیہ کہا۔اس طرح بنو افطس کی تباہی پر ابن عبدون نے جو مرثیہ کہا اقبال اسے ابن بدروں اور غرناطہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔) ابن بدروں نے اس کی شرح لکھی ہے۔اس کا ذکر علامہ اقبال اس بند میں بھی کرتے ہیں۔کہ ان بلاد و امصار کی تباہی و بربادی پر تو مرثیے ہو چکے ہیں لیکن تیرا مرثیہ کسی نے نہیں کہا تھا اس لیے میں تیرا مرثیہ کہہ رہا ہوں۔(بہت سے شاعروں نے مرثیے کہے تھے جن میں ابن حمدیس صقلی کے کچھ اشعار اوپر درج کیے گئے ہیں۔اس نظم میں آہ و زاری سوز و غم نمایاں ہے۔

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدہ مسلم کا نور ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمع طور
بجھ کے بزم ملتِ بیضا پریشان کر گئی اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
قبر اس تہذیب کی یہ سرزمین پاک ہے
جس کی تاک گلشنِ یورپ کی رگ نمناک ہے [8]

یہ بند اقبال کے مجموعہ کلام بانگِ درا کے حصہ سوم کی پہلی نظم بلاد اسلامیہ سے ہے۔اس نظم میں اقبال مختلف اسلامی ممالک کے بارے میں شاعرانہ جمال کے ساتھ مسلمانوں کی شاندار تہذیب و ثقافت اور اسلامی میراث کا ذکر کرتے ہیں۔دلی، بغداد، قرطبہ، قسطنطنیہ کی پوری ملّی و تہذیبی تاریخ بیان کرنے کے بعد مدینۃ النبی کی طرف آتے ہیں۔

وہ زمین ہے تو مگر اے خوابگاہِ مصطفیٰؐ
دید ہے کعبہ کو تیری حجِ اکبر سے سوا [9]

اندلس میں مسلمانوں نے آٹھویں صدی عیسوی سے لیکر سولہویں صدی عیسوی تک تہذیبی و ثقافتی، عملی و سائنسی اور فکری ترقی سے یورپ کو جس طرح روشناس کروایا۔اقبال ان اشعار میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔انہوں نے مسلمانوں کے اس کارنامے کا اظہار جگہ جگہ اپنے خطوط، مقالات، خطبات اور اشعار میں کیا ہے کہ یورپ کی اس ترقی کی اساس مسلمانوں نے ہی مہیا کی تھی۔اگرچہ اندلس سے مسلمانوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔لیکن سارا یورپ ان کے ہی زیرِ احسان ہے۔اس بند میں یورپ میں اسلامی میراث اور اس کے اثرات کی معنی آفرین اور واقعاتی تصویر کشی کی گئی ہے۔

شوکت شام و فر بغداد رفت سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت (۱۹)

اقبال نے اسرارِ خودی کے اس شعر میں اسلامی شان و شوکت اور جاہ و جلال کی وہ تاریخ بیان کی ہے جو اب ماضی کا حصہ بن چکی ہے۔یہ موضوع اگرچہ یاس اور ناامیدی کا ہے۔لیکن اِقبال نے اس کو بھی سعی اور جدوجہد کے لیے استعمال کیا ہے۔کہ یہ زمانہ دوبارہ بھی آ سکتا ہے۔اور مسلمان دنیا کی سرداری اور راہنمائی کر سکتے ہیں۔اقبال ملّت کے زوال کے آثار سے ہی عروج کا پہلو نکالتے ہیں۔

سطوتِ غرناطہ ایک معنی خیز اور تاریخی تلمیح ہے۔ڈھائی صدیوں تک یورپ کی طاقتوں کا مقابلہ کوئی آسان بات نہ تھی۔اگر مسلمانانِ غرناطہ باہم برسرِ پیکار نہ ہوتے تو غرناطہ سے کبھی نہ نکلتے۔

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا
باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
اے گلستانِ اندلس وہ دِن ہیں یاد تجھ کو تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

اقبال کی یہ نظم بہت اہم ہے۔اِن کے ترانہ ہندی سے ترانہ ملی کی طرف فکر کی تبدیلی کی غمازی کرتی ہے۔دو صدی پیشتر یورپ نے عالمِ اسلام کو تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی سطح پر دبا لیا تھا۔لیکن بیسویں صدی کے اوائل سے ہی مسلمان نشاۃ ثانیہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔اس جنگ میں اقبال کا حصّہ بھی بہت نمایاں ہے۔مسلمانوں کو یہ باور کرانے کے سلسلے میں ان کے اسلاف بھی دنیا میں طاقت و سطوت کے مالک تھے۔بہادری، دلیری اور بے خوفی ان کا جوہر تھا۔اقبال کا عسکری آہنگ والا کلام جوشِ ایمان کا مظہر ہے۔"تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں" میں مسلمانوں کی سپاہیانہ اور مجاہدانہ صفات کو پیش کیا گیا ہے۔ان اشعار میں بھی اندلس کے حوالے سے وہاں کے مسلمانوں کی قوت اور عظمت و شان بیان کی گئی ہے۔اور ساتھ ہی یہ بتایا ہے کہ اے اندلس! تو کبھی ہمارا گھر تھا۔اِن اشعار میں الفاظ کا زیر و بم اور موسیقیت ہے۔جس میں اگر ایک طرف ٹھہراؤ ہے تو دوسری طرف صوری اور معنوی لحاظ سے رجز کی شکل ہے۔جس میں احساساتی اور کیفیاتی تصویریں ایک کے بعد دوسری سامنے آتی ہیں۔

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں ! خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی ۱۱

یہ اس نظم کے چند اشعار ہیں جو انجمن حمایت اسلام لاہور کے چھبیسویں سالانہ جلسے میں پڑھی گئی جو اپریل ۱۹۱۱ء کو ریواز ہاسٹل اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں منعقد ہوا تھا۔

اس وقت عالم اسلام پر پے در پے مصیبتیں نازل ہو رہی تھیں۔ عثمانی خلافت کے کئی علاقے برطانوی تسلط میں تھے۔ ایران پر روس اور برطانیہ کا اثر تھا۔ عرب ترکوں کے خلاف برسر پیکار ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ہندوستان کے مسلمان کانگرس کے زیر اثر تھے۔ یا انگریزوں کے ساتھ تھے۔ تقسیم بنگال کی منسوخی سے یہی مسلمان آزردہ تھے۔ ایسے وقت میں اقبال نے ان کو ماضی کی شاندار روایات دکھا کر انہیں امید کی کرن دکھائی اور کہا کہ اس دنیا میں چشم فلک نے ایسا پرشکوہ اور شاندار نظارہ کم ہی دیکھا ہوگا۔ جب اللہ کی عظمت و بلندی اور اسلام کے پیغام کو دُنیا کے دور دور کے خطوں میں پہنچانے کے لیے مسلمان زمین اور سمندر میں معرکہ آرا تھے۔ ''دی اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں'' یہ اس زمانے کی طرف اشارہ ہے جب مسلمان سپین، فرانس، سوئٹزرلینڈ، مشرقی جرمنی، سسلی اور روما کے عیسائی ملکوں میں اذانیں دے رہے تھے۔ یورپی سفیر اندلس کے درباروں کی شان و شوکت سے ششدر رہ جاتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کو مختلف غیر مسلم بادشاہوں کے درباروں کا جاہ و جلال کبھی مرعوب نہیں کرتا تھا۔ ان اشعار میں ایجاز و اختصار ہے۔ تاریخ کے نہایت اہم واقعات کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان مسلمانوں کو اللہ کا ہی ڈر ہوتا تھا، کسی بادشاہ یا شہنشاہ کا کوئی خوف نہ تھا۔ وہ اپنے دست و بازو پر ہی بھروسہ کرتے تھے۔ ان مصرعوں میں شوکت بیان ہے۔ ماضی کی تصویریں اور مستقبل کی تعبیریں ہیں۔

(قرطبہ میں لکھے گئے)

یہ حُورِ بیاں فرنگی ، دِل نظر کا حجاب بہشت مغربیاں جلوہ ہائے پابرکاب!
دِل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب!
جہانِ صوت و صدا میں سما نہیں سکتی لطیفۂ ازلی ہے فغانِ چنگ و رباب!
سکھا دیئے ہیں اسے شیوہ ہائے خانگی فقیہہ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب!

وہ سجدہ روحِ زمین جس سے کانپ جاتی تھی اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
سُنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب!
ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا مری نوا میں ہے سوز و سُرور عہدِ شباب! ۱۳

یہ غزل قرطبہ میں لکھی گئی ہے۔ اور اس میں اندلس میں مسلمانوں کے اس تاریخی المیے کی طرف بھی اشارے ہیں جس کا ذکر اس شعر میں ہے۔

وہ سجدہ روحِ زمین جس سے کانپ جاتی تھی اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

اس غزل کے ابتدائی اشعار میں قلب و نظر کی رومانی تصویر کشی کی گئی ہے۔ دوسرے اشعار خوبصورتی اور معانی آفرینی میں کمال کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں حسن و عشق کے لطیف جذبات بھی ہیں اور افکار و معانی کے بلند ترین تخیلات بھی۔ لیکن آخر میں وہ اسلامی تاریخ کے عظیم الشان ماضی کا دروازہ کھولتے ہیں کہ آج بھی مسجدِ قرطبہ کے منبر و محراب ان سجدوں کے لیے بے قرار ہیں۔ علامہ اقبال خوبصورت اور لطیف استعاراتی تصویر کشی کو ایک عظیم مقصد کی طرف لے آتے ہیں۔ کہ اسلامی ممالک میں کسی جگہ بھی حقیقی اسلام نہیں ہے۔ اور نہ کسی جگہ عشق کی گرمی اور ایمان کی حرارت ہے۔ قرطبہ کے شہر نے ہی اقبال کو عرفانی رفعت عطا کی۔

ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا میری نوا میں ہے سوز و سرور عہد شباب

☆☆☆

دُعا

(مسجد قرطبہ میں لکھی گئی)

ہے یہی میری نماز ہے یہی میرا وضو — میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
محبت اہل صفا نورو حضور و سرور — سرخوش و پرسوز ہے لالہ لب آ بجو!
راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق — ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو!
میرا نشیمن نہیں درگہِ امیر و وزیر — میرا نشیمن بھی تُو شاخِ نشیمن بھی تُو!
تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبح نشور — تجھ سے مرے سینے میں آتش اللہ ھُو!
تجھ سے میری زندگی سوز و تب درد و داغ — تو ہی مری آرزو تو ہی میری جستجو!
پاس اگر تُو نہیں شہر ہے ویراں تمام — تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کُو!
پھر وہ شرابِ کہن مجھ کو عطا کر کہ میں — ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبُو!
چشم کرم سا قیا دیر سے ہیں منتظر — جلوتیوں کے سبُو خلوتیوں کے کدو!
تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ — اپنے لئے لامکاں میرے لئے چار سُو!
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا — حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رُوبرو! ۱۴

اقبال نے یہ دعائیہ اشعار مسجدِ قرطبہ میں نماز کے بعد قلبی واردات سے سرشار ہو کر آنسوؤں کے ساتھ کہے ہیں۔ اس میں اقبال نے اپنے دِل کے درد اور تڑپ کو بیان کیا ہے۔ اِس دُعا میں اقبال کا ایک فلسفیانہ و مفکرانہ انداز ہے جو صوفی کے روپ میں خدائے بزرگ و برتر کے گھر میں بیٹھ کر اس سے براہِ راست مخاطب ہے۔ ماحول بھی مسجد قرطبہ کا اور آنکھوں کے سامنے آٹھ سو برس کی پوری تاریخ اور زمانہ حال کی تصویر بھی ہے۔ اس میں نئے نئے نکات پیش کئے گئے ہیں۔ جن کا ایک مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کر سکیں۔

اقبال کے اندلس پر باقاعدہ اشعار اسی دعا سے شروع ہوتے ہیں۔ اس کی ابتداء اس فلسفیانہ تمہید سے ہوتی ہے۔ جس میں فلسفہ دعا کی وضاحت ہے۔ کہ دعا ہی نماز اور عبادت ہے اپنے محبوبِ حقیقی کو خلوص کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے پکارا جائے اور اہل صفا کی محبت سے خلوص کی دولت مِل سکتی ہے۔ دعا کی مقبولیت اس وقت ہوتی ہے جب طلب گار کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا پورا یقین ہو۔ اور اقبالؒ کو اس کا یقین بھی ہے۔ کیونکہ ان کی نواؤں میں خلوصِ دِل ہے

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی

اگلے اشعار میں علامہ اقبال خدائے بزرگ و برتر کے حضور عرض کرتے ہیں۔ کہ میں ایک کمزور اور مسکین بندہ ہوں۔ پر میرا میر و وزیر کی درگاہ پر انحصار نہیں ہے۔ میرا تو ہی سہارا اور مددگار ہے۔ میرا سینہ تیرے فضل سے صبح نشور کا مطلع ہے۔ اور اسی بنا پر میرے اندر "اللہ ھُو" کی آگ ہے۔ تیرے فضل و کرم سے مری زندگی سوز و گداز اور کیف و سرور سے مالا مال ہے۔ میری تلاش و جستجو، آرزوؤں اور خواہشوں کا مرکز تو ہی ہے۔ تو اگر میرے پاس نہیں ہے تو میری شعر و ادب کی دنیا ویران ہے۔ اگر تو میرے ساتھ ہے تو میرا اجڑا ہوا نشیمن دنیا بھر کی نعمتوں سے معمور ہے۔

اس سے اگلے اشعار دعائیہ رنگ میں ہیں کہ اے میرے پروردگار میں اپنے گناہوں کے اعتراف کے ساتھ تجھ سے ایمان کی نعمت مانگتا ہوں جو میرے پاس نہیں ہے اے میرے رب میری قوم کے وہ افراد جو دنیاوی کاموں میں معروف ہیں اور جو تنہائی میں تجھے یاد کر رہے ہیں ان پر اپنا لطف و کرم فرما۔ آخری سے پہلے شعر میں اقبال کا لہجہ کچھ شوخ ہو گیا ہے کہ تو نے مجھے تو مکاں کی حدود میں قید کر دیا ہے لیکن اپنے لیے لامکاں رکھا ہے مجھے بھی لامکانی صفت عطا کر۔ آخری شعر میں کہا گیا ہے کہ یہ دعا فلسفہ و شعر کے رموز کے ساتھ تیری بارگاہ میں پیشِ خدمت ہے اور ایک ایسا اظہار ہے جسے روبرو نہیں کہا جا سکتا۔

☆☆☆

مسجد قرطبہ

دنیائے نظم نگاری میں ایک عظیم عالمی شاہکار اور اقبال کے فکروفن کا مکمل نمائندہ فن پارہ ""مسجد قرطبہ" جواندلس اور خاص طور پر مسجد کی زیارت (جس نے انہیں جذبات کی ایسی رفعت پر پہنچا دیا۔ جو پہلے کبھی انہیں نصیب نہ ہوئی تھی۔) کی بدولت وجود میں آیا۔ اس نظم میں جومختلف موضوعات ہیں۔ ان سب کے مرکزی تاثرات کی جھلک اس مسجد میں (جو کعبہ اربابِ فن، سطوت دین مبیں اور جس کی نظیر قلب مسلمان میں ہے۔) دکھائی دیتی ہے۔ جو ابدی ادبِ عالیہ کی محرک ہوئی۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ جامع قرطبہ کی تاریخ بیان کردی جائے۔

اندلس میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ عظیم الشان یادگار ""مسجد قرطبہ" ہے۔ عیسائیوں کے قبضے کے بعد مسجد کے بہت سے خوبصورت حصے تباہ کر دیئے گئے۔ لیکن اب بھی وہ اپنی خوبصورتی اور حسن وجمال کی بنا پر ایسی ہے کہ ایک ہندوستانی سیاح کہتا ہے کہ میں تاج محل کو دنیا کی خوبصورت ترین عمارت سمجھتا تھا لیکن یہ مسجد دیکھ کر میرے نزدیک تاج محل کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ ایک اور سیاح قاضی ولی الدین جو ۱۹۲۴ء میں قرطبہ گیا تھا۔ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔ کہ مسجد باہر سے تو ایک قلعہ کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کی دیوار بھی اتنی خوبصورت نہیں، لیکن جب میں نے دروازے میں قدم رکھا تو محسوس ہوا کہ میں کسی ایسی جگہ پہنچ گیا ہوں، جسے انسانی ہاتھ بنا نہیں سکتے۔ اور اگر میں آگے بڑھ کر ستون کا سہارا نہ لے لیتا تو میں مسجد کی شان وشوکت اور خوبصورتی دیکھ کر بے ہوش ہو کر گرنے کو تھا۔ پھر لکھتا ہے،"کہ میں نے دمشق، بیت المقدس، حمص، بیروت، قسطنطنیہ، قاہرہ، اسکندریہ، اور طنجہ کی مساجد کی زیارت کی ہے۔ اور بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ کسی مسجد کی آرائش وزیبائش جامع قرطبہ کی پاسنگ کو بھی نہیں پہنچتی۔"[۱۵] غرض اس کے حُسن وجمال اس کے تزئین آرائش نقشی گلکاریوں اور پچی کاری کے کام کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ شاید ہی حضرت انسان اس قسم کی کوئی عمارت تیار کر سکا ہو۔[۱۶]

عبدالرحمٰن الداخل نے اس مسجد کی تعمیر کا آغاز ۱۶۹ھ میں کیا۔[۱۷] مسجد کی تعمیر ابھی جاری تھی کہ الداخل کو موت نے آلیا۔ اس کے جانشین ہشام نے مسجد کی تکمیل کی۔ لیکن ہشام کی وفات کے بعد جو بھی اُموی تاجدار تخت پر بیٹھتا۔ اس مسجد میں کوئی نہ کوئی اضافہ ضرور کر دیتا۔ اور اس کی زیبائش وخوبصورتی ہر دور میں پہلے سے بڑھ جاتی۔ دوسرے لفظوں میں یہ مسجد ۱۶۹ھ سے

شروع ہو کر ۳۹۲ھ تک برابر بنتی اور سنورتی رہی۔ جو مسجد سوا دو سو سال تک بنتی اور سنورتی رہے۔ وہ یقیناً دنیا کی بہترین عمارت ہوگی۔ اس لیے اس کے متعلق المقری نے کہا ہے۔

"قال بعض المورخین لیس فی بلاد الاسلام اعظم منه والعجب بناء واتقن منعة"[۱۸]

شروع میں یہ مسجد ۲۲۵ گز لمبی اور ۲۰۵ گز چوڑی تھی۔ الحکم نے اسے ۳۳۰ گز لمبا کر دیا، ابنِ ابی عامر نے اس کی لمبائی ۴۴۰ گز اور چوڑائی ۲۳۰ گز کر دی، مسجد کی چھت ستونوں پر قائم تھی اور ان کی ترتیب اس وضع پر ہوئی تھی۔ کہ ان کے تقاطع سے دونوں طرف کثرت سے متوازی راستے بن گئے تھے۔ ان ستونوں پر نہایت پرتکلف نعل نما اسپی محرابیں قائم تھیں۔ چھت زمین سے تیس فٹ اونچی تھی، جس کی وجہ سے صاف ہوا اور کافی روشنی مسجد میں داخل ہوتی تھی۔

ابتداء میں مسجد کے نو دروازے تھے۔ بعد میں ان کی تعداد ۲۱ تک پہنچ گئی۔ ۹ دروازے مشرق کی جانب تھے اور ۹ مغرب کی جانب تھے۔ ان میں ہر طرف کے ۸ دروازے مردوں کے لئے مخصوص تھے۔ اور ایک ایک دروازہ عورتوں کے لئے۔ شمال میں تین دروازے تھے۔ جنوب کی طرف خلیفہ کے داخل ہونے کے لیے ایک دروازہ تھا۔ ان دروازوں پر نہایت خوبصورت بیل بوٹے بنائے گئے تھے۔ پیتل کا کام زیادہ تھا۔ جو سورج کی روشنی میں بہت چمکتا تھا۔

مسجد کے ستونوں کی تعداد ایک ہزار دو سو ترانوے (۱۲۹۳) تھی۔ یہ مختلف رنگوں میں تھے۔ سپید بھی سیاہ بھی، نیلگوں بھی۔ یہ ستون سنگ سماق، سنگ رخام اور زبرجد سے بنائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک گندھک کا بھی بنا ہوا تھا۔ ان پر سونے کی مینا کاری، اور جواہرات کی پچی کاری کی گئی تھی۔ جو نہایت دلکش اور دیدہ زیب تھی۔ یہ تمام ستون یوں نظر آتے تھے جیسے دیودار کے درخت ہوں یا پھر کوئی دلفریب نخلستان ہو۔ جس میں ہزارہا کھجور کے درخت ہوں۔ جن کے سیدھے تنے اور ژولیدہ شاخوں کو کسی نے اپنے سحر سے یک لخت پتھر کا بنا دیا ہو۔

ان قطار در قطار درختوں کے متعلق اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

"شام کے صحرا میں جیسے ہو ہجوم نخیل"

سنگ مرمر، سنگ رخام، سنگ موسیٰ اور سنگ سرخ مسجد کے چپہ چپہ کی زینت بنا تھا۔ اس کے علاوہ مسجد کے فرش میں بھی سنگِ مرمر، سنگِ موسیٰ اور سنگ رخام کا استعمال ہوا ہے۔ ہر بادشاہ کا خزانہ مسجد کی تعمیر کے لیے کھلا رہا۔ اس پر بے شمار روپیہ خرچ ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق

دوسوتیس (۲۳۰) سال میں تقریباً پندرہ لاکھ اشرفیاں اس مسجد پر خرچ ہوئیں۔

مسجد قرطبہ کی یوں تو ہر چیز بے حد خوبصورت تھی۔ لیکن اس کے منبر و محراب اپنی مثال آپ تھے۔ محراب سنگِ مرمر کی صرف ایک سل سے بنائی گئی تھی۔ پندرہ فٹ کی یہ سل کسی بہت بڑے ٹکڑے سے کچھ اس طرح کاٹی گئی تھی کہ اس میں جب طرح طرح کے نقش و نگار بنائے گئے تو اس کی مضبوطی میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ محراب کی چھت چار ستونوں پر کھڑی تھی، جن میں سے دو سبز رنگ کے اور دو لاجوردی۔ یہ محراب اپنی صنعت اور کاری گری کے اعتبار سے لاجواب سمجھی گئی ہے۔ اس کے متعلق اسکاٹ لکھتا ہے۔

''مسجد قرطبہ کے محراب ممالک اسلامی اور غیر اسلامی میں اپنی جزئیات اور خاکہ کے لحاظ سے بے مثال ہے، کہیں بھی ایسی کوئی دوسری چیز نہ بن سکی۔''۱۹

محراب میں ایک طرف وہ منبر تھا جو خوشبودار اور قیمتی لکڑیوں کے چھتیس ہزار ٹکڑوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ ان ٹکڑوں کو جوڑنے کے لیے سونے اور چاندی کے کیل لگائے گئے تھے۔ یہ منبر آٹھ کاریگروں نے مل کر سات سال میں مکمل کیا تھا۔ اس کی مزید آرائش کے لیے اس میں جواہرات جڑے گئے تھے۔ اس کے علاوہ مسجد کے فرش میں بھی سنگ موسیٰ، سنگ مرمر اور سنگ رخام کا استعمال ہوا تھا۔

مسجد میں فانوس اور موم بتیوں کی اتنی کثرت تھی کہ رات کو بھی دن کا گمان ہوتا تھا۔ مورخوں نے مسجد میں جلنے والے چراغوں کی تعداد سات ہزار پانچ سو سے زائد بتائی ہے۔ سال بھر میں تین من موم اور ۳۰۰ من تیل جلایا جاتا تھا۔

مسجد مین تین بڑے جھاڑ تھے۔ جن پر بے شمار چراغ روشن ہوتے تھے۔ محراب میں جو جھاڑ تھا اس پر تقریباً ایک ہزار چراغ ہوتے تھے۔

مسجد میں ہر روز لوبان، عود اور عنبر جلایا جاتا تھا۔ مسجد کے انتظام اور صفائی وغیرہ پر ایک سو پچپن آدمی مقرر تھے۔

۱۲۳۶ء میں جب فرڈی ننڈ شاہ قشتالیہ نے قرطبہ فتح کر لیا تو اس کے حکم سے مسجد کے بہت سے ستون، جالیاں اور محرابیں توڑ دی گئیں۔ اور مسجد میں جگہ جگہ گرجے بنا دیئے گئے۔ اس کی تباہی کا افسوس غیروں کو بھی ہوا تھا۔ فرانس نے جب اسپین پر قبضہ کر لیا اور ۱۵۲۶ء میں چارلس پنجم جب مسجد کو دیکھنے آیا تو اس نے اسقف اعظم کو کہا۔

''افسوس ہے جو چیز تم نے یہاں بنائی ہے وہ دوسری جگہ بھی بن سکتی تھی۔

مگر جس چیز کو تم نے بگاڑا ہے، اس کی مثال کبھی تیار نہ ہو سکے گی۔''۲۰

جامع قرطبہ اگر فن تعمیر کا شاہکار ہے تو اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' فن شعر کا شاہکار ہے۔

اقبال کی مسجد قرطبہ دنیائے شاعری کی مسجد[۲۱] فنکارانہ صناعی اور شاعرانہ اعجاز میں اردو شاعری کا تاج محل[۲۲] ہونے کے ساتھ ابدیت کی تاریخ میں ایک معجزہ فن[۲۳] ہے۔ نظم نگاری میں دنیا کی بہترین تخلیق اور تمثیل نگاری میں عظیم نمونہ، ''مسجد قرطبہ'' جو اقبال کے افکار و خیالات کا احاطہ کرنے کے ساتھ فن کا شاہ پارہ اور فن و فکر میں ہم آہنگی اور حسنِ متناسب کا نمونہ بھی ہے۔ یہ نظم فلسفہ و شعر کا پیکر وقت، عشق اور ایمان کی تفسیر لئے ہوئے ہے۔

جس طرح جامع قرطبہ کی تعمیر میں مختلف اسالیب تعمیر کے ساتھ ساتھ رنگا رنگ پتھروں اور گوناگوں جواہرات سے کام لیا گیا ہے اسی طرح اقبال کی مسجد قرطبہ بھی متنوع خیالات و موضوعات کا مرقع ہے۔ شاعر کے تخیل نے ان متنوع مضامین کو بڑی خوبی سے ایک لڑی میں شاعرانہ ترتیب سے پرو دیا ہے۔ علامہ کے سوز و گداز اور ان کی فن پر مکمل گرفت کی بدولت اس کے سیاسی، سماجی، فنی، فلسفیانہ اور تاریخی موضوعات ایک حقیقت بن کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اس نظم میں زمانے کی حقیقت و اہمیت، کار جہاں کی بے ثباتی، عشق اور اس کی صفات، مسجد قرطبہ سے خطاب، اسکی عظمت و شان، مردِ مومن کا تصور، اندلس کی تاریخ، فتوحات اور عظمت رفتہ، یورپ کے انقلابات اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی طرف اشارے اور پیش گوئیاں موجود ہیں۔

اقبال مسلم اندلس پر نظر دوڑاتے ہیں تو انہیں مسجد کی شان و شوکت میں ایک سنہرے تمدن کی جھلک نظر آتی ہے۔ تاریخ کی یہ جھلک بالآخر ان کے ذہن میں زمانے کے متعلق طرح طرح کے خیالات پیدا کر دیتی ہے۔ زمانے کے بارے میں اقبال نے اپنی دوسری نظموں میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی تصنیف ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں ایک مستقل باب اس پر لکھا ہے۔ ان کے سارے فلسفہ زمان کا نچوڑ اس نظم کے ابتدائی بند میں آگیا ہے۔ نظم کی ابتداء زمانے کی کارفرمائی پر تبصرے سے ہوتی ہے۔ شاعر سوچتا ہے کہ اس عالم کے تمام حادثات اور خود حیات و ممات زمانے کی حرکت کے مرہونِ منت ہیں۔ یہ ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ ہے۔ جو جاری و ساری ہے۔ زمانہ اقبال کے نزدیک ایک ذریعہ اظہار ہے جس سے ذاتِ ایزدی اپنی صفات جلال و جمال کی جلوہ گری کرتی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک خدا بھی ایک حرکی قوت ہے۔''۲۵

سلسلہ روز و شب نقش گرِ حادثات سلسلہ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلہ روز و شب تار حریرِ دورنگ جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلہ روز وشب ساز ازل کی فغاں جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

برگساں کے اس نظریئے سے اقبال پوری طرح متفق ہیں کہ حرکتی نظام ہی کی بدولت یہ سارے حادثات وقوع پذیر ہوئے ہیں۔لیکن برگساں کی طرح وہ دہریت کا شکار نہیں ہوئے۔ بلکہ مذہبی اور روحانی اساس زندگی کو برقرار رکھتے ہوئے زندگی کے حرکتی تصور کے مبلغ بن جاتے ہیں۔

اقبال نے یہاں زمانہ کو جبر کی حیثیت دی ہے۔ جو کچھ نہیں دیکھتا بس اس کا کام فنا کر دینا ہے۔ وہ تعمیر کو تخریب میں بدل دیتا ہے۔ کبھی تخریب کو تعمیر میں استعمال کرتا ہے۔لیکن وہ اس تعمیر و تخریب سے بے نیاز بھی ہے۔ہم سب اس زمانے کی شدید گرفت میں اسیر ہیں۔ازل سے ابد تک جو سلسلہ ہے اس میں زندگی کے شب و روز بے حقیقت ہیں۔اس کی ہمہ گیر اثر کا یہ عالم ہے کہ قوم و سلطنت، تہذیب و تمدن، شخصیت اور آمریت حتی کہ مادہ بھی اس کی دست برد سے محفوظ نہیں۔ دنیا کی عظیم سلطنتیں، عظیم قوت کی مالک قومیں، مذاہب، فن و ہنر کے بہترین اور عجیب و غریب نمونے سب اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر کارِ جہان بے ثبات! کارِ جہان بے ثبات!
اوّل و آخر فنا ، باطن و ظاہر فنا نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا،

اقبال فنا کی اس منزل سے آگے نہیں بڑھ سکتے چنانچہ یہاں انھوں نے فنا کو بقائے دوام اور جبر کو اختیار میں تبدیل کرنے کا ذریعہ عشق بنایا ہے۔اور جو اس نظم کا دوسرا اہم موضوع ہے۔اگرچہ ہر چیز کو فنا ہے اور اس خیال سے ایک قسم کی مایوسی اور خوف کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔لیکن اقبال اِس عالم فانی کے فانی عناصر میں سے بقائے دوام کا ایک عنصر ڈھونڈ لیتے ہیں۔یہ عشق ہے۔اور جس سے ہر چیز لافانی ہو جاتی ہے۔

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

اقبال نے اس بند میں عشق کی کئی تفسیریں کی ہے۔عشق اِس فطری میلانِ بقا اور ارتقاء کا نام ہے۔ جو قلبِ انسانی ہی میں نہیں بلکہ کائنات کے ذرے ذرے میں موجود ہے۔ جس طرح زمانہ فنا کا نام ہے، اس طرح عشق بقا کا نام ہے اور وہ ایک اٹل اور محکم ارادے کے ساتھ زمانے کا

مقابلہ کرتا ہے۔

تُند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

''اقبال کے نزدیک عشق ایک ایسی فعال حیات آفریں اور ولولہ خیز قوت ہے جو افراد اور اقوام کی زندگی کے اعلیٰ نصب العین کی تڑپ اور اسے حاصل کرنے کی لگن کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔''[۲۶] اس نصب العین کے فیضان سے عشق مقصد و منزل بھی بن جاتا ہے اور یہی عشق اس منزل کی طرف بڑھنے کے لیے راہ کے مواقع و مزاحم سے برسرِ پیکار ہونے اور ان پر قابو پانے کا واسطہ بھی بنتا ہے۔عشق ایک مقصد بھی ہے اور ذریعہ بھی۔ تصوف کی عام مروّجہ اصطلاح ''عشق'' جو انسان کو زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشینی کی ترغیب دیتا ہے اس کا اس تصور سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ وہ رزم گاہِ حیات میں کود پڑنے اور کائنات کی مزاحم قوتوں کو اپنے قوتِ بازو سے تسخیر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔اس عشق کے مظاہر بے شمار ہیں۔

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفیٰ عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہ حرم عشق امیر جنود عشق ہے ابن السبیل اور اس کے ہزاروں مقام

اور اقبال کو مسجدِ قرطبہ کا وجود بھی عشق کی بدولت نظر آتا ہے۔ جو اس دنیا میں ایک نقش دوام کی طرح ثبت ہے۔اگرچہ زمانے نے لاکھوں کروٹیں بدلیں لیکن عشق کی بنا پر وجود میں آنے والا یہ نقش اب تک برقرار ہے۔

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے ترا وجود عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفعت و بود

عشق کے بعد اقبال کا تیسرا اہم موضوع فن ہے۔فن میں مصوری، تعمیر، موسیقی، شاعری اور خطاطی سب آجاتے ہیں اور ان فنون کے انمٹ نقوش کے لیے جذبہ عشق بہت ضروری ہے جذبہ عشق کے خلوص و شدت کے اظہار کے لئے اقبال ''خونِ جگر'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!

گویا خونِ جگر فنکار کی شخصیت کے خلوص اور حقیقی جذبے کا دوسرا نام ہے خلوص اور سچائی کسی فن پارے کو ابدیت کا مقام عطا کرتی ہے۔ ''معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!'' کا قول صرف فنون پر ہی مادی نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے سے تعلق رکھتا ہے۔خونِ جگر ہی کی بدولت زندگی کے سارے نقوش جو فانی ہیں بقائے دوام حاصل کر لیتے ہیں۔اس کے

بعد اقبال نے مردِ مومن کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ بھی اقبال کے فلسفہ کا ایک اساسی رکن ہے۔ جس کی تفسیر اس نے اپنی شاعری میں جابجا کی ہے جس انسان میں خودی، عشق، اور فقر کی خصوصیات پیدا ہو جائیں وہ مردِ کامل یا مردِ مومن بن جاتا ہے۔

''اقبال کا انسانِ کامل درحقیقت ایک ایسی بلند قامت شخصیت ہے جس میں مادی اور روحانی ترقی کا ارتقاء مکمل ہوتا ہے۔ اور جس میں اخلاقی اقدار کی بصیرت افروز آمیزش بھی نظر آتی ہے۔ وہ روح اور جسم کی دُوئی کا قائل نہیں بلکہ ان کی تفریق کو غلط سمجھتا ہے۔ اس میں جسمانی ارتقاء کے بعد شعوری اور روحانی ارتقاء بتدریج ظہور میں آتا ہے یعنی وہ اسلام کی بہترین اقدار کا نچوڑ ہے۔''[۲۷]

رسولِ اکرمؐ اقبال کے مردِ مومن کی بہترین اور کامل ترین مثال ہیں۔ مردِ مومن جلال و جمال کا مرکب ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال مسجد قرطبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

جب انسان خود کو بلند کرتے ہوئے اس مقام پر لے آتا ہے کہ وہ کائنات میں خلیفۃ اللہ کا مقام حاصل کر لیتا ہے تو اس کے اندر خدائی صفات کے پرتو پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ خدا کی ذات میں گم نہیں ہوتا۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

زمان، عشق، فن، مردِ مومن ان سب تصورات کے بعد اقبال کو پھر مسجدِ قرطبہ کی یاد آ جاتی ہے اور ساتھ ہی اندلس کی ساری تاریخ ان کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ پہلے مسجد کی تعریف کرتے ہیں۔

کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مبین — تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمین
ہے تہہ گردوں اگر حُسن میں تیری نظیر — قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں!

اسلامی تاریخ کا موضوع اگرچہ نہایت وسیع ہے لیکن اقبال نے نہایت اختصار کے ساتھ اسے چند شعروں میں سمو دیا ہے۔ اور ان شعروں میں عرب مسلمانوں کی ساری تاریخ نظر آتی ہے۔ پہلے شعر میں ''آہ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس میں عربوں کے حسرتناک انجام کی ساری داستان چھپی ہوئی ہے۔

آہ! وہ مردانِ حق وہ عربی شہسوار — حامل ''خلقِ عظیم'' صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب — سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں

اندلسی مسلمانوں نے جو اثر مغرب اور مشرق کی تہذیب و تمدن علم و حکمت اور دوسرے فنون پر ڈالا اقبال اسکی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

جنکی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب — ظلمتِ یورپ میں تھی جنکی خرد راہ میں

اندلس کی تاریخ کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ عربوں کے اثرات آج بھی اندلسی باشندوں کے خدوخال میں نظر آتے ہیں۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جنکے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی — خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبین
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال — اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے — رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اور پھر

دیدہ انجم میں ہے تیری زمین آسماں — آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

اس نظم کا ایک اور موضوع یورپ کے انقلابات اور تحریکات ہیں۔ اقبال نے باری باری سب کا ذکر کیا ہے۔

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاح دیں — جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمت پیر کنشت — اور ہوئی فکر کی کشتی نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب — جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملت رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر — لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

اقبال کو ان انقلابات کا ذکر اس لیے کرنا پڑا کیونکہ وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ اس طرح مسلمان بھی ایک نئے انقلاب کی کشمکش سے دوچار ہیں جس کی وجہ سے آج عالمِ اسلام شدید اضطراب میں ہے۔

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب — رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا — گنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا

اس نظم کا آخری اہم موضوع مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا زمانہ ہے۔ اگرچہ اقبال نے اس کے بارے میں واضح طور پر کچھ نہیں کہا لیکن اس کی پیش گوئی ضرور کی ہے۔

آبِ رواں کبیر تیرے ہے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالم نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اُٹھا دوں اگر چہرہ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ مری نواؤں کی تاب

اس کے علاوہ اس نظم میں ضمنی موضوعات بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ زندگی کے لئے انقلاب کی کیا اہمیت ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

کونسی قوم دنیا میں قیادت کا منصب حاصل کرتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم — کرتی ہے جو ہر زمان اپنے عمل کا حساب

اس نظم کے تمام موضوعات ایک تسلسل اور انتہائی کمالِ فن کے ساتھ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ان سب خیالات و موضوعات میں ایک داخلی ربط موجود ہے اور انکی ترتیب میں مکمل حسن تناسب پایا جاتا ہے۔

مسجد قرطبہ میں تنوع موضوعات کے ساتھ ہم آہنگی، حسنِ ترتیب اور تناسب بھی ہے جن سے ایک فن پارہ فنی تکمیل کے مدارج طے کر کے لازوال بن جاتا ہے۔ اقبال نے اس نظم میں اپنے خلوص جذبات اور اعلیٰ تخیل کا کامیاب مظاہرہ کیا ہے اور اسے حد کمال تک پہنچا دیا ہے۔ جذبات کی اہمیت کو اقبال بھی جانتے ہیں۔

''شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں۔ جذبات انسانی کیفیات قلبی اللہ کی دین ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طبع موزوں اس کو ادا کرنے کے لیے پر اثر الفاظ کی تلاش کرے۔'' ۲۸

اندلس کے متعلق اقبال کے پرخلوص جذبات اور پھر اس ماحول کے اثرات نے ان سے وہ شہ پارہ تخلیق کروایا جسے تمام نقاد متفقہ طور پر اردو ادب کا بہترین شاہکار تسلیم کرتے ہیں۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم نظم کے بارے میں چند آراء درج کر دی جائیں۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں

''مسجد قرطبہ جدید اردو ادب کا شاہکار ہے اس میں شاعر نے ایمائی اثر آفرینی سے ایک طلسم سا پیدا کر دیا ہے۔ اس میں آرٹ، تاریخ اور فلسفہ ایسے خوش اسلوبی سے سموئے ہیں کہ انسان کا ذہن لطف اندوز ہوتا ہے اور داد دیتا ہے۔ ۲۹

مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں۔

''یہ نظم نہ صرف اقبال کی نظموں بلکہ اردو کی دوسری بلند پایہ نظموں میں ایک انفرادی شان رکھتی ہیں۔'' ۳۰

یہ نظم موضوع کے لحاظ سے مذہبی و ملی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس لیے جب کوئی غیر مسلم اس نظم کے بارے میں کچھ کہتا ہے تو اس کی رائے زیادہ وقیع اور قابلِ قدر سمجھی جائے گی۔ اردو کے مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں

''یہ نظم صرف اقبال ہی کا شاہکار نہیں بلکہ اردو شاعری کا شاہکار ہے۔ اردو شاعری میں اس نظم کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا تو بھی ہماری شاعری دنیا کی صفِ اوّل کی شاعری میں ایک ممتاز مقام حاصل کر سکتی تھی۔ مسجدِ قرطبہ، شعریت، رومانیت، حقیقت پسندی، رمزیت اور ایمائیت کا ایک حسین امتزاج ہے کہ ہماری اردو شاعری روزِ اوّل سے آج تک اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔'' ۳۱

اِسی طرح محمد عطاالرب صدیقی کا قول ہے۔

''مسجد قرطبہ اقبال کی شعری کارناموں میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ افکارِ عالیہ کو شعریت کے حسین جامے میں کچھ اس طرح ملبوس کیا ہے کہ قامت و لباس میں ایک ناگزیر تناسب قائم ہو گیا ہے۔۔۔۔ مسجد قرطبہ ایک ایسی دوآتشہ ہے جس میں کیف و رنگ دونوں میں خیالات مصوری کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ فکر کی بلندی، خیالات کی وسعت جذبات کی شدت انداز کی رعنائی یہ سب کسی شاعر کے یہاں بیک وقت نظر نہیں آتے۔ ۳۱(ا)

علامہ نیاز فتح پوری فرماتے ہیں۔

''تاہم مجھے اس کے بعض ایسے شاہکار چننے کا خیال ضرور پیدا ہوا جو اس کے تمام اردو منظومات میں گُل سرسبد کی حیثیت رکھتے ہوں۔ اور اس کی جستجو میں آخر کار میری نگاہ مسجد قرطبہ اور ذوق و شوق پر پڑی جو حقیقتاً اقبال کو زندہ جاوید بنا دینے کے لیے کافی ہیں۔ کیونکہ اقبال نے جو کچھ لکھا وہ انہی نظموں کی شان نزولی تھی۔ اور جو نظمیں بعد میں لکھیں وہ انہیں کی تفسیریں ہیں۔ اقبال کا فلسفہ اس کا پیغام اس کے جذبات کا جوش و خروش اور اس کے محاسن شعری الغرض سب کچھ انھیں دو نظموں میں سمٹ آیا ہے۔'' ۳۲

اس کی ایک وجہ تو نظم کا فکری پہلو اور کے مضامین کا تنوع ہے۔ لیکن صرف اس سے تو کوئی فن پارہ اعلیٰ نہیں کہلا سکتا۔ اس کے لیے کچھ اور چیزوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ ان میں سے ہم یہاں پہلے نظم کی ترکیبی وحدت کو لیتے ہیں۔

پوری نظم وحدت کی ایک مثال ہے۔ ہر بند بلکہ ہر شعر زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم مربوط ہے۔ کوئی شعر ایسا نہیں کہ اگر اس کو خارج کر دیں یا بدل دیں تو پوری نظم کی وحدت پر اثر نہ پڑتا ہو۔ اس ترکیبی وحدت کا یہ اثر ہے کہ نظم کو پڑھتے وقت قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک شعر نے اس کے ذہن کو دوسرے شعر کے حوالے کر دیا ہے اور اس طرح دوسرے نے تیسرے کے حوالے کر دیا ہے کوئی شعر بھرتی کا نہیں بلکہ نظم کا ایک اہم کردار اور ضروری جزو معلوم ہوتا ہے۔ ہر شعر نظم کے ارتقاء میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ نظم کی فکری حیثیت میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نظم کی اس حیرت انگیز تعمیری وحدت کے بارے میں مجتبیٰ حسین کا یہ قول بالکل درست ہے۔

''اس نظم کی فنی صناعی اور فکری تعمیر کو اقبال نے خود مسجدِ قرطبہ کی صناعی اور حسنِ تعمیر سے جس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے۔ وہ ہمارے ادب میں موضوع اور فکر کے داخلی اور خارجی ارتباط کی کم یاب مثال ہے۔''

اقبال ایک مقصدی شاعر ہے اور اس کے ہاں بعض اوقات مقصدیت شاعری پر غالب آجاتی ہے۔ لیکن مسجدِ قرطبہ میں مقصدیت کے باوجود ہمیں شاعری کے تمام فنی محاسن نظر آتے ہیں۔ اس نکتے کی وضاحت کے لئے مثال پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ نظم کا ہر بند فکری عظمت اور فنی ہنرمندی کا بہترین نمونہ ہے۔

شعری کارنامے کی تخلیق اور تکمیل کے لیے جذبات بہت ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ایک عظیم فن کار اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے اس سلیقہ سے انہیں الفاظ کا جامہ پہناتا ہے کہ جذبے کی شدت فن پارے کی صوتی اور فنی حیثیت کو نقصان نہ پہنچائے چنانچہ اقبال نے ایسی ہنرمندی کے ساتھ اپنے جذبات کو مناسب الفاظ میں ادا کیا ہے۔ کہ نہ تو نظم کی موزونیت میں کوئی فرق پڑا ہے اور نہ جذبات کی شدت میں کوئی کمی محسوس ہوئی ہے۔ درحقیقت نظم کا موضوع بھی سنجیدگی کا متقاضی تھا لیکن اس سنجیدگی میں بھی حسن ہے۔ فن ہے اور رنگینی ہے۔ اقبال جو کچھ کہتے ہیں وہ تمام کا تمام شعریت میں رچا ہوتا ہے۔ اس طرح مسجدِ قرطبہ میں ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' کے دو متضاد وبستانوں کی خصوصیت اور دو مختلف طبقوں کے ذوق کی تسکین کا سامان موجود ہے۔

جذبات اور تخیل کے بعد کسی فن پارے کے عظیم بننے کے لیے جس چیز کی ضرورت

ہوتی ہے وہ انتخابِ الفاظ ہے۔ اگرچہ نقادوں کا ایک طبقہ اظہار و بیان کو اولیت دیتا ہے لیکن صرف حسنِ بیان سے کوئی فن پارہ فن کی اعلیٰ بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا جب تک حسین اور موزوں الفاظ کے ساتھ اعلیٰ اور حقیقی جذبات اور تخیل کی سحر آفرینی بھی شامل نہ ہو۔ مسجد قرطبہ میں دونوں چیزیں بدرجہ اتم موجود ہیں اور اس ہم آہنگی کے ساتھ کہ ان میں امتیاز باقی نہیں رہتا۔ یوں کہنا چاہئے کہ جذبات تخیل اور حسنِ بیان کا اعلیٰ ترین امتزاج مسجدِ قرطبہ میں ظہور پذیر ہے۔ جس طرح بانی عبدالرحمٰن الداخل اور اس کے بعد دوسرے اموی بادشاہوں کی سچی عقیدت اور خلوصِ جذبات نے مسجدِ قرطبہ کے لیے اعلیٰ ترین مسالہ اور بیش قیمت تعمیراتی اور آرائشی سامان دور دور سے منگوایا جو مسجد کی تعمیر و تزئین میں صرف ہوا۔ بعینہ اقبال نے بھی اس نظم میں الفاظ و تراکیب کے انتخاب و ترتیب اور معانی و اصوات کی ہم آہنگی سے شاعری کا جادو جگایا ہے اور مسجد قرطبہ کو لفظی و معنوی محاسن کا مرقع بنا دیا ہے۔

ایجاز و اختصار شاعری کا سب سے بڑا حسن ہے۔ یہ خوبی بھی اقبال کے کلام میں عام طور پر موجود ہے لیکن اس نظم میں ایجاز و اختصار کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو شاید اور کہیں نظر نہ آئیں۔ مثلاً ایک جگہ یورپ کی صدیوں کی تاریخ صرف چند شعروں میں اس طرح سمودی ہے۔

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاح دیں — جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
حرف غلط بن گئی عصمت پیر کنشت — اور ہوئی فکر کی کشتی نازک رواں
چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب — جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملت رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر — لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

بلاغت اور اختصار کی یہ مثال دیکھئے جس میں مردِ مومن کی تمام صفات کی کس قدر عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل پاکباز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ — حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

موسیقیت اور خوش آہنگی اس نظم کی جان ہے۔ باوجودیکہ اس نظم میں بعض سنجیدہ اور خشک مسائل مثلاً حقیقتِ زمان کو بیان کیا ہے۔ لیکن نظم کی روانی اور ترنم میں کہیں فرق نہیں آیا۔ مسجد قرطبہ کا ابتدائی بند ملاحظہ ہو کہ کس طرح الفاظ و اصوات کی تکرار اندرونی قوافی اور خوش آہنگ الفاظ کی ترکیب سے اقبال نے فلسفہ کو شعریت اور نغمگی کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

سلسلہ روز و شب نقش گرِ حادثات　　سلسلہ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلہ روز و شب تارِ حریر دورنگ　　جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلہ روز و شب سازِ ازل کی فغاں　　جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ　　سلسلہ روز و شب صیرفی کائنات

مفتعلن اس نظم میں اقبال نے جو بحر اختیار کی ہے (بحر منوج مثمن مطوی، موقوف و مکسوف) فاعلات (فاعلن)، مفتعلن فاعلات (فاعلن) وہ بھی بڑی مترنم اور افتاں وخیزاں بحر ہے۔ اس بحر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مصرعے دو دو متوازی ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے بحر کی اس خصوصیت سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور مصرعوں کی ترتیب میں ایسے موزوں الفاظ وتراکیب سے کام لیا ہے۔ کہ ہر مصرع دو مکمل متوازن اکائیوں میں منقسم ہو گیا ہے۔

تغزل اقبال کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ لیکن اقبال کی ان نظموں میں تغزل کا رچاؤ بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ جو ترکیب بند ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ مسجد قرطبہ بھی ترکیب بند ہیئت میں ہے۔ نظم کا ہر بند اپنے داخلی ربط و تسلسل کے باوجود غزل نما ہے۔ موسیقیت اور ایمائیت نے تغزل کے رنگ کو چمکا دیا ہے۔ مسجدِ قرطبہ کے کہ یہ اشعار تغزل کی عمدہ مثال ہیں۔

جنکے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی　　خوش دل و گرم اختلاط سادہ روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال　　اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشین

اور

سادہ و پرسوز ہے دختر دہقان کا گیت　　کشتی دل کے لیے ہے عہد شباب

اقبال نے اس نظم میں رمز و ایما سے بہت کام لیا ہے اور یہ رموز علامت اتنے سادہ اور احسن طریق سے استعمال کی گئی ہیں کہ ہمیں شاعر کو بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔

عشق دم جبرئل عشق دم مصطفیٰ　　عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک　　عشق سے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہ حرم عشق امیر جنود　　عشق سے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام!

اور اس شعر میں رمزیت کی فسوں کاری سے تصورات کی ایک دنیا آباد ہے۔

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے　　عشق بلاخیز کا قافلہ سخت جاں

نظم کے آخری بند کے آغاز میں شاعر نے ایک حسین ماحول کی منظر کشی اس خوبی کے ساتھ کی ہے

کہ قاری بھی شاعر کے ساتھ اسی ماحول میں پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ بھی انہیں جذبات وخیالات سے دوچار ہو جاتا ہے جو اس وقت شاعر کے دِل میں موجزن ہوتے ہیں۔

وادی کہسار میں غرق شفق ہے سیماب　　لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب!
سادہ و پرسوز ہے دخترِ دہقان کا گیت　　کشتی دِل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب!
آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی　　دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

مختصر یہ کہ اندلس کی مسجد قرطبہ کی طرح اقبال کی مسجد قرطبہ بھی جلال و جمال کا حسین امتزاج ہے۔ چنانچہ جگن ناتھ آزاد کہتے ہیں۔

''اگر کبھی مسجد مجھے دیکھنے کا موقع ملا تو شاید اس وقت بھی یہ فیصلہ نہ کرسکوں کہ اندلس کی مسجد قرطبہ زیادہ جلیل وجمیل ہے یا بالِ جبریل کی مسجدِ قرطبہ''۴۴

ان ساری خوبیوں کے علاوہ نظم کا ایک اور اہم عنصر جس نے اس کو ایک مکمل شہ پارہ بنایا ہے وہ درد و گداز سے لبریز شخصیت کا فن کارانہ بیان ہے اور اسی اندازِ بیان کی وجہ سے اس نظم میں ایسی سادگی، شیرینی اور گھلاوٹ پیدا ہوگئی ہے جس نے اس کو عظیم بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس نظم کے آخری شعر میں اقبال نے اگرچہ مسجدِ قرطبہ کی مثال دی ہے لیکن ہم اس کو اس نظم پر بھی ایک مکمل تبصرہ کہہ سکتے ہیں۔

نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

☆☆☆

قید خانے میں معتمد کی فریاد

(معتمد اشبیلیہ کا بادشاہ اور عربی شاعر تھا۔ ہسپانیہ کے ایک اور حکمران نے اس کو شکست دے کر قید میں ڈال دیا تھا۔ معتمد کی نظمیں انگریزی میں ترجمہ ہو کر ''وزڈم آف دی ایسٹ'' میں شائع ہو چکی ہیں۔)

اک فغانِ بے شرر سینے میں باقی رہ گئی — سوز بھی رخصت ہوا جاتی رہی تاثیر بھی
مردِ حُر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج — میں پشیماں ہوں پشیماں ہے مری تدبیر بھی!
خود بخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دل — تھی اسی فولاد سے شاید مری شمشیر بھی!
جو مری تیغِ دودم تھی اب مری زنجیر ہے — شوخ و بے پروا ہے کتنا خالقِ تقدیر بھی! ۳۵

یہ نظم ایک خوبصورت فنی تخلیق ہے جو حسن و کمال کی منزل بلند پر ہے۔ جو شخص معتمد کے حالاتِ زندگی سے واقف ہے وہ اسے پڑھ کر افسردہ ہو جاتا ہے۔ اس میں معتمد ابن عباد کی زندگی کی تصویر اور اس کے جذبات و احساسات کی کیفیات اور صفات کا عکس ہے۔

ایک شاعر بادشاہ کی حکومت سے برطرفی، بچوں سے دوری، شاعر ملکہ سے جدائی، قید خانے کی کوٹھری اور زنجیروں کا بوجھ ان سب کا ذکر معتمد کی شاعری میں ہے۔

علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کی کسی ایک نظم سے تاثر نہیں لیا۔ بلکہ اس کی مجموعی شاعری کو سامنے رکھ کر یہ نظم کہی ہے۔

☆☆☆

عبدالرحمٰن اوّل کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت

سرزمینِ اندلس میں

یہ اشعار جو عبدالرحمٰن اول کی تصنیف سے ہیں، تاریخ المقری میں درج ہیں۔

مندرجہ ذیل اردو نظم ان کا آزاد ترجمہ ہے۔ (درخت مذکور مدینۃ الزہرا میں بویا گیا تھا)

میری آنکھوں کا نُور ہے تُو — میرے دِل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دُور ہوں میں — میرے لیے نخلِ طُور ہے تُو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا — صحرائے عرب کی حُور ہے تُو
پردیس میں نا صبور ہوں میں — پردیس میں ناصبور ہے تُو
غربت کی ہوا میں بار ور ہو
ساقی ترا نم سحر ہو
عالم کا عجیب ہے نظارہ — دامانِ نگر ہے پارہ پارہ
ہمت کو شناوری مبارک — پیدا نہیں بحر کا کنارہ
ہے سوزِ دروں سے زندگانی — اُٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
صبح غربت میں اور چمکا — ٹوٹا ہُوا شام کا ستارہ
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے!
مومن کا مقام ہر کہیں ہے! ۳۶

اس نظم کے حوالے سے علامہ اقبال سے سہو ہوا ہے کھجور کا درخت مدینۃ الزہرا میں نہیں لگایا گیا تھا بلکہ رصافہ میں بویا گیا تھا۔ الزہرا تو رصافہ کی تعمیر کے تقریباً دو سو سال بعد تعمیر ہوا۔ ڈاکٹر ریاض مرحوم نے بھی المقری کا حوالہ دیا ہے اور مدینۃ الزہرا ہی لکھا ہے۔ حالانکہ المقری نے رصافہ کا ذکر کیا ہے۔

علامہ اقبال نے اسلامی میراث کے ان خوبصورت ادبی خزانوں کو خوب چکا اور نکھار کر زبان و بیان اور فکر و معنی میں ان کی اصل قدر و قیمت سے بھی آگے پہنچا دیا ہے کیونکہ اِن کے اندر غضب کی قوت مشاہدہ اور اخذ کرنے کی قوت موجود ہے۔ ان کی اندلس سے متعلق تمام شاعری

میں اسلامی تاریخ وثقافت نمایاں ہے۔اس نظم میں عبدالرحمٰن الداخل کی اپنی نظم کے اشعار کا ترجمہ بھی ہے اور اس کی سیرت وکردار پر علامہ اقبال کے اپنے اشعار بھی ہیں۔

صبح غربت میں اور چمکا
ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ

اقبال کا یہ شعر ان کے ایک ابتدائی شعر سے مطابقت رکھتا ہے جو یہ ہے۔

یا شب کی سلطنت میں دِن کا سفیر آیا
غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں ۳۸

☆☆☆

ہسپانیہ

(ہسپانیہ کی سرزمین میں لکھے گئے)
(واپس آتے ہوئے)

ہسپانیہ تو خونِ مسلمان کا امین ہے — مانند حرمِ پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں — خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
روشن تجھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں — خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ وکمر میں
پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حِنا کی؟ — باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں!
کیونکر خس وخاشاک سے دب جائے مسلمان — مانا وہ تب وتاب نہیں اس کے شرر میں!
غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن — تسکین مسافر نہ سفر میں، نہ حضر میں
دیکھا بھی دکھایا بھی، سُنایا بھی سنا بھی — ہے دِل کی تسلی نہ نظر میں، نہ خبر میں ۳۹

اندلس کی سرزمین اقبال کے لیے مقدس ومحترم اور محبوب ہے۔ہسپانیہ نظم اس سے جُدا ہوتے وقت کی ہے جس میں دکھ اور کرب کا اظہار ہے۔اِقبال کی یہ نظم ایک فکر انگیز تخلیق ہے۔جس کا ایک ایک شعر ملی تاریخ کی تمثیل نگاری کا مرقع ہے۔جس میں اندلسی مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور سیاسی عروج وزوال کے متعلق احساسات ہیں۔اقبال اندلس سے براہِ راست مخاطب ہیں کہ اندلس کیا آج پھر تجھے ان مسلمانوں کی ضرورت ہے جنھوں نے تجھے ثقافت وتہذیب کی معراج تک پہنچایا تھا۔اندلسی تہذیب اور تاریخ کا پس منظر اس نظم کی فکری اساس ہے۔آخری دو اشعار میں وسیع مطالب ومفاہیم کو ایجاز واختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔اِس کا ایک ایک لفظ اپنے اندر معنی کا سمندر سمیٹے ہوئے ہے۔

☆☆☆

طارق کی دُعا

(اندلس کے میدانِ جنگ میں)

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دونیم اُن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دِل کو — عجب چیز ہے لذّت آشنائی !
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن — نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

خیابان میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے !

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا — خبر میں ، نظر میں ، اذانِ سحر میں !
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو — وہ سوز اُس نے پایا انہی کے جگر میں !
کشادہ درِ دِل سمجھتے ہیں اُس کو — ہلاکت نہیں موت اُن کی نظر میں !
دِل مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے — وہ بجلی کہ تھی نعرہ لا تذر میں !

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلمان کو تلوار کر دے [۴۰]

اقبال نے بہت سی دعائیں تو براہ راست اللہ کے حضور مانگی ہیں لیکن کچھ دعائیں دوسروں کی زبانی بھی ہیں۔ ان میں ایک "طارق کی دعا" ہے۔ اقبال کی شاعری کا ایک خاص اسلوب کسی بھی شخصیت کو شاعرانہ کردار نگاری اور اس کے مخصوص افکار کو نئے پیکروں میں ڈھالنا بھی ہے۔[۴۱] جو تمثیل نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ یہ دعا ایک مردِ مجاہد نے میدانِ جنگ میں بارگاہ ایزدی میں مانگی ہے۔ جب راڈرک کا لشکر اور طارق کا لشکر آمنے سامنے ہے اور اسلام بحیرہ روم کو پار کر کے یورپ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ لہٰذا اس موقع پر اسلامی لشکر کا سپہ سالار ایک مومن کی صفات اور اسلامی نظریہ حیات کی تصویر کشی کرتا ہے۔ "بلاشبہ یہ ایک رجز ہے لیکن اسلامی تصورات کے تحت دنیا کی ساری جنگوں کے رجزوں سے یکسر مختلف ہے۔"[۴۲] اس میں اگرچہ رجز کی تمام خصوصیات موجود ہیں لیکن انداز اور ہے۔ جس میں اسلامی اقدار کو شاعرانہ کمال فن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

اس دعا میں علامہ اقبال اندلس میں کبھی تو طارق کے ساتھ میدانِ جنگ میں ہیں اور کبھی حال کے مسلمانوں کے ساتھ یہ وہ دعا ہے جس میں جوش جہاد، اسلام کی عالمگیریت، اور شوقِ شہادت کی طلب ہے۔

☆☆☆

اندلس سے متعلق متفرق اشعار

کلام اقبال میں اندلس سے متعلق متفرق اشعار بھی ملتے ہیں وہ یہ ہیں۔

زندانِ فرانسیس کا میخانہ سلامت　　پُر ہے مئے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا
ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق　　ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا؟
مقصد ہے ملوکیتِ انگلیس کا کچھ اور　　قصہ نہیں تاریخ کا یا شہد و رطب کا　۴۳

علامہ اقبال کے یہ اشعار اس وقت کے ہیں جب یہودی فلسطین میں آباد ہو رہے تھے اور اس کو اپنا وطن بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دولِ مغرب پوری طرح اس کی حمایت میں تھیں۔ اس وقت کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہودی عربوں کے بڑے علاقے کو ان سے چھین کر اپنی مملکت بنا لیں گے۔ اقبال نے یہودیوں کے اسی دعویٰ کے تناظر میں عربوں کا حق ہسپانیہ پر ثابت کیا ہے۔

طارق چو بر کنارہ اندلس سفینہ سوخت　　گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم؟　　ترک سبب زروئے شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر بردو گفت
ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست　۴۴

علامہ اقبال کے پسندیدہ موضوعات اس قطعے میں ہیں۔ اس کے علاوہ فنی نقطہ نظر سے بھی تاریخ کے ایک بڑے واقعے کو تین اشعار میں سمو دیا ہے۔ جس میں تمثیل نگاری، کردار نگاری اور ڈرامائی عناصر بھی اپنا رخ دکھاتے ہیں۔

اس میں ہجرت کا فلسفہ بھی بیان ہوا ہے اور اس کے اخذ کردہ نتائج بھی

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

یا

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

حُسن عالم سوز الحمرا و تاج　　آنکہ از قدوسیان گیرد خراج
این ہمہ یک لحظہ از اوقات اوست　　یک تجلی از تجلیاتِ اوست
ظاہرش این جلوہ ہائے دلفروز　　باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز

اقبال کی تصنیف پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں بعنوان ''حرفے چند با اُمت

عربیہ'' سے یہ اشعار لئے گئے ہیں۔ اِس میں مُسلمانوں کے فنِ تعمیر کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک اسلامی فن تعمیر ترقی کی منازل طے کر چُکا ہے۔ البتہ دوسرے فنون مثلاً فنونِ لطیفہ، موسیقی، مصوری بلکہ ایک حد تک شاعری نے ابھی ترقی کرنی ہے۔ کسی بھی قوم کی صفات و انداز اس کے فنِ تعمیر میں جھلکتی ہیں۔ علامہ اقبال الحمرا تاج کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ ان دو عمارتوں نے اپنی خوبصورتی اور پائیداری میں فرشتوں سے بھی تعریف کروائی ہے۔ ان میں ایک خاص قسم کی دِل فروزی ہے۔ اور رُسولِ اکرم کی تجلیات میں سے ایک تجلی ہے۔ ان اشعار میں قوتِ متخیلہ کا خوبصورت استعمال ہے اور میراث اسلام کے متعلق احساسات کا اظہار تاریخ و ثقافت کی تلمیحات کے ذریعے اَشعار میں بیان کیا ہے۔

☆☆☆

حواشی

(۱) اقبال، باقیاتِ اقبال۔ مرتبہ عبدالواحد معینی آئینہ ادب لاہور، ۱۹۷۸ء۔ ص۔ ۱۲۰۔ ۱۲۸
(۲) ایضاً ص۔ ۹۷
(۳) اقبال، بانگ درا شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ ۱۹۶۰ء۔ ص۔ ۱۴۳
اس بند کے متعلق مزید تفصیل دیکھیے ڈاکٹر رحیم بخش شاہین صاحب کا مضمون نظم مرثیہ (سسلی) کے ایک بند کی تشریح اقبالیات لاہور جنوری مارچ ۱۹۹۳ء اور ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کی کتاب مرثیہ صقلیہ پر ایک نظر۔
(۴) ظہور احمد اظہر ڈاکٹر، مرثیہ صقلیہ پر ایک نظر بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۹۲ء۔ ص۔ ۱۰۸
(۵) ۱۲۵۸ء میں۔
(۶) ۱۸۵۷ء
(۷) اس کے بارے میں چوتھے باب میں تفصیل ہے۔
(۸) اقبال، بانگِ درا۔ ص۔ ۱۴۶
(۹) ایضاً ص۔ ۱۴۶
(۱۰) اقبال، بانگ درا۔ ص۔ ۱۷۸
(۱۱) اقبال، بانگِ درا۔ ص۔ ۱۷۸
(۱۲) اقبال، اسرار خودی۔ ص۔ ۱۲۸
(۱۳) اقبال، بال جبریل۔ ص۔ ۵۷۔ ۵۶
(۱۴) ایضاً ص۔ ۹۱
(۱۵) ولی محمد قاضی سفرنامہ اندلس طبع ۱۹۲۷ء۔ ص۔ ۸۳
(۱۶) احسان الحق سلمانی ''مسلمان یورپ میں'' قومی کتب خانہ لاہور ۱۹۵۴ء۔ ص۔ ۱۱۷
(۱۷) امیر علی تاریخ اسلام ترجمہ باری علیگ آئینہ ادب لاہور ۱۹۷۰ء۔ ص۔ ۳۰۹
(۱۸) رشید اختر ندوی، تہذیب و تمدن اسلامی حصہ دوم ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور ۱۹۵۲ء۔ ص۔ ۵۶۸
(۱۹) اسکاٹ اخبار الاندلس۔ ترجمہ خلیل الرحمٰن انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ ۱۹۲۰ء۔ ص۔ ۶۱۳
(۲۰) احسان الحق سلمانی۔ ص۔ ۲۲۳

(۲۱) امریکی اسکالر باربرا مٹکاف کے نزدیک
(۲۲) محمد حسن عسکری کے نزدیک۔
(۲۳) سلیم احمد کے نزدیک (فنون فروری مارچ ۱۹۸۲ء۔ ص۔ ۷۳)
(۲۵) اقبال تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ ترجمہ نذیر نیازی بزم اقبال لاہور ۱۹۸۶ء ص۔
(۲۶) عزیز احمد ''اقبال کا تصورِ فن'' رسالہ اردو جولائی۔ ۱۹۴۹ء
(۲۷) یوسف سحرئی، اقبال کا انسانِ کامل از خیابانِ اقبال مجلہ پشاور یونیورسٹی ۱۹۶۶ء۔ ص۔ ۹۰
(۲۸) عطاالله شیخ، اقبال نامہ حصہ اوّل ناشر شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۵۱ء۔ ص۔ ۲۸
(۲۹) یوسف سلیم چشتی، شرح بالِ جبریل حاجی فرمان علی اینڈ سنز لاہور ص۔
(۳۰) مجتبیٰ حسین، ادب و آگہی۔ کراچی۔ ۱۹۶۳ء۔
(۳۱) محمد عطاالرّب صدیقی، مسجد قرطبہ کی شاعرانہ عظمت ماہ نو اپریل ۱۹۵۳ء۔
(۳۲) نیاز فتح پوری، نگار اقبال نمبر ۱۹۶۳ء
(۳۳) مجتبیٰ حسین، ادب و آگہی۔ ص۔ ۴۰۰
(۳۴) جگن ناتھ آزاد، ''اقبال اور اس کا عہد ادارہ انیس اردو الہ آباد۔ ۱۹۶۰ء
(۳۵) اقبال، بالِ جبریل۔ ص۔ ۱۰۲۔ ۱۰۱
(۳۶) ایضاً ص۔ ۱۰۳۔ ۱۰۲
(۳۷) محمد ریاض، ڈاکٹر اقبال کے چند تراجم و ماخوذات از اقبال شناسی کے زاویے مجموعہ مقالات رسالہ اقبال ۱۹۷۴ء تا ۱۹۸۴ء۔ بزم اقبال لاہور ۱۹۸۵ء۔ ص۔ ۲۸
(۳۸) اقبال، بانگِ درا۔ ص۔ ۸۴
(۳۹) اقبال، بالِ جبریل۔ ص۔ ۱۰۴۔ ۱۰۳
(۴۰) اقبال، بالِ جبریل۔ ص۔ ۱۰۵
(۴۱) عبدالمغنی، ''اقبال کا نظامِ فن''۔ ص۔ ۳۰۰
(۴۲) ایضاً ص۔ ۳۰۱
(۴۳) اقبال، ضربِ کلیم۔ ص۔ ۱۵۶
(۴۴) اقبال۔ کلیاتِ اقبال فارسی۔ ص۔ ۱۶۹
(۴۵) اقبال، کلیات اقبال فارسی شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ ۱۹۷۵ء۔ ص۔ ۸۳۶

☆ J.B. Trend کی کتاب Spain from the South علامہ اقبال کے پاس تھی۔ اس پر علامہ اقبال کے دستخط بھی ہیں اور نیچے ۲/جنوری ۱۹۳۵ء کی تاریخ درج ہے۔ (روزگارِ فقیر، فقیر وحیدالدین ص ۴۶)

☆ علامہ اقبال نے ایک دفعہ سید فقیر وحیدالدین کو ابن خلدون کا مقدمہ پڑھنے کا کہا تھا۔ (روزگارِ فقیر، فقیر وحیدالدین ص ۸۵)

عربی کلچر کا اثر بھی دیکھئے

☆ Arab dress was also worn by Sr. Fernando and archbishop Rodrego Jimenz of Rozda (Rottha). Like the Moors, the Spanish chritians kept their women Jealously sequestere and veiled" Though the Christian rulers didnot dare to install harms openly like the Muslims rulers they had concubins guarded by gratings and duenas. Alfanso VI had had five wives among whom was a Muslim lady Zubaydah by name. *(Muslim Spain a socialogical Study S.M. Imamuddin Pg 192)*

☆ In hatered and disgust the Moriscos were prohibited from taking baths and the Christian public were discourged from practicing this Arab custom. The Moriscos resisted the closure and destruction of their barhs and one of the erypto-Muslims, Frandcisco Nunez Muley, a convertered Christian Chief had the courage to protest against the royal mandate in the following words, "The baths ewere built for the cleanliness of the body and to say that couples get together there is not to be believed; for where so many people go, there can be no secret... There have always been baths throughout all the Provinces and if at one time they were taken away in Castile, it was because the baths weakened the flesh and the spirit of the men for war. The men who was born in this kingdom of Granada have no need to fight nor do the women meet to have strength but rather to be clean; if they donot wash in the bath where then are they to go and bathe" *(Muslim Spain a socialogical Study S.M. Imamuddin Pg 210)*

خلاصہ

اندلس اقبال کا پسندیدہ اور محبوب ترین موضوع، جو جمال وجلال کی تصویر اور المناک واقعات وحوادث کی تعبیر ہے اندلس سے اقبال کی وابستگی کی اساس ان کا دینِ اسلام سے مومنانہ لگاؤ اور مسلمانوں کے شاندار ماضی سے شدید محبت کی بنا پر ہے۔ نیز ان کے سامنے سقوطِ اندلس کے واقعات ہیں۔ اگر ایک طرف آپس کی سازشیں اور اقتدار کی ہوس ہے تو دوسری طرف اس بہشتِ بریں کی مدافعت کے لیے قربانی کی لازوال مثالیں بھی ہیں۔ یہ ایک ایسی قوم کی عظمت وشان کی داستان ہے جس کے بارے میں اپنوں سے زیادہ دوسروں نے گن گائے ہیں۔

عصرِ اقبال اور دو صدی پیشتر اگرچہ تمام اسلامی ممالک کے مسلمان اہلِ مغرب کی سازشوں اور اپنوں کی عاقبت نااندیشی کی بنا پر اوجِ حاکمیت سے پستی غلامی میں گر کر انتہائی زبوں حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن جو کچھ اندلس اور وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ ہوا اس کی کہانی منفرد اور کرب سے بھری ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جس سے ایک عام مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا دل غم وصدمہ سے لبریز ہو جاتا ہے تو علامہ اقبال اس سے کیوں نہ متاثر ہوئے ہوں گے۔ جن کا حساس دل عالمِ اسلام کے لیے بے پناہ درد اور تڑپ رکھتا تھا۔

مسلمانوں اور عیسائیوں میں متواتر آٹھ صدیوں تک کش مکش جاری رہی عیسائی اپنی آزادی کے لیے لڑتے رہے اور مسلمان اپنی تہذیب وتمدن اور مذہب کی مدافعت کے لیے مردانگی اور بہادری کے جوہر دکھاتے رہے، اس عہد میں عربوں نے اندلس کو تمدن وحضارت کے بام عروج پر پہنچا دیا جس کی روشنی سے قرونِ وسطی کی عیسائی قوموں کی آنکھیں چکا چوند ہو گئی تھیں۔

مسلمان طلیطلہ، قرطبہ اور اشبیلیہ سے نکالے گئے تو اس حادثہ جانکاہ پر عربی شعراء نے ایک ایک شہر کے جانے کا غم کیا اور اس پر مرثیے کہے ان میں ہمیں اس ظلم وستم کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جس سے مسلمان دوچار ہوئے۔ مسلمان ایک شہر سے نکلے تو دوسرے میں پناہ لی اور اس طرح آہستہ آہستہ غرناطہ میں اکھٹے ہو گئے۔ جس کے بارے میں شیخ محمد بن شیریں سبتی نے کہا ہے۔

رعی الله من غرناطه متبوا خدا غرناطہ کے گھر کی حفاظت کرے

یسر حزینا او تجیر طریدا جس سے غمگین خوش ہوتا ہے جو بھاگے ہوئے کو پناہ دیتا ہے۔

لیکن دو صدی بعد وہاں سے بھی ان کو نکال دیا گیا۔ یا عیسائی بنا لیا گیا۔ حالانکہ ان میں اکثر علاقوں میں ان کی اکثریت تھی یہودی اور عیسائی تو برائے نام تھے۔ اب ان مسلمانوں کو

مورسکو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ فلپ سوم نے تو عیسائی سازی کی مہم تیز تر کر دی۔ مسلمانوں نے مقاومت اور آہ وفریاد کی ذلت ورسوائی کے تقریباً ایک سو سال غلامی کے گزارے لیکن آخر کار عیسائی ان کو اس حالت میں بھی گوارہ نہ کر سکے۔ اگرچہ عام عیسائی ان سے خوش تھے۔ لیکن پادریوں نے ان کو سپین سے نکال کر ہی دم لیا۔ جس سے تاریخ کا یہ عظیم الشان تمدن کا باب حیرت انگیز اور عبرت خیز انداز میں ختم ہوا۔ لیکن اسپین خود بھی ان ہنرمند کاریگروں کو نکالنے کے بعد زوال کا شکار ہو گیا۔

مسلمان ابتدائی صدیوں میں تو سیاسی طور پر زبردست قوت کے مالک تھے جو آہستہ آہستہ کمزور ہوتی گئی۔ لیکن ثقافت اور علوم فنون میں یورپ میں ان کی مثال نہ تھی۔ خواندگی کی شرح قابل رشک تھی۔ نیز جغرافیہ وتاریخ کے میدان میں نامور شخصیات پیدا ہوئیں۔ البکری، الادریسی، ابن قوطیہ، ابن بشکوال، ابن خلدون، ریاضی میں اسمح مہندس، ابن الصفار، اور ابن برغوس، فلسفہ والٰہیات میں ابن مرہ، ابن حزم، ابن طفیل، ابن ماجہ، ابنِ رشد، طبقہ نسواں کو اس وقت یورپ میں انسان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن وہ بھی اندلس کی تعمیر وترقی میں برابر کی شریک تھیں۔ بہت سی خواتین نے اپنے مدرسے اور مطب کھول رکھے تھے اسلامی دور میں صنعت وحرفت، پارچہ بافی قالین سازی اور کاغذ سازی کی علاوہ سامانِ زیبائش وآرائش میں بھی ترقی کے اعلیٰ معیار قائم کیے۔ زراعت میں اندلس کو گلزار بنا دیا۔ زرعی پیداوار دوسرے ممالک کو جاتی تھیں۔ آج بھی بعض قصبوں میں عربوں کے بنائے ہوئے ذرائع آبپاشی موجود ہیں۔

فن مصوری وسنگ تراشی، نئے مسالے کے دریافت ستونوں اور محرابوں میں نئی اختراع وتراکیب، آرائشی طاقچے اور قلمی گلکاریاں آج بھی نمایاں ہیں۔ مسجد قرطبہ، اشبیلیہ کا محل، الحمراء، فن تعمیر کی نادر مثالیں ہیں۔ علامہ اقبال کو اندلس سے لگاؤ کا ایک سبب وہاں کے مسلمانوں میں ملی سادگی، تازگی اور ان کا باکمال ہونا بھی ہے۔ اس کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے۔

سب سے اہم بات اقبال کے نزدیک یہ تھی کہ اندلسی مسلمانوں نے تہذیب وثقافت اور علوم وفنون میں انتہا درجے کی ترقی کی تھی۔ جس کی بدولت یورپ ان سے متاثر ہوا اور ان میں وہ قوت تخلیق بھی تھی جو قوموں کی زندگی اور تہذیب ومعاشرت کی روح ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے اندلس میں علمی اور سائنسی ترقی، صنعت وحرفت، تجارت ومعیشت، فلسفہ وعلم الکلام، مذہب الٰہیات، نفسیات، طب، ریاضی غرضیکہ تمام شعبہ ہائے حیات کو انتہائی عروج وکمال پر پہنچایا۔

مسلمانوں نے قدیم یونانیوں کے برعکس سائنسی طریقہ کار کی بنیاد رکھی اور تحریر و تحقیق علم کے اصول وضوابط وضع کیے۔ راجر بیکن نے اس چیز کی کئی جگہ وضاحت کی اور علامہ اقبال نے بھی بار بار راجر بیکن کا حوالہ بری فالٹ کے ذریعے دیا ہے۔ جس نے کہا ہے کہ یورپ کی جدید ترقی میں اصل ابتدائی کردار مسلمانوں کے اندلسی علوم وفنون ہی تھے۔

اسپینوزا کا فلسفہ بھی ابن طفیل کے خیالات کا پرتو ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک اگر مسلمان یورپ سے متاثر ہو رہے ہیں تو یہ اپنی میراث ہی کو واپس حاصل کر رہے ہیں علامہ اقبال دسمبر ۱۹۳۲ء میں اسپین گئے اور وہاں انہوں نے بچشم خود ان آثار و امصار کا مشاہدہ کیا جو اسلامی میراث کا ایک زبردست حصہ تھے۔ علامہ اقبال کے ان کے بارے میں تاثرات نظم ونثر دونوں میں موجود ہیں۔ وہاں انہوں نے محسوس کیا کہ آج اسپینیوں میں اس عرب اسلامی میراث سے وہ تعصب وعناد نہیں ہے۔ جو پہلے تھا۔ انہوں نے میڈرڈ (الحمرا) قرطبہ، اسکوریال، اشبیلیہ، غرناطہ کی سیاحت کی قرطبہ کی مسجد سے خاص طور پر جذبات ورفعت کی بلندیوں پر پہنچنے اور خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ اس مسجد کو دیکھنے کے لیے زندہ رہے۔ اور جاوید سے بھی کہا کہ مرنے سے پہلے قرطبہ ضرور دیکھیں۔ ان کا کلام اندلس کے بارے میں شاہکار حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے کلام میں اندلس کا ذکر تین ادوار میں ہے۔ پہلا دور ابتدائی ہے۔ جس میں غرناطہ کی تہذیبی اور علمی اقدار کے متعلق قوم کو بتاتے ہیں۔ دوسرے دور میں سفر انگلستان میں وہاں کے قیام نے انہیں تہذیب مغرب کے مشاہدے اور انکی تہذیب کا اسلامی تہذیب سے موازنے کا موقع ملا۔ نیز ان کو وہاں اسلامی کتب اور مستشرقین کی علمی تحقیق سے آگاہی ہوئی۔ جس سے اُن کی فکر کا رُخ تبدیل ہونے کے ساتھ اس میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوگئی۔ اور وطن واپسی پر مرثیہ صقلیہ سے لے کر بلاد اسلامیہ، شکوہ، جواب شکوہ، طلوع اسلام اور دوسری بہت سی نظمیں لکھیں ان کے کلام کا تیسرا دور تو اندلس کے دوران سفر اور بعد کا ہے۔ اس میں ان کا کلام فکر وفن کی بلندی پر ہے۔ اس سفر نے اردو شاعری کو بہت ہی اعلیٰ اور خوبصورت شہ پارے دیئے۔ مسجدِ قرطبہ تو بے نظیر اور لافانی ہے جس پر اردو شاعری فخر کر سکتی ہے۔ اس میں عصر، عشق۔ مرد مومن، اور کئی دوسرے موضوع ہیں۔ اس کے علاوہ عروج وزوال کے فلسفہ کو عبرت انگیز اور شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

علامہ اقبال بہت سی اندلسی شخصیات سے متاثر ہوئے بعض کے افکار سے مدد لی بعض پر تنقید اور تبصرے کیے۔ اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں تو انہیں اندلسی مفکرین سے بھرپور استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ مثلاً ابن حزم، ابنِ عربی، ابنِ رشد وغیرہ جب انہوں نے اپنے خطبات تیار

کیے تو اس فہرست میں کئی اور کا بھی اضافہ ہو گیا۔ جس میں ابن تومرت، ابنِ خلدون، شاطبی ہیں شاعری میں دعا، مسجد قرطبہ، معتمد کی قید خانے میں فریاد، طارق کی دعا میدان جنگ میں۔

☆☆☆

کتابیات

اقبال

بانگِ درا۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۷ء

اسرار و رموز۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۷۰ء

رموزِ بے خودی۔ اہتمام فقیر محمد چشتی، دریوتین سکیم پریس لاہور، ۱۹۱۸ء

بال جبریل، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۷۸ء

ضربِ کلیم، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ ۱۹۷۶ء

جاوید نامہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

پیامِ مشرق، در مطبع کریمی واقع لاہور، طبع گردید، سن ندارد

پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

ارمغانِ حجاز، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۸۴ء

کلیاتِ فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۷۳ء

باقیاتِ اقبال، مرثیہ عبدالواحد معینی، آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۷۸ء

تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، مترجم سید نذیر نیازی، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۸۶ء

فلسفہ عجم ترجمہ سید میر حسن، نفیس اکیڈمی، کراچی۔ ۱۹۶۲ء

تاریخِ تصوف، ترتیب و حواشی صابر کلوروی، مکتبہ تعمیرِ انسانیت لاہور ۱۹۸۷ء

خطوط، اقبال نامہ مرتب شیخ عطاء اللہ اسد حصہ اوّل، شیخ محمد اشرف اینڈ سنز لاہور، ۱۹۵۱ء

اقبال نامہ حصہ دوم

کلیاتِ مکاتیب، اقبال مظفر حسین برنی اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۳ء

مکتوباتِ اقبال نذیر نیازی اقبال اکیڈمی، کراچی

Develpment of the metaphysics in Persia, IQBAL

آرنلڈ، میراثِ اسلام، ترجمہ عبدالمجید سالک، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور ۱۹۶۰ء

ابنِ حزم، الملل و نحل ترجمہ عباد اللہ عادی، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۹۴۵ء

ابنِ خلدون، تاریخ ابنِ خلدون، حصہ پنجم، مترجم حکیم احمد حسن الہ آبادی نفیس اکیڈمی کراچی۔ ۱۹۸۴

ابنِ عربی، فصوص الحکم، عبدالعزیز صدیقی، نذیر سنز لاہور، سن ندارد

ابوسعید نورالدین، اسلامی تصوف اور اقبال، اقبال اکیڈمی کراچی، ۱۹۵۹ء

ابوشبع سلم مضامینِ سلمان ندوی، حصہ اول۔ مکتبہ علم و حکمت پٹنہ۔ ۱۹۵۰ء

ابوالقاسم صاعد اندلسی طبقات الامم مترجم قاضی احمد میاں، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۳۸ء

ابوللیث صدیقی روحِ مکاتیبِ اقبال، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۷۷ء

احمد زیات، تاریخ و ادب عربی، مترجم، عبدالرحمٰن طاہر، سورتی شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

اسکاٹ، اخبار الاندلس، مترجم خلیل الرحمٰن، لاہور، ۱۹۲۰ء

اشفاق احمد، مقامِ اقبال ادارہ اشاعتِ اردو حیدر آباد دکن ۱۹۴۵ء

اکبر شاہ نجیب آبادی تاریخ اسلام حصہ سوم، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۵۷ء

الطاف حسین حالی، مسدس حالی، طبع لاہور، ۱۹۳۸ء

ابن الخطیب السان الدین احاطہ فی اخبار، غرناطہ

المقری نفح الطیب مترجم خلیل الرحمٰن، انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ۔ ۱۹۴۰ء

امیر علی، تاریخ اسلام، مترجم حسین رضوی۔

امیر شکیب ارسلان، جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۵۷ء

اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد اول

او میری فلسفہ اسلام مترجم، حسان احمد بی۔ اے نفیس اکیڈمی کراچی

بشیر احمد ڈار انوارِ اقبال، اقبال اکیڈمی کراچی۔ ۱۹۶۷ء

ٹی، جے دوبوئر، تاریخ فلسفہ اسلام ترجمہ، ڈاکٹر عابد حسین، نفیس اکیڈمی کراچی۔

جاوید اقبال، زندہ رود، حصہ اول، شیخ غلام علی اینڈ سنز

جمیر کرزنک، آربیلی وائنڈر، دنیائے اسلام، مترجم، سید ہاشمی فرید آبادی۔ میٹرل اکیڈمی لاہور

ڈارتھی لوڈر، ہسپانیہ، مترجم سید ہاشمی فرید آبادی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

ڈبلیو اے۔ بیٹ لینڈر، تاریخ جمہوریہ روما، مترجم حمید احمد انصاری، جامعہ عثمانیہ، ۱۹۶۶ء

ذوالقدر جنگ، خلافتِ اندلس، مقبول اکیڈمی، لاہور سن ندارد

رائین ہارٹ ڈوزی، عبرت نامہ اندلس، مترجم عنایت اللہ دہلوی، مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۴۵ء
رشید اختر ندوی، تہذیب وتمدن اسلامی حصہ دوم، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۵۲ء
ریاست علی ندوی، اقبال شیخ نذیر احمد کتب خانہ تاج آفس بمبئی سن ندارد
ریناں ساں، ابنِ رشد، فلسفہ ابنِ رشد مترجم مولوی معشوق حسین تخلیقات لاہور، ۱۹۹۳ء
سعید اختر درانی، اقبال یورپ میں، اقبال اکادمی لاہور۔ ۱۹۷۸ء
شبلی نعمانی، مقالات شبلی، جلد ششم معارف اعظم گڑھ۔ ۱۹۱۵ء
صبا لکھنوی، اقبال اور بھوپال، اقبال اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۳ء
ظہور احمد اظہر ڈاکٹر، مرثیہ صقلیہ پر ایک نظر بزم اقبال لاہور ۱۹۹۲ء
علی عباس جلال پوری، اقبال کا علم الکلام، مکتبہ فنون لاہور، ۱۹۷۳ء
عبداللہ اثری، دانشورانِ اندلس۔ مکتبہ دین ودنیا لاہور۔ ۱۹۴۰ء
عبداللہ قریشی آئینہ اقبال، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۶۷ء
عبداللہ حنان، مترجم تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات، مترجم مولوی عبدالوہاب ظہوری
نفیس اکیڈمی، حیدرآباد ۱۹۴۷ء
عبدالحمید، اقبال کے چند جوہر زیرے، اقبال اکیڈمی لاہور، ۱۹۴۷ء
عبدالسلام خورشید، سرگزشتِ اقبال قومی کتب خانہ لاہور، ۱۹۵۸ء
عبدالوحید خاں تاریخ افکار وسیاسیات، اسلامیہ نولکشور پریس لکھنؤ
غلام دستگیر، فکرِ اقبال، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۵ء
غلام دستگیر، فکرِ اقبال، حیدرآباد دکن ۱۹۴۴ء
غلام عمر خان، روحِ اسلام اقبال کی نظر میں، صفیہ اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۶ء
فلپ کے حتی، عرب اور اسلام مترجم سبارز الدین، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۵۱ء
فائف، یورپ کا عصر جدید مترجم قاضی تلمیذ حسین، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۶ء
گستاؤلی بان، تمدنِ عرب، مترجم علی بلگرامی، مقبول اکیڈمی سن ندارد
لین پول، مسلمان اندلس میں، مترجم حامد علی صدیقی، ایم۔ ایم۔ سعید کمپنی سن ندارد
مجتبیٰ حسین، ادب وآگہی کراچی، ۱۹۶۳ء
محمد احسان الحق سلیمانی، مسلمان یورپ میں، قومی کتب خانہ لاہور، ۱۹۵۴ء

محمد رفیق افضل گفتارِ اقبال ادارہ تحقیقاتِ پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۷۷ء
میاں محمد شریف، مسلمانوں کے افکار، مجلس ترقی ادب لاہور
محمد فاروق سید، طواسینِ اقبال۔ اقبال اکادمی لاہور۔ ۱۹۸۷ء
محمد علی خان، قندِ مغربی، صبح کانپور، ۱۸۹۸ء
محمد لطفی جمعہ، تاریخ فلاسفہ اسلام مترجم میر ولی الدین جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، ۱۹۴۱ء
محمود نظامی، ملفوظاتِ اقبال، اشاعت منزل لاہور، ۱۹۴۹ء
محمد یوسف ڈاکٹر، اندلس تاریخ وادب، مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی، ۱۹۴۹ء
معین الدین احمد ندوی تاریخ اسلام حصہ سوم، ۱۹۴۸ء
میری میڈ، تاریخ اندلس ترجمہ سید محمد احمد علی گڑھ ۱۸۹۸ء
نکہت شاہ جہاں پوری، موازنہ صلیب وہلال کتاب منزل لاہور۔ ۱۹۶۰ء
واشنگٹن ارونگ، الحمرا کی داستانیں، ترجمہ سید وقار عظیم
وحید الدین فقیر، روزگارِ فقیر، جلد اوّل، سید برادرز لاہور۔ ۱۹۵۰ء
ولی محمد قاضی، سفرنامہ اندلس طبع ۱۹۲۷ء
یوسف سلیم چشتی، شرح بال جبریل حاجی فرمان علی اینڈ سنز لاہور۔ ۱۹۵۱ء

عربی

علی ادھم المعتمد بن عباد، طبع اول مصر
المنجد فی الادب ولعلوم الشرق والغرب، المطبع الکاتولیکیہ بیروت۔ ۱۹۲۷ء

ENGLISH

Breffaunlt Robert The making Humanity, Book Foundding Lahore. 1930
E. G. Arabian Medicine , Landone, Brecadgo Dichores 1962
P. K. Hity , history of the Arabs, Macmcllon 1964
Nicholsom, Litrary History of the Arabs London 1907
Thomos Arnold, Legacy of Islam Oxford 1931

اخبارات

انقلاب لاہور، ۳۰ اکتوبر۔ ۱۹۳۲ء

انقلاب لاہور، ۲۷ نومبر ۱۹۳۲ء

انقلاب لاہور، ۱۱، جنوری ۱۹۳۳ء

انقلاب لاہور، ۱۵ جنوری ۱۹۳۳ء

انقلاب لاہور، ۹ فروری ۱۹۳۳ء

انقلاب لاہور، ۲۶ فروری ۱۹۳۳ء

رسائل

ثقافت، لاہور، ستمبر ۱۹۶۷ء

اقبال، لاہور، اکتوبر ۱۹۹۲ء جنوری ۱۹۹۳ء

ادبی دنیا، لاہور، مئی ۱۹۹۳ء

اقبالیات، لاہور، جنوری، مارچ۔ ۱۹۹۲ء

اردو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۲ء

ضیائے حرم لاہور، اپریل ۱۹۷۷ء

اقبال کراچی، ۱۹۶۸ء

مجلہ خیابان اقبال، پشاور یونیورسٹی، ۱۹۶۶ء

فکر و نظر، اسلام آباد، جولائی ستمبر ۱۹۸۶ء

اقبال ریویو، کراچی، جولائی۔ ۱۹۴۴ء

فکر و نظر، اندلس نمبر، ادارہ تحقیقات اسلامیہ اسلام آباد، ۱۹۹۱ء

ادبی دنیا لاہور، مئی ۱۹۶۵ء

قومی زبان، کراچی، اپریل۔ ۱۹۷۴

ماہِ نو، لاہور، جون ۱۹۷۲ء

فنون، فروری، مارچ، ۱۹۸۲ء

رسالہ اردو، کراچی ۱۹۴۹ء